سہ ماہی

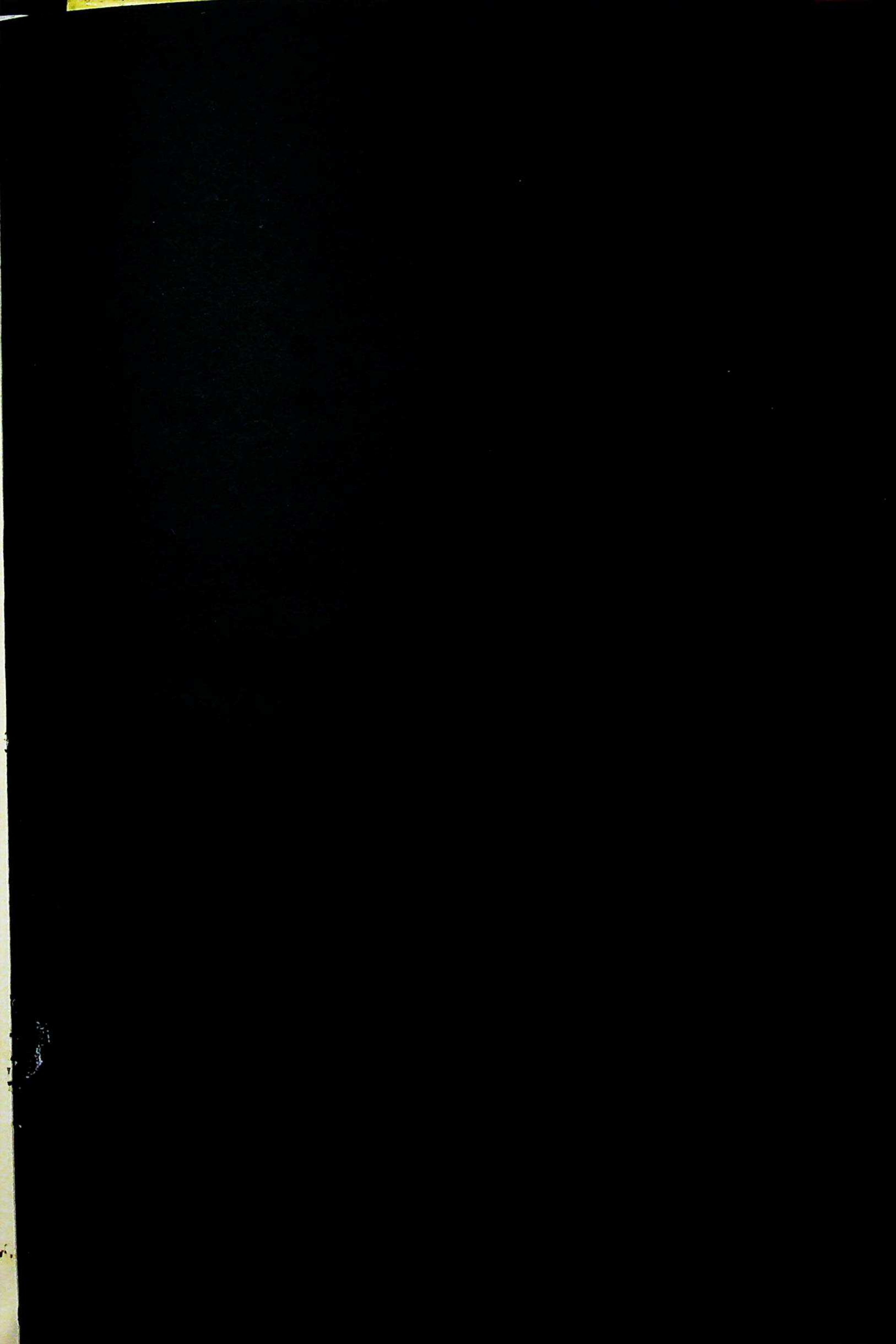
لمحے لمحے

بدایوں



وحشی سعید

مدیر
حسیب سوز
بدایوں



لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ایک شمارہ وحشی سعید کے نام

خصوصی اشاعت کا کتابی سلسلہ

لمحے

بدایوں

30



مدیر

حسیب سوز

رابطہ

HASEEB SOZ Editor LAMHE-LAMHE

IMAM BARA, ALAPUR, BUDAUN-243631 (U.P.) Mob. No.: 09720735172

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

URDU MAGAZINE LAMHE-LAMHE

VAHSHI SAEED NUMBER

JUNE 2015

☆ Date of Establishment July 1982

☆ Issue No. 30

☆ Price Rs. 300/-

☆ Composing Taiba Computers, Budaun

☆ Printing Taj Company, Delhli-6

☆ CENTRAL NEWS AGENCY PVT. LIMITED
4-E/4, Jhande Walan Extn. (1st Floor)
New Delhi-110055 (INDIA)

☆ MAKTABA JAMIA - ALIGARH, DELHI, MUMBAI

☆ NAGINA URDU MAGAZINE
C/o Hotel Shahenshah Palace, Boulevard,
Srinagar - 190005 (KASHMEER)

ترتیب



ادار یہ



میں اور میرا ادبی سفر



فکر وفن اور شخصیت



کچھ منتخب افسانے

اداریہ

وحشی سعید اس عہد کے اُن ممتاز فکشن نگاروں میں شمار کیئے جاتے ہیں جن کے یہاں زندگی کے تمام موضوعات پر مشاہدے کی گہری پکڑ اور زبان و بیان کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ وحشی سعید نے اپنے افسانوں میں ایک ایسے اسلوب کے زیر اثر اپنی پہچان بنائی ہے جو قاری کو تخیل کے ساتھ پوری طرح جوڑے رہنے میں کامیاب ہے۔ وحشی سعید کے افسانوں پر فنی محاسن کے ساتھ ہمارے کئی معتبر قلم کاروں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جنھیں ہم اس خصوصی شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

وحشی سعید اپنے شب و روز کے آئینہ میں اتنے متحرک نظر آتے ہیں کہ سوچ کر انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ اپنی سماجی اور کاروباری مصروفیات کے باوجود ان کا قلم کبھی رکتا نہیں ہے۔ ''پتھر پتھر آئینہ''، ''ایک موسم کا خط'' (ناولٹ)، ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''خواب حقیقت''، ''سڑک جا رہی ہے'' (افسانوی مجموعے) منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ تحریکِ ادب بنارس، تحریرِ نو ممبئی، مفاہیم رانچی نے اُن کے گوشے شائع کئے ہیں۔ پہلی بار اُن کے افسانوی ادب پر اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف و احترام میں لمحے لمحے کا یہ خصوصی شمارہ وحشی سعید نمبر ہم اپنے قارئین کے لیے حاضر کر رہے ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہماری یہ خاکسارانہ کوشش ہمارے قارئین کو یقیناً پسند آئے گی۔

حسیب سوز

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

میں اور میرا ادبی سفر!

ہم نے اس عنوان میں صرف وحشی سعید کا تعارف ہی نہیں بلکہ اُن کی تعریف سے وابستہ کچھ تحریریں ہیں اور کچھ تصویریں بھی شامل کی ہیں جو ہمارے قارئین کے لیے یقیناً معلومات میں مزید اضافہ کا سبب ہوں گی۔

(ادارہ)

وحشی سعید کا مختصر سوانحی خاکہ (BIO-DATA)

نام	محمد سعید ترمبو
ولدیت	مرحوم محمد عبداللہ ترمبو
قلمی نام	وحشی سعید
جائے پیدائش	نائد کدل سری نگر (کشمیر)
تاریخ پیدائش	۱۶؍نومبر ۱۹۴۶ء
تعلیمی قابلیت	پوسٹ گریجویشن
سکول،	بسکو سکول سری نگر
کالج،	ایس پی کالج سری نگر
یونیورسٹی	یونیورسٹی آف کشمیر حضرت بل سری نگر
اساتذہ	کشمیر یونیورسٹی میں غلام قادر سروری، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر حامدی کاشمیری وغیرہ
ہمعصر مقامی اردو قلمکار	حکیم منظور، مظفر ایرج، بشیر شاہ، عمر مجید وغیرہ
مادر زبان	کشمیری
پیشہ	تجارت
مطبوعہ تصانیف	'پتھر پتھر آئینہ'، 'ایک موسم کا خط' (ناولٹ)، 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ'، 'خواب حقیقت'، 'سڑک جا رہی ہے' افسانوی مجموعے
رسائل و جرائد میں اشاعت	ابتدا میں روزنامہ ''آفتاب'' کے ادبی صفحے میں ہفت وار متواتر چھپا کرتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس ہی ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی میں میرا پہلا افسانہ ''جمود کا جنازہ'' چھپا تھا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

عصر حاضر میں — لگ بھگ ملک کے ہر چھوٹے بڑے ادبی رسالے میں چھپتا ہوں، جن میں بطور خاص 'مفاہیم'، 'انتساب'، 'تحریکِ ادب'، 'اردو اکادمی' جیسے لاتعداد رسائل و جرائد شامل ہیں۔

ادارت — ایس پی کالج کے میگزین ''پرتاپ'' اور پھر دو ماہی ''نگینہ'' کی ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک اور اب دوبارہ اگست ۲۰۱۴ء سے نگینہ باقاعدگی سے شائع ہونے لگا ہے۔

پسندیدہ ادیب و شعرا — منشی پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی وغیرہ

مشاغل — تصنیف و تالیف، مطالعۂ کتب، سیر و تفریح

موجودہ رہائش، پتہ — رمضانا ہاؤس کرن نگر سری نگر-190010، (کشمیر)

موبائل، ای میل نمبر nagina968@gmail.com, 09419012800



میرا ادبی سفر

افسانہ نگار بننے کا سلسلہ بھی کچھ دلچسپ واقعات سے خالی نہیں۔ میرے ایک طالب علم دوست جس کے والد افسانے لکھا کرتے تھے، مجھے سنایا کرتا تھا۔ میری فطرت بچپن سے ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ کوئی ناممکن عمل جو مجھے بھا جاتا ہے میں اس کو کرنے پر بضد ہو جاتا ہوں۔ میرے دماغ میں خیال آیا کہ جب میرے دوست کے والد افسانہ لکھ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں۔ بس اس کے بعد میں افسانہ لکھنے پر کمر بستہ ہو گیا اور سولہ سال کی عمر میں ناول تک لکھ ڈالے۔ یہ ذوق عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ اس وقت اردو رسائل بہت کم نکلتے تھے لیکن ان کی اچھی خاصی دھوم تھی۔ کالج کے زمانے میں مجھے بھی نگینہ نکالنے کا خیال آیا۔ اس میں میرے دونوں بھائی ظہور ترمبو اور عبدالمجید ترمبو میرے شانہ بہ شانہ تھے۔ پہلے پہل تو ہم نے اپنے صرفے سے رسالہ نکالنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہے، لیکن کب تک۔ امی جان نے جنھیں ہم بوبا کہتے تھے، ان کو ہمارا یہ تہذیبی عمل بہت بھایا اور انھوں نے ہماری ہر طرح کی معاونت فرمائی۔ مالی تعاون جو رسالے کی اشاعت کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے وہ اب حل ہو چکا تھا۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ میں شہر سے باہر تھا اور میرے دونوں بھائی ظہور صاحب، عبدالمجید صاحب اور ان کے دو پنڈت دوست وومینس کالج کی دیوار پر رات میں اشتہار لگا رہے تھے کہ پولیس والوں نے انھیں مشتبہ جان کر گرفتار کر لیا......

کس کس طرح سے مجھ کو نہ رسوا کیا گیا
غیروں کا نام میرے لہو سے لکھا گیا

میرے بھائیوں اور ان کے دوستوں نے لاکھ منت سماجت کی، دلائل بھی پیش کئے لیکن سب بے سود، اور ادب کی محبت کے صلے میں انھیں وہ رات حوالات میں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

گزارنی پڑی اور صبح ہی ان کی رہائی ممکن ہو سکی۔ ۱۹۶۸ء میں مظفر ایرج ہم سے منسلک ہو گئے اور آج تک جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ ہماری دوستی اب تک اسی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ تا حیات جاری رہے۔ نگینہ ۱۹۷۷ء تک جاری رہا، اس کے بعد التوا میں پڑ گیا۔ یہ مدت چالیس برسوں تک کھنچ گئی۔ اگر اس وقت نگینہ کی اشاعت روکنی نہ پڑتی تو شاید آج یہاں کا منظر نامہ دوسرا ہوتا، لیکن کیا کرتے۔ مدیران کے پاس پیسوں کا مسئلہ ہوتا ہے، ہمارے پاس وقت کا مسئلہ تھا۔ اسی درمیان مظفر ایرج کا جموں تبادلہ ہو گیا اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا سلسلہ اس قدر منقطع ہو گیا کہ۔

تمہیں غیروں سے کب فرصت، کب اپنے غم سے ہم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی، نہ ہم خالی

اسی دور میں والد صاحب نے ہمیں تجارت سے وابستہ کر دیا اور ہم دو کے چار اور چار کے آٹھ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ فطرت بھی ہے کہ اگر چار ستونوں پر کھڑی عمارت کا ایک ستون بھی کمزور ہو جائے یا ہٹ جائے تو عمارت مکمل نہیں رہتی۔ ہم تینوں بھائی اور مظفر ایرج رسالے کے چار ستون تھے۔ جب ایک پایہ جموں منتقل ہو گیا تو تین پائے ویسے ہی کمزور پڑ گئے۔ کمزور پایوں پر عمارت کب تک کھڑی رہتی۔ لیکن میرا تخلیقی سفر اس سے پہلے وہاں تک پہنچ چکا تھا جہاں کہ مجھے پوری اردو دنیا میں جانا پہچانا جانے لگا تھا۔ اس دور کا کون سا ایسا رسالہ تھا جس میں میرے افسانے شائع نہ ہوئے ہوں۔ اس وقت وحشی سعید کے ساتھ ساحل بھی میرے نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور ہر مہینے کسی نہ کسی اہم رسالے میں وحشی سعید ساحل کا افسانہ نظر آ جاتا تھا۔ اس سفر میں ہمارے دوست حکیم منظور جن سے ہم نے ادب کے تعلق سے بہت سی بحثیں کیں اور ان کے مفید مشوروں پر عمل بھی کیا، وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔ حالانکہ میں نے

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اس دوران چالیس سالہ دیگر مصروفیات کے دوران افسانے اشاعت کے لیے نہیں بھیجے لیکن مختلف کہانیاں میرے ذہن میں پکتی رہیں۔ کچھ کو صفحۂ قرطاس پر اتارا بھی لیکن ادبی دنیا ان سے انجان ہی رہی۔ ۲۰۰۷ء مظفر ایرج واپس آئے اور ہمارا رابطہ ایک مرتبہ پھر جڑ گیا۔ ملنے ملانے کے سلسلے شروع ہو گئے اور انھوں نے مجھے افسانہ لکھنے کے لیے ابھارنا شروع کیا۔ اسی درمیان نور شاہ صاحب کی جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگاروں کے فن پر ایک کتاب بھی منظر عام پر آ گئی۔ اس میں ایک صفحے پر میرے متعلق کچھ اس طرح لکھا تھا کہ میں پیسے بنانے کے چکر میں ادب کو بھول گیا۔ لیکن ایسا میرے لیے کیا ہم تینوں بھائیوں کے لیے قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اس کا حوصلہ اور ترتیب وترغیب ہمیں والدۂ مرحومہ سے عطا ہوا تھا۔ گو کہ ہمیں اس دور میں دوسری مشکلات کا سامنا تھا۔ مثلاً اشاعت کے بعد بک اسٹالوں پر رکھوانا، کہیں باہر کتاب میلا لگے تو وہاں پر لے کر جانا، پھر بچی ہوئی کتابوں کا واپس لانا۔ اس میں کبھی کبھی جیب سے مزید نقصان بھی ہو جایا کرتا تھا لیکن ہم خوش تھے کیونکہ ہماری والدہ ہمارے اس عمل سے بہت خوش ہوتی تھیں اور ہمارا حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ تو ادب کے ساتھ ہماری والدۂ مرحومہ کی یادیں بھی جڑی ہوئی ہیں تو ادب کو بھول جانا تو ناممکن ہے۔ بہر حال اسی درمیان مظفر ایرج کے توسط سے ایک نوجوان بچے سے ملاقات ہوئی۔ نوجوان بچہ میں اسے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس سے پہلی بار کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہی میرے دل نے اسے اپنا عزیز بنا لیا تھا۔ وہ تحریک ادب، بنارس کا مدیر جاوید انور تھا، جس نے مجھے نور شاہ صاحب کی کتاب کی وہ سطریں پڑھ کر سنائیں اور اس کو اپنے انٹرویو میں شامل کیا جس میں میرا ذکر تھا۔ میں نور شاہ کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے میری فطرت کے اس ادبی حصے کو جگا دیا جو چالیس برسوں سے انقلاب برپا کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں نے اس کو بھی ایک چیلنج کے طور پر لیا اور آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

دو سال کی قلیل مدت میں (جاوید انور سے میری پہلی ملاقات ۲۰۱۲ء میں ہوئی تھی) میرے تین افسانوی مجموعے: ا۔ کنوارے الفاظ کا جزیرہ، ۲۔ سڑک جا رہی ہے، ۳۔ خواب حقیقت اور ایک ناول پتھر پتھر آئینہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس دو سال کے عرصے میں میری جاگی ہوئی تخلیقی قوت نے مجھ سے ایسے کام لے لیے جس کے لیے برسوں درکار تھے۔ یوں سمجھیں کہ چالیس برسوں سے جو لاوہ اندر اندر پک رہا تھا وہ آتش فشاں کی طرح یکبارگی پھوٹ پڑا اور مختلف رسائل و جرائد نے اس کا استقبال کیا۔

ابتدائی زمانے میں ہم جو ٹوٹی پھوٹی شاعری کرتے تھے میری والدہ کو وہ بہت پسند تھیں۔ ہمیں وہ دن بھی یاد ہیں جب ہمارے گھر میں چھٹیوں کے دنوں میں صبح سے شام تک اور عام دنوں میں شام سے رات تک افسانہ نگاروں اور شاعروں کا جم غفیر لگا رہتا تھا اور شعر و شاعری اور افسانہ نگاری ہوتی رہتی تھی اور میری والدہ ان محفلوں سے محظوظ ہوتی رہتی تھیں اور ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہوئے چائے کے کپ کے کپ بھجواتی رہتی تھیں۔ ایک دن میں دو سو ڈھائی سو کپ چائے کا صرفہ اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے لیکن میری والدہ جو کہ نہ شاعرہ تھیں نہ افسانہ نگار، بس اپنے بچوں کی محبت سے سرشار تھیں اور ہماری چھوٹی چھوٹی خوشی کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ اس لیے جب مجھے اپنی چاروں تصنیفات کی رسم رونمائی کا خیال آیا تو ہم بھائیوں کو اپنی والدۂ مرحومہ کی ہم سے محبت کے توسط سے ادب کی محبت اور شاعری سے محبت کا بھی خیال آیا۔ اس لیے دوسرے دن والدہ مرحومہ کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرہ رکھنے کا پروگرام بھی بنا اور اللہ نے ان دونوں ادبی تقریبات کو اس قدر کامیاب کیا کہ انھوں نے تاریخ رقم کی۔ یقیناً ہماری والدہ کی نیک دعائیں ہمارے ساتھ ہیں اور ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ہر سال انشاء اللہ اسی طرح ان کو خراجِ

عقیدت پیش کرتے رہیں گے۔

نگینہ کی از سرِ نو اشاعت بھی والدۂ مرحومہ کی محبت کا عطیہ ہے۔ اب مظفر بھی ہمارے ساتھ ہے اور چھوٹا بھائی ہم سے دور۔ لیکن ہمارے دل ملے ہوئے ہیں۔ نگینہ کی اشاعت کے تصور بھر سے ہمیں یوں لگا کہ جیسے ہماری والدہ کا شفقت بھرا ہاتھ ہمارے سروں پر ہو اور وہ ہمارے لیے اپنی دعائیں بھیج رہی ہوں۔ ارادہ تو یہی ہے کہ کہ جب تک دم میں دم ہے تب تک ہم ہر سال اسی طرح اردو مشاعرے اور دو ماہی نگینہ کی اشاعت کا کام انجام دیتے رہیں گے اور اپنی والدۂ مرحومہ کی روح کو خوش کرنے کی ہر ممکنہ کاوش جاری رکھیں گے۔



خطبۂ استقبالیہ

خواتین و حضرات! آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ ریاست کی تہذیبی، تمدنی اور علمی تاریخ ۵ ہزار سالوں پر محیط ہے۔ کسی بھی ترقی یافتہ قوم کے لیے یہ سرمایہ باعثِ افتخار ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ ہماری سرزمین نے ادب کے حوالے سے ایسے جیالے پیدا کئے ہیں جن کے ادبی کارنامے پوری دنیا میں مقبول ہیں۔

کلہنؔ کی راج ترنگی سے کون واقف نہیں، لل دید اور شیخ العالمؒ کا کلام آج بھی مذہبی مجالس میں روح پرور سکون بخشتا ہے حبہ خاتون اور ارنہ مال کے گیت ہمارے دھان کے کھیتوں میں آج بھی گونجتے ہیں، رسول میرؔ کے رومانی نغموں کے ڈانڈے کیٹس سے ملائے جاتے ہیں۔ غنی کاشمیری کی شاعری نے ایرانی شہنشاہوں سے لوہا منوایا ہے، مہجور کی حب الوطنی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ غرض اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ریاست کی پوری تاریخ شعر و شاعری کے حوالے سے سنہرے حروف میں رقم کرنے

کے لائق ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب بات نثر کے حوالے سے ہوتی ہے تو صورتِ حال مختلف ملتی ہے۔

ریاست میں اُردو اور کشمیری نثر کی تاریخ لگ بھگ ایک صدی پر محیط ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نثر ہمیشہ شاعری کے بعد ہی پروان چڑھتی ہے لیکن قلیل عرصے کے باوجود بھی ریاست جموں و کشمیر میں فکشن کے حوالے سے کئی بڑے نام بالواسطہ یا بلاواسطہ جڑے ہوئے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کا تعلق کشمیر سے تھا۔ کرشن چندر نے اپنی ادبی سفر کا آغاز پونچھ کی سرزمین سے کیا۔ راجندر سنگھ بیدی غمِ روزگار کے سلسلے میں کئی سال جموں میں رہے۔ جب ہم ریاست میں اُردو اور کشمیری فکشن کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہیں تو کئی سرخیل فکشن نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے پوری زندگی فکشن لکھا اور فکشن جیا۔ پیش رو فکشن نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، قدرت اللہ شہاب، ٹھاکر پونچھی، اختر محی الدین، علی محمد لون، امین کامل، موہن یاور، تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، عمر مجید، شمس الدین شمیم، بشیر اختر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ معاصر فکشن نگاروں میں نور شاہ سے ناصر ضمیر تک ایک طویل کاروان سرگرمِ عمل ہے جن کی تخلیقات موقر رسائل و جرائد کی زینت بنتی ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ ریڈیو کشمیر، دوردرشن، کلچرل اکیڈمی، محکمہ اطلاعات جیسے سرکاری اداروں کے ساتھ ساتھ اردو اکادمی، بزمِ ادب کمراز، ادارہ نگینہ اور دیگر غیر سرکاری انجمنیں زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں پہلے ہی سے کوشاں ہیں۔

آپ سب یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنی ادبی تنظیمیں ہونے کے باوجود ''جموں و کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ'' چہ معنی دارد۔ عربی کا ایک قول ہے کہ لکل فن الرجال یعنی ہر ایک شخص اپنے فن میں ماہر ہوتا ہے۔ اسی قول کے مصداق ہم نے انجمنوں کے

بہتات کو دیکھ کر ایک ایسا گلڈ قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں خالص ''فکشن'' کی بات ہوگی۔ فکشن کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے۔ اس میں افسانہ، ڈرامہ اور ناول نثر کے تینوں شعبوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ہم نے گلڈ کو کسی خاص زبان سے منسوب بھی نہیں کیا بلکہ ریاست میں بولی جانے والی مقامی زبانوں میں جو فکشن تخلیق ہو رہا ہے اس کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا جس میں مقامی زبانوں کا فکشن ایک دوسرے تک پہنچانا مقصود ہو۔

جموں اینڈ کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ ایک نان پروفیشنل غیر سرکاری ادبی ادارہ ہے، جس کا مقصد ریاست میں بولی جانے والی مقامی زبانوں، اُردو، کشمیری، ڈوگری، پہاڑی، گوجری، لداخی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں تخلیق ہونے والا فکشن ادب کی آبیاری کے لیے ایک مناسب پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے۔

گلڈ کے اغراض اور مقاصد

۱۔ فکشن کے فروغ کے لیے مذاکرات اور ادبی محافل کا انعقاد کرنا۔

۲۔ فکشن ورک شاپوں کا انعقاد کرنا جس میں نو آموز اور نوعمر افسانہ نگاروں کی تربیت ہو۔

۳۔ ضلعی اور ریاستی سطح پر محفل افسانہ منعقد کرنا۔

۴۔ ڈرامہ فیسٹول کا انعقاد کرنا۔

۵۔ فکشن نگاروں کے ساتھ ''ایک ملاقات'' کے عنوان سے پروگرام کرنا۔

۶۔ افسانہ، ناول اور ڈراما پر سیمینار کرنا۔

۷۔ ہفتہ وار نشستوں کا اہتمام کرنا۔

۸۔ فکشن رائٹرس ڈائریکٹری مرتب کرنا۔

۹۔ فکشن نگاروں کے لیے ایوارڈ اور توصیفی اسناد پیش کرنا۔

۱۰۔ فکشن نگاروں کی معیاری تخلیقات کی اشاعت کرنا۔

وحشی سعید نمبر

۱۱۔ کتابی سلسلہ ''فکشن'' کا اجراء کرنا۔

۱۲۔ ریاستی فکشن نگاروں کے لیے ''ویب سائٹ'' کا انتظام وانصرام کرنا۔

۱۳۔ فکشن کے فروغ میں دیگر ادبی انجمنوں سے اشتراک کرنا۔

۱۴۔ مرکزی لائبریری اور دارالمطالعہ قائم کرنا۔

۱۵۔ گمنام فکشن نگاروں کی تخلیقات کی تلاش واشاعت کرنا۔

۱۶۔ پیش رو فکشن نگاروں کی یاد میں تقاریب کرنا۔

معزز حاضرین! فکشن رائٹرس گلڈ کا جو خاکہ میں نے آپ کے سامنے رکھا، وہ ہمارا دیرینہ خواب ہے جس کی تعبیر کے لیے ہمیں خود درمے، سخنے، قلمے اور قدمے تعاون کرنا ہوگا، تبھی یہ ممکن ہے کہ ''جموں اینڈ کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ'' کا مستقبل تابناک ہوگا۔

صدر جموں اینڈ کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ وحشی سعید نے یہ خطبۂ استقبالیہ ۲۹ رنومبر ۲۰۱۴ء ہوٹل شہنشاہ سامعین کے سامنے پڑھا۔



گفتگو بند نہ ہوئی

دفتر میں بیٹھا ''نگینہ'' کے سالنامے کا تانا بانا بن رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میرا رفیق کار، دیرینہ دوست مظفر ایرج جو نگینہ سے روزِ اول سے وابستہ رہا ہے، کمرے میں داخل ہوا۔ السلام علیکم کے بعد ہم اگلی اشاعت کے بارے میں سر جوڑ کر مشورہ کرنے لگے۔ اس درمیان ذہن کے کسی دریچے سے آواز آئی کہ جب اردو ادب میں پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ جموں و کشمیر کے انگلیوں پر گنے جانے اردو شعرا کی فہرست تیار کی جائے گی تو وہ مظفر ایرج کے نام کے بغیر مکمل نہ ہوسکے گی۔

یہ خیال آنے کے بعد دوسرا خیال یہ آیا کہ کیوں نہ مظفر ایرج کا ایک انٹرویو کر لوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ حصول علم کے سلسلے میں کچھ سال کے لیے بنارس گیا تھا تو بہت سے دلچسپ، ادب، ذات اور سماج سے متعلق واقعات، جو اس کی تخلیقات کا

محرک بنے، ان پر ہم مزے لے لے کر ہنسی مذاق کیا کرتے تھے، تو کیوں نہ ان یادوں کو پھر تازہ کیا جائے۔

میں نے مظفر سے اس خیال کا اظہار کیا تو وہ بولا "یار! اب بڑھاپے میں کہاں وہ سب باتیں دہراؤ گے؟ تم تو خود آج کے اہم افسانہ نگار ہو کہ مجھے تمہارا انٹرویو لینا چاہیے"۔ میں نے کہا کہ اس وقت کی باتیں اور یادیں میرے حافظے میں بہت تھیں لیکن تحریر نہ ہو سکیں۔ آج میرے ذہن میں آیا ہے کہ ان یادوں کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو قلم بند بھی کرلوں تاکہ وہ شائع ہو کر محفوظ ہو جائیں۔ اس پر مظفر ایرج نے کہا کہ پھر گفتگو کی وہ طرز اختیار کرتے ہیں گویا یوں لگے کہ میں تمہارا انٹرویو کر رہا ہوں اور تم میرا، اور اس گفتگو کو آج کے دور تک بھی لے آتے ہیں۔

گفتگو کے دوران ظہور ترمبو بھی آ گئے اور گفتگو میں شامل ہو گئے اور ہم تینوں کے اشتراک کے بعد اس دلچسپ گفتگو کا آغاز ہوا......

وحشی سعید- یار مظفر! آج جب کہ ہم عمر کے اس پڑاؤ پر ہیں کہ بقول شاعر ؎

ساقیا یاں چل رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک یہ چل سکے ساغر چلے

تو یہ دیوانگی، یہ جنون ہمیں پھر ان دنوں کی طرف واپس لے جاتا ہے جنھیں ہم نے بہت پیچھے چھوڑا ہے جو ہمارے لیے ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بقول شاعر ؎

وہ بھی کیا دن تھے کہ بردوش ہوا تھے ہم بھی
آسمانوں پہ کوئی خاک نشیں رہتا تھا

تو "نگینہ" کی از سر نو اشاعت، تقاریب کا انعقاد اور ادبی اداروں سے وابستگی نے ایک مرتبہ پھر ہمیں انہی ادبی مباحث کی اور ابھارا ہے جو کہ ایک زمانے میں ہماری روز مرہ گفتگو کا موضوع ہوا کرتے تھے۔ تو گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں تمہاری رائے

وحشی سعید نمبر

اس کے متعلق جاننا چاہوں گا کہ کیا واقعی آج کے ادبی ماحول اور منظر نامے میں اس قدر تبدیلی آگئی ہے کہ جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی اور یہ کہ کیا آج کا ادب واقعی اس قدر انتشار کا شکار ہے؟ جیسا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھا؟

مظفر ایرج۔ یار سعید! جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب میں ایسی کوئی طوفانی تبدیلی نہیں آگئی ہے کہ جس سے تخلیق کار یا قارئین وسامعین پر ہیبت یا لرزہ طاری ہو جائے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تبدیلی زندگی اور معاشرے کا ایک ناگزیر حصہ اور پہلو ہے۔ جس سے سماج اور معاشرہ یا تو بنتا ہے یا بگڑتا ہے۔ چونکہ ادب بھی ہمارے معاشرے، سماج اور ہماری زندگی کا بہت اہم حصہ ہے لہٰذا اس پر بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ اثرات مرتب ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے زمانے میں بھی ہوتے تھے۔ چونکہ پہلے کے زمانوں میں سماج، زندگی اور معاشرے میں تبدیلی کی رفتار دور حاضر سے سست تھی۔ اس وجہ سے ادب میں تبدیلی کی رفتار اسی مناسبت سے تھی۔ آج چونکہ سماج و معاشرہ اور زندگی برق رفتاری سے ہمکنار ہیں۔ لہٰذا ادبی تبدیلیاں بھی زیادہ نظر آرہی ہیں۔

وحشی سعید۔ تو اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ ادب، سماج، معاشرہ اور زندگی کا تابع ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جیسا کہ تم نے بتایا تھا کہ بنارس میں تمہارا دل کسی اچھی ہندی جاننے والی طالبہ پر آگیا تھا اور اس نے تمہاری زندگی پر ایسا اثر ڈالا کہ تمہارے تخلیق کردہ ادب میں ہندی کے الفاظ جا بجا نظر آتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ نوخیز جوانی سے بڑھاپے کی آخری عمر آجانے پر بھی تمہاری نظموں، غزلوں میں ہندی کی کثرتِ الفاظ کے متعلق کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ پھر کس طرح کی تبدیلی پر تم نے اتنی لمبی چوڑی بات کر دی؟

مظفر ایرج۔ ارے یار! تم بھی بات کو کہاں سے کہاں لے کر چلے جاتے ہو۔ اصل میں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

تمہارے تخلیقی ذہن سے علامتی بھوت ابھی تک اترا نہیں ہے اس لیے تم ہر بات پر ضرورت سے زیادہ دماغ لگا دیتے ہو۔ بقول شاعر ؎

بات دل کی تھی دل سے ہو جاتی
بیچ میں تم دماغ لے آئے

دراصل تمہیں جو میری تخلیقات میں ہندی کے الفاظ کی کثرت دکھائی پڑتی ہے، وہ یقیناً بنارس میں رہنے کا ہی عطیہ ہے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ کوئی بھی شعری یا افسانوی رویہ یا طرز آپ کے مخصوص تخلیقی خانوں میں جگہ بنا لیتی ہے تو پھر وہ تا حیات اس کا ساتھ دیتی ہے اور بیش تر اس کی تخلیقی شناخت کا ضامن بھی بن جاتی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو دیکھو۔ ان کے ادوار میں بھی کئی بڑی اور اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تو کیا ان سے ان کی غزلوں اور نظموں میں برتے جانے والے الفاظ یا جذبہ بھی بدل گیا؟ تم خود کو دیکھو، کیا تمہارے پرانے افسانوں کے الفاظ کو تم نے یکسر ترک کر دیا ہے اور اپنے نئے افسانوں میں بالکل نئے الفاظ استعمال کر رہے ہو؟

وحشی سعید۔ یار! وحشی میں ہوں اور وحشت زدہ گفتگو تم کیے جا رہے ہو، بھلا یہ بھی ممکن ہے؟ تم ناممکن بات کر رہے ہو جبکہ پہلے تم نے، جس طرح زندگی معاشرہ سماج اور ادب کی بات کی، اس سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادب ایک طرح سے سماج، معاشرہ اور زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا تابع ہے اور بس۔

مظفر ایرجؔ۔ تمہارا یہ اندازہ تمہاری اپنی عقل کا ہے جسے تم ایک طرح سے ادب کو زندگی، معاشرے اور سماج کا تابع دیکھ رہے ہو۔ اگر دوسری طرح سے دیکھو گے، میرا مطلب ہے کہ دوسرے پہلو یا مختلف انداز یا زاویۂ نگاہ سے دیکھو گے تو تم کو دوسرے انداز ے بھی ہوں گے۔ ارے بھائی میں نے پہلے ہی کہا کہ ادب زندگی سماج اور معاشرے کا اہم حصہ ہے۔ تو تم اس کو، اس طرح بھی تو سمجھ سکتے ہو کہ جب ادبی قدریں کمزور ہو

جاتی ہیں تو زندگی، سماج اور معاشرہ کی قدریں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ ادب کا زوال زندگی وسماج اور معاشرے کے زوال کا پیش خیمہ ہے۔

وحشی سعید۔ لفاظی میں واقعی تمہارا کوئی جواب نہیں۔ اچھا اب اس بات پر غور کرتے ہیں کہ "نگینہ" کا جو معیار تھا، اس معیار سے آگے یا کم از کم اس معیار کو برقرار رکھتے ہوئے "نگینہ" کی ازسرِ نو اشاعت کو جاری رکھا جا سکے۔

مظفر ایرج۔ دراصل اس میں دو باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں، اول تو یہ کہ ہم عمر کے اس پڑاؤ پر، پہلے کی طرح بحث کر پاتے ہیں یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ آج جہاں تخلیقات کی کثرت ہے وہیں ان کے معیار میں بھی فرق آیا ہے۔ لہٰذا آپ کو اپنی اس فراخ دلی والی عادت پر قابو رکھنا ہوگا کہ جہاں کسی ادیب یا شاعر کا فون آیا اور انھوں نے اپنی تخلیق کی اشاعت کے متعلق التجا کی تو آپ سے نا نہیں کہا جاتا۔ فوراً حامی بھر دیتے ہو۔ دیکھو یار پہلے کی بات اور تھی، تخلیقات معیاری ہوا کرتی تھیں۔ دراصل اُس وقت "نگینہ" کو معیاری تخلیقات ہی ارسال کرتے تھے۔ اب ایک پوری نسل بدل چکی ہے تو اس لیے شروع سے اس کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔

وحشی سعید۔ چلو تمہاری لفاظی بھی مان لیتے ہیں۔ لیکن ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ جب آج کے زمانے میں موضوعات کی بھی کثرت ہے مسائل بھی پہلے سے زیادہ ہی ہیں، اعلیٰ پایہ کی معیاری کتابوں کی حصولیابی بھی پہلے سے آسان ہوگئی ہے تو اس طرح مطالعے کی راہیں بھی پہلے سے آسان ہیں تو پھر ادب کا معیار کیوں زیادہ تر تخلیقات میں اپنے ادبی تقاضے پورے نہیں کرتا۔

مظفر ایرج۔ دراصل لوگوں میں مطالعے کا شوق اور رجحان بہت کم رہ گیا ہے۔

وحشی سعید۔ کیا بات کرتے ہو یار! کیا بنے پڑھے ہی اتنا سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اب تم نے پڑھنا اور مطالعہ کرنا چھوڑ دیا ہے تو کیا سارے قلم کاروں کو اپنے جیسا سمجھتے ہو۔

وحشی سعید نمبر

دراصل اس کی وجوہات دوسری ہیں۔ مطالعے کی کمی کی بات میں نہیں مانتا۔ میرے خیال میں ہوا یہ ہے کہ اچھی اور معیاری کتابوں کی پہچان کرنا آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اپنے جموں وکشمیر میں ہی دیکھو، ہر تیسرا تخلیق کار ماہر اقبالیات بنا پھرتا ہے۔ ہر تیسرے تخلیق کار کی اقبالؔ سے متعلق کوئی کتاب، کوئی نظم، کوئی غزل یا کوئی بھی ادبی تصنیف موجود ہے لیکن ان میں سے معیاری کتنی ہیں؟ اقبالؔ پر لکھنے والے ہر تخلیق کار کا دعویٰ ہے اس نے اقبالؔ کے فن اور ان کی شخصیت کے متعلق نئے یا بہت اہم گوشے تلاش کئے ہیں۔ لیکن آپ آج کے عہد کی اگر تقریباً ۱۰۰ رکتابیں پڑھیں، تو شاید ۲ر،۴ر میں ہی آپ کو کام کی باتیں ملیں گی۔ اب یہ مان لیا جائے کہ کئی اسکالروں نے یا مطالعہ کرنے والوں نے ان دو چار اہم کتابوں کے علاوہ ساری کتابیں پڑھی ہوں، تو انھیں کیا ملے گا؟ کیا ان کے لیے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مطالعہ کئے بغیر ہی لکھ دیا ہے کیونکہ مطالعے کے بعد بھی اگر وہ کچھ لکھیں گے تو سطحی کتابوں کے مطالعے کے سبب سطحی ہی لکھیں گے۔ تو مسئلہ دراصل یہ نہیں ہے کہ مطالعہ کا رجحان نہیں ہے۔ مسئلہ اعلیٰ معیاری اور اہم کتابوں کی شناخت کا ہے۔

مظفر ایرجؔ۔ تمہاری بات کا زیادہ تر حصہ تو خیر بیکار ہے لیکن میرے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ادبی تبادلہ خیال سے تمہارے دماغ میں کچھ باتیں آجاتی ہیں تو چلو یہ تمہاری عادت مجھے اچھی لگی کہ تم مجھ سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہو۔ تو لگے ہاتھوں یہ بھی بتادو کہ یہ شناخت کا مسئلہ کیسے حل ہوسکتا ہے؟

وحشی سعید۔ اس مسئلے کا حل جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ اردو دنیا کے موجودہ تخلیق کاروں میں بھی بڑے اور اہم نام ہیں، چاہے وہ کسی بھی صنف ادب سے تعلق رکھتے ہوں، ان سے رابطہ کیا جائے اور ان سے دریافت کیا جائے کہ اعلیٰ معیاری کتب کون ہیں اور ان کی وصولیابی کس طرح ممکن ہے۔ اب اگر کسی اسکالر نے یا مطالعہ کرنے

وحشی سعید نمبر

والے نے، مان لیجیے کہ صرف انھیں چار کتابوں کا مطالعہ کیا جو اعلیٰ معیاری تھیں تو یقیناً ان کے شعور پر اس کا اثر دوسرا ہی ہوگا۔ اب جو تحریریں اس کے قلم سے نکلیں گی یقیناً ان میں شعور کی بالیدگی نظر آئے گی۔

مظفر ایرج۔ لیکن یہ بھی تو ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تخلیق کاروں کے بھی اپنے کچھ مخصوص نظریات ہوتے ہیں اور اگر ان سے اہم کتابوں کے متعلق گفتگو کی جائے گی تو کیا نظریاتی تعصب درمیان میں حائل نہیں ہوگا؟

وحشی سعید۔ بالکل ہوسکتا ہے مری جان! لیکن نظریات کوئی بھی ہوں، کتابیں تو ہر نظریئے کی اعلیٰ پائے کی ہی ملیں گی اور پھر یہ قاری کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ جو بھی نظریہ اختیار کرے۔

مظفر ایرج۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ سے یہ باتیں بھی سیکھ لیں، لیکن میرے پیارے دوست بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں جن پر مختلف یا منفرد نظریات کے بڑے لوگوں کی آراء ہیں جس میں صرف ۱۹-۲۰ کا فرق ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو لے لو، کہیں میرؔ بڑے ہیں تو کہیں غالبؔ پہلے آئے ہیں۔ اسی طرح اقبالؔ کے بڑے شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں خواہ انھیں کوئی اقبالؔ لکھے یا پھر بحیثیت صرف اور صرف فنکار یا شاعر کی صورت میں دیکھے۔ اسی طرح ان کی کم از کم تین نظمیں ساقی نامہ، مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق ہر اعتبار سے اعلیٰ معیار کی ہیں ان میں سے ہر ایک کو آگے پیچھے کرنا بہت مشکل ہے۔ اب تم مجھ سے یہ بھی سیکھ لو جب قاری کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا تخلیقی شعور خود اتنا بالیدہ ہو جاتا ہے کہ کسی بھی کتاب کے چند اوراق کے مطالعے کے بعد اسے اس کتاب کے معیار کا احساس ہو جاتا ہے اور اس کا تخلیقی ذہن خود انتخاب کے لائق ہو جاتا ہے۔ لیجیے ظہورؔ ترمبو صاحب بھی آ گئے۔ ظہورؔ صاحب سے بھی مشورہ کر لیتے ہیں۔ ظہورؔ صاحب! ہم

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

یقین کرنے کی مجبوری ہے ورنہ تم کہو گے کہ موقع نہیں دیا گیا۔

ظہور صاحب۔ مجھے بھی یقین کے باوجود کچھ واہمہ سا ہے لیکن وحشی سعید صاحب کو ۲-۳ر شماروں تک موقع دینے کی مجبوری ہے ورنہ کچھ خطرہ تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔

وحشی سعید۔ظہور صاحب! یقین رکھیں، مجھے "نگینہ" کی ٹیم پر پورا بھروسہ ہے، انشاءاللہ ہم اس کے اعلیٰ معیار پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ آخر ہمارے والدین کی دعائیں بھی تو ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ مظفر بوڑھا ہو گیا ہے اور بڑھاپے میں اس کا دماغ آج کچھ زیادہ ہی کام نہیں کر رہا ہے۔

مظفر ایرج۔ارے یار! ایک طرف تو تم مجھے بوڑھا کہتے ہو اور اتنی لمبی چوڑی گفتگو اور بحث کے بعد میں واقعی تھک گیا ہوں، اس جانب توجہ نہیں کرتے۔ آج تم نے مجھ سے بہت کچھ سیکھ لیا، تو گرو دکشنا کے طور پر گاڑی منگاؤ تا کہ میں گھر جاؤں اور آئندہ اردو ادب کے تعلق سے تمہیں نئی باتیں کیا سکھانی ہیں، ان پر غور و فکر کر سکوں۔

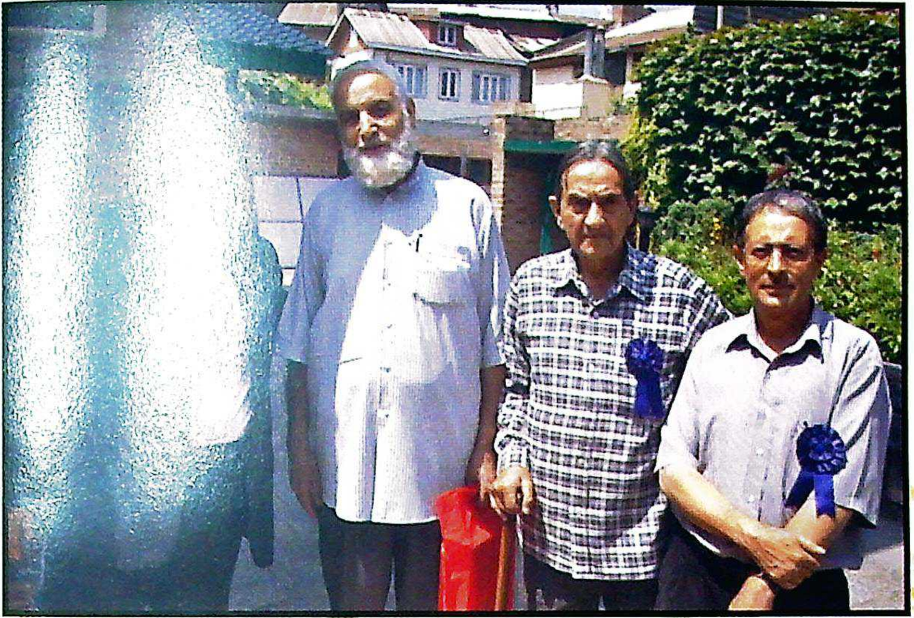
☆ وحشی سعید



وحشی سعید، ظہور تنویر اور نور شاہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے۔



وحشی سعید، ظہور تنویر، نور شاہ اور جاوید انور۔



غلام نبی شاہد، نور شاہ، ڈاکٹر اشرف آثاری اور وحشی سعید۔



وحشی سعید اور خالد حسین۔



وحشی سعید، خالد حسین اور ظہور تنویر کے ساتھ۔



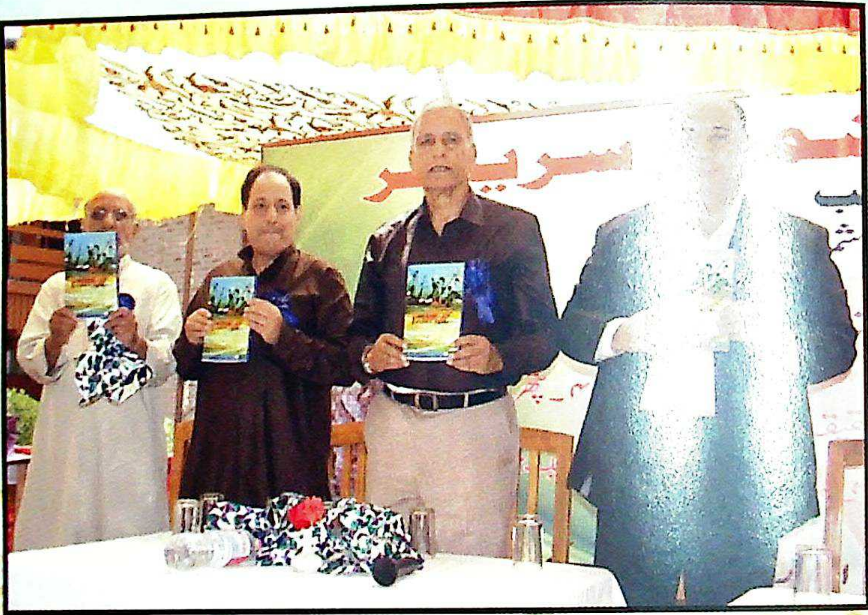
غافل کشتواڑی، مشتاق کنہی، طارق شبنم، مشتاق احمد وانی، وحشی سعید، مظفر ایرج،
شبنم قیوم اور شیخ بشیر کے ساتھ۔



وحشی سعید اپنے قریبی دوست مظفر ایرج کے ساتھ۔



وحشی سعید، بیرونِ ریاست کے مدعو شعراء، علی منیر، ظہیر انصاری اور مجیب شہزر کے ساتھ۔



وحشی سعید کی تصانیف کی رسم رونمائی پر، ساتھ میں خالد حسین،
ظہور تنویر اور مظفر ایرج۔



پروفیسر قدوس جاوید، جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی اور پروفیسر حامدی کاشمیری
اسناد پیش کرتے ہوئے۔



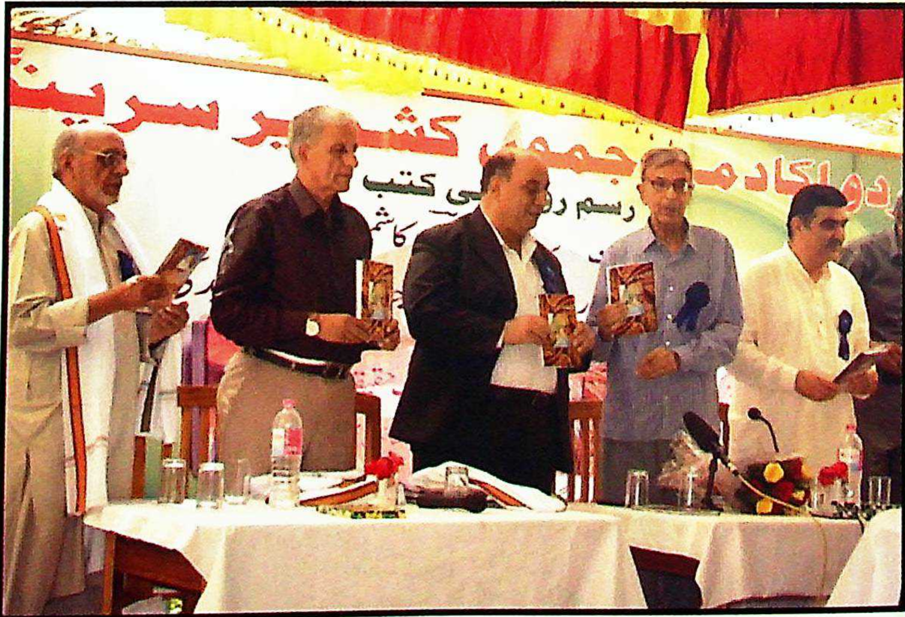
وحشیؔ سعید، خالد حسن کے ساتھ، عالم بنارسی سے ''تحریک ادب'' بنارس کی جانب سے سندِ افتخار وصول کرتے ہوئے۔



جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی، پروفیسر حامدی کاشمیری، وحشیؔ سعید اور خالد حسین اسناد کے ساتھ۔



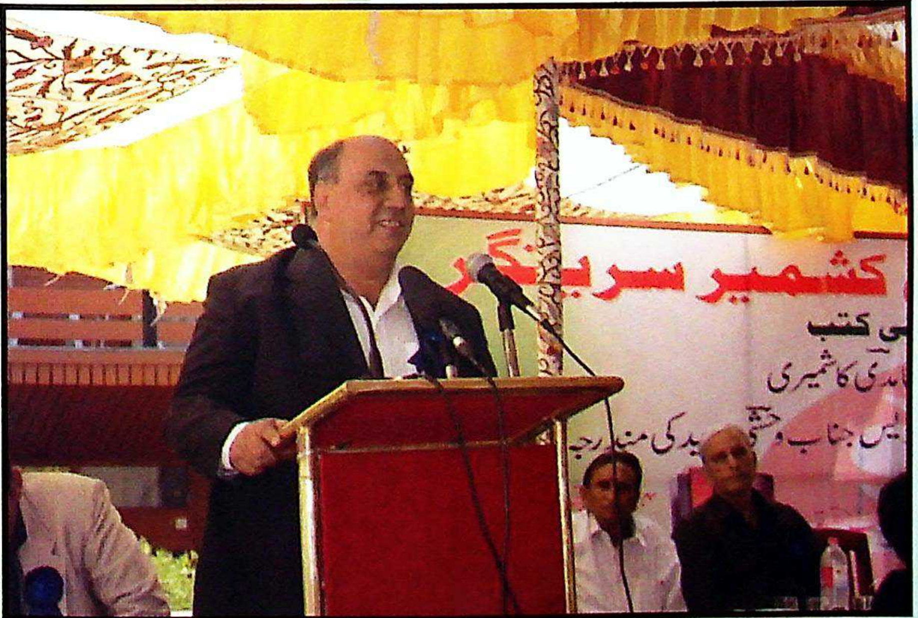
وحشی سعید پریس کانفرنس دیتے ہوئے۔



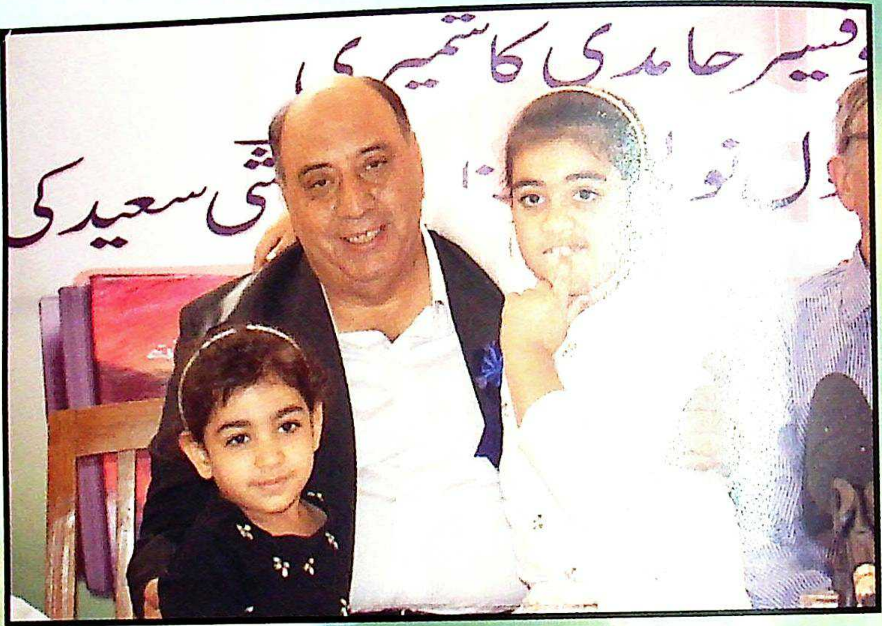
جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی، پروفیسر حامدی کاشمیری، وحشی سعید، خالد حسین اور مظفر ایرج
وحشی سعید کی تصانیف کی رسم رونمائی کرتے ہوئے۔



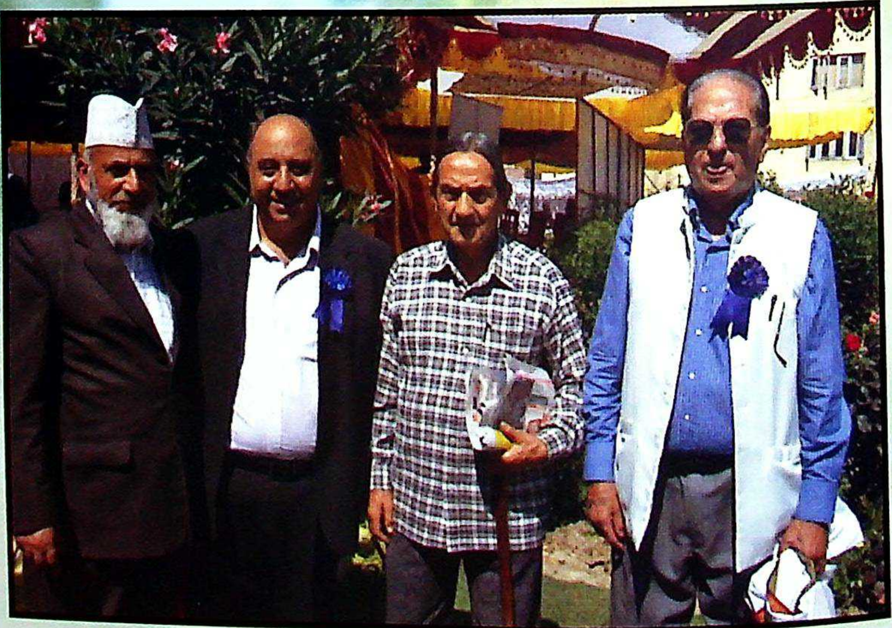
پروفیسر قدوس جاوید، جسٹس (ر) بشیر کرمانی، پروفیسر حامدی کاشمیری، وحشی سعید، خالد حسین اور مظفر ایرج نگینہ کی رسم اجراء کے موقعہ پر۔



وحشی سعید خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے۔



وحشی سعید صاحب فیملی کے ساتھ۔



غلام نبی خیال، نور شاہ، وحشی سعید اور سلطان الحق شہیدی۔



پروفیسر حامدی کاشمیری، وحشی سعید اور خالد حسین، ڈاکٹر اشرف آثاری کی تصنیف
''علامہ اقبال اور مرزائیت'' کی رسم رونمائی پر۔



وحشی سعید، ظہور تنویر، مظفر ایرج، جاوید انور دیگر مہمانوں کے ساتھ گروپ فوٹو۔



جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی، پروفیسر حامدی کاشمیری خطبہ صدارت دیتے ہوئے،
جاوید انور مائیک ہاتھ میں لیے۔



الطاف قریشی اور وحشی سعید۔



شبیر احمد صدیقی ایڈوکیٹ، نذیر احمد اونگا، وحشی سعید، محمد اشرف مرزا
اور ایڈوکیٹ محمد امین۔



وحشی سعید اور شہزادہ صاحب۔



وحشی سعید اور ظہور تنویر اپنے اہل خاندان کے ساتھ۔



ظہور تنویر، پیر عبدالرحمٰن اور وحشی سعید۔



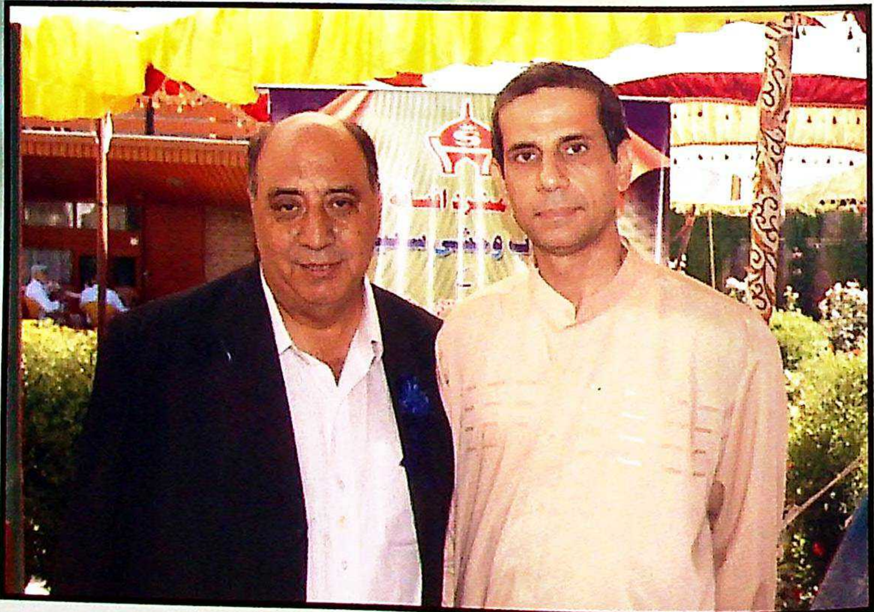
وجیہہ احمد اندرابی، ڈاکٹر اشرف آثاری، نور شاہ، وحشی سعید اور شیخ بشیر۔



شوکت علی اور وحشی سعید۔



نورشاہ، وحشی سعیداور شیخ بشیر۔



محمود پراچہ اور وحشی سعید۔



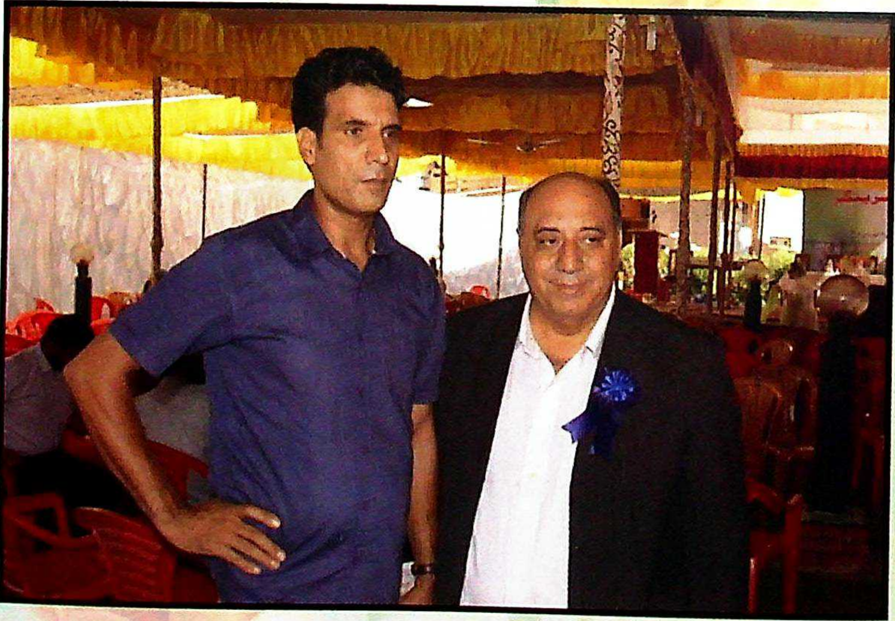
وحشی سعید، ظہور تنویر اپنے اہل خاندان کے ساتھ۔



ایثار کشمیری، طارق شبنم، وحشی سعید، ناصر ضمیر، ڈاکٹر نذیر مشتاق، غلام نبی شاہد
اور سلیم سالک کے ساتھ۔



وحشیؔ سعید اور ظہور تنویر اہل خاندان کے ساتھ



وحشیؔ سعید اور مہمان۔



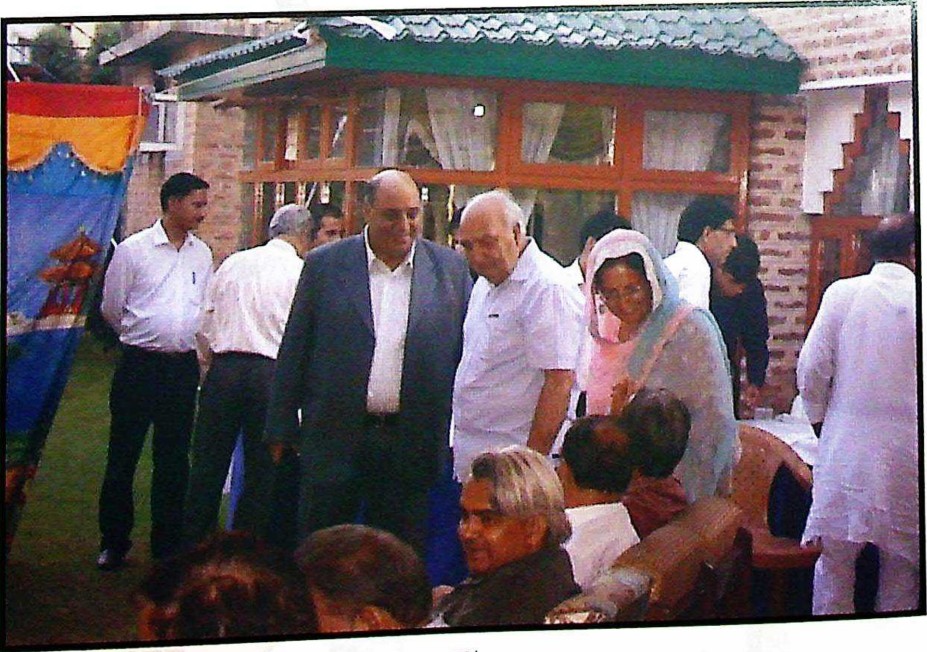
وحشی سعید اور آل انڈیا مشاعرے کے ناظم جاوید انور دیگر مدعو شعراء کے ساتھ۔



مدعو حاضرین میں کرسیوں پر تشریف فرما مظفر ایرج، رخسانہ جبیں،
نورشاہ وغیرہ کے ساتھ وحشی سعید۔



مشتاق احمد وانی اور وحشی سعید۔



رخسانہ جبیں، فاروق نازکی، وحشی سعید اور دیگر مدعوسامعین۔



سیفی سرونجی، وحشی سعید، نور شاہ اور شبنم قیوم کے ساتھ۔



شبنم قیوم، وحشی سعید، نور شاہ، جاوید انور، ظہور ترمبو اور مظفر ایرج کے ساتھ۔



پروفیسر قدوس جاوید، جسٹس بشیر احمد کرمانی، پروفیسر حامدی کاشمیری
سندِ افتخار پیش کرتے ہوئے



شیخ بشیر احمد، مشتاق کنہی، طارق شبنم، مشتاق احمد وانی، وحشی سعید اور مظفر ایرج۔



علی منیر اپنا فکر انگیز کلام سناتے ہوئے۔



پروفیسر حامدی کاشمیری، وحشی سعید اور خالد حسین۔



پروفیسر حامدی کاشمیری کو عالم بنارسی دوشالہ اور مظفر ایرج توصیف نامہ
جسٹس بشیر احمد کرمانی اور وحشی سعید کی موجودگی میں پیش کرتے ہوئے۔



وحشی سعید پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے۔



شبیر مجاہد، غلام نبی خیال، احمد شناس، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر حامدی کاشمیری،
وحشی سعید، خالد حسین اور مظفر ایرج ایوانِ صدارت میں بیٹھے ہوئے۔



ظہور تنویر، وحشی سعید اور ایڈوکیٹ نذیر احمد اونگا۔

فکروفن اور شخصیت

وحشی سعید کشمیر کے ایک آسودہ حال بزنس گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک افسانوں کی تخلیق کرتے رہے۔ ایس. پی. کالج میں تعلیم کے دوران کالج کے معروف اور قدیم میگزین ''پرتاپ'' میں شامل ہو کر اپنے ادبی سفر میں قدم رکھا۔ اس دوران ۱۹۷۲ء میں ماسٹرس آف آرٹس کی ڈگری حاصل کی۔ کئی سال تک ''نگینہ'' کے نام سے ایک رسالہ بھی ترتیب دیتے رہے۔ اس رسالہ کے افسانہ نمبر اور تخلیق نمبر بہت برس گزرنے کے بعد بھی افسانوی ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ تخلیق نمبر میں اُن کا ناولٹ ''ایک موسم کا خط'' بھی شامل ہے۔ ''سڑک جارہی ہے'' اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ یہ اُن کی ۵۷ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں اُن کے تحریر کردہ ۲۱/افسانے شامل ہیں۔ ان کے تین اور ناول ''منزل اور تلاش''، ''خوف اور محبت'' اور ''قحط'' منظر عام پر آچکے ہیں۔

☆ نور شاہ

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

☆ پروفیسر حامدی کاشمیری

☆ پروفیسر قدوس جاوید

☆ ظہیر انصاری (خاکہ)

☆ شان بھارتی

☆ اشرف آثاری (شخصیت)

☆ کرشن کمار طور

☆ دیپک بدکی

☆ رئیس الدین رئیس

☆ سیفی سرونجی

☆ جاوید انور

☆ شارق عدیل

☆ سلیم انصاری

☆ عرفان عارف

☆ علی منیر

☆ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

☆ احمد عثمانی

☆ محمد قسیم اختر

☆ اصغر دیلوری

☆ نٹ کھٹ عظیم آبادی

☆ ڈاکٹر مجیب شہزر

☆ الف آزاد دلنوی (انشائیہ)

☆ جاوید انور (انٹرویو)

وحشی سعید کے نئے افسانوی مجموعے پر ایک نظر

☆ پروفیسر حامدی کاشمیری

اردو میں صنفِ افسانہ بیسویں صدی کے آغاز میں متعارف کی گئی۔ مغرب میں اس سے قبل اس کا آغاز ہوا تھا۔ اس میں ہیت کے لحاظ سے ناول کے مقابلے میں اختصاریت سے کام لیا گیا اور یہی اس کا نشانِ امتیاز قرار پایا۔ چنانچہ اس میں تخیلی فضا میں کردار و واقعہ کے عمل اور ردِ عمل سے زندگی کے مسائل و حالات کو پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں عالمی سطح پر معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی حقائق و مظاہر کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر ذہنی اور لاشعوری کوائف کی مصوری کی جاتی رہی۔

۱۹۱۷ء میں روس میں مارکسیت کے بلند آہنگ اور زود اثر نظریے نے مشرق و مغرب کے لکھنے والوں کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ہندوستان میں جہاں لوگ برطانوی سامراج سے بیزار ہو کے آزادی اور جمہوریت کے حصول کے لئے بغاوت پر اتر آئے۔ یہ سیاسی صورتِ حال ہمہ گیر ہوگئی اور مارکسیت حقیقت پسندانہ نظریے کی صورت اختیار کر گئی اور اس کے زیرِ اثر شعر و ادب متشکل ہوتا رہا۔ چنانچہ اس عہد میں پریم چند نے حقیقت پسندانہ نظریے کے تحت سماجی اونچ نیچ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس زمانے میں رومانی افسانے بھی لکھے گئے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر نے خاص طور پر سماجی اور سیاسی مسائل و حقائق کو افسانوں کا موضوع بنایا۔

جہاں تک جموں و کشمیر کا تعلق ہے یہاں بھی کم و بیش اسی نوعیت کے افسانے لکھے جاتے رہے۔ پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، اور علی محمد لون اس میں پیش پیش تھے۔ ان کے بعد کئی نئے افسانہ نگار سامنے آگئے جن میں نور شاہ، خالد

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

حسین، پشکر ناتھ، وریندر پٹواری، وحشی سعید، عمر مجید، دیپک بدکی، آنند لہر جیسے لاتعداد افسانہ نگار نمایاں ہو گئے۔ جن سب کا نام فرداً فرداً یہاں لینا ممکن نہیں ہے۔

وحشی سعید کا افسانوی سفر ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ انہوں نے مروجہ انداز میں کئی افسانے لکھے، جو "خواب حقیقت" "سڑک جا رہی ہے" اور "یادگار محبت" کے عنوانات سے منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ جولائی ۲۰۱۴ء میں ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ "کنوارے الفاظ کا جزیرہ" چھپ کر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اس مجموعے سمیت ہی ان کے جملہ افسانوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالونگا۔ لیکن آخری افسانوی مجموعے کے مطالعے پر میرا قلم رک گیا۔ یہ مجموعہ ان کے بقیہ مجموعوں سے بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ یہ غیر روایتی افسانوی تکنیک، ہیئت کاری، لفظ شناسی، فنی برتاؤ، کردار نگاری، معنی آفرینی، جدت طرازی کی تابندہ مثال ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ افسانے زبان و بیان کے تخلیقی سرچشموں کو جگانے اور حیرت ونشاط سے ہمکنار کرنے کی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں جو تخلیقیت کے اسرار و رموز سے قاری کو حقیقت سے الگ کر کے فن کے طلسمی دنیا میں لے جاتے ہیں، ظاہری طور پر یہ مقصدیت یا خارجی حقیقت سے منحرف نظر آتے ہیں، لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ افسانے اپنے خالق کے نظریاتی موقف، سماجی نشیب وفراز، حسن وعشق، جنس و رومان، سیاسی چنگیزیت، فرد کی گمشدگی، خوابوں کی شکست، محرومی اور آزردگی کے رمز وایما کے امیں ہیں۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشین دل
مے بینمت عیاں و دعا مے فرستمند

آیئے اِس افسانوی مجموعے کے پہلے افسانے "کشکول" پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ ایک تخلیقی افسانہ ہے۔ اس میں افسانے کا راوی خود افسانہ نگار نہیں۔ بلکہ ایک فرضی کردار ہے۔ جو افسانے کی غیر معمولی تخلیقی فضا کی تخلیق کاری میں شریک ہے۔ اس میں راوی

کے علاوہ سہیلؔ اور اس کی تین بہنیں، نیلوفرؔ، زاہدؔہ اور فریدؔہ ہیں۔ سہیلؔ انجینئر ہے اسکی شادی حسن و جمال میں یکتا لڑکی سے ہوتی ہے۔ یہ وہی ناظرہ جمال ہے۔ جسے افسانے کا مرکزی کردار، جو ایک آرٹسٹ ہے، دل و جان سے چاہتا ہے۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا ہے تو قوسِ قزح کے نام سے یاد کرتا ہے۔ خود وہ لڑکی بھی اسے چاہتی ہے۔ لیکن وہ اپنی چاہت کو زبان پر نہیں لاتی ہے۔ اسے احساس ہے کہ شادی کے بعد وہ پتھروں کی دنیا میں آ گئی ہے، اور اپنی خوشبو کھو رہی ہے۔ آرٹسٹ کو سہیلؔ کی تینوں بہنوں میں سے ایک کا دامن تھام لینا تھا۔ یہ سہیلؔ اور اسکی بہنوں کی بھی خواہش تھی۔ زاہدؔہ شاعرہ تھی۔ قوسِ قزح suggest کرتی ہے کہ اسے زاہدؔہ سے شادی کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے دل میں قوسِ قزحؔ بس گئی تھی۔ وہ قوسِ قزحؔ کو کسی قیمت پر بھولنے کو تیار نہ تھا۔ ایک سنسان شام کو وہ اس کے پاس آتی ہے، اور اس کے پوچھنے پر، پُردرد آواز میں کہتی ہے۔ ''پتھروں کی دنیا نے مجھے پتھر بنا دیا'، اس کے پوچھنے پر کہ کیا اب اسے احساس ہوا ہے۔ وہ خاموش رہتی ہے۔ خاموشی اس کے لئے بڑی کربناک تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے میں ٹہلتی رہی...... کبھی وہ اپنے ماتھے کے پسینے کے قطرے رومال سے خشک کرتی رہی۔ اچانک وہ وحشت زدہ آواز میں بول اٹھتی ہے...... ''چلے جاؤ پتھروں کی دنیا سے چلے جاؤ، میں پتھر رہنا چاہتی ہوں، صرف پتھر رہنا چاہتی ہوں، خود میرا درد روگ بن گیا ہے، ظاہر ہے وہ اپنی محبت کو داؤ پر لگا کے پتھر بن چکی ہے''۔

افسانے کے واقعات خواب میں وقوع پزیر واقعات کے طور پر ابھرتے ہیں۔ یہ اپنی علامتی ساخت میں منطقیت کے بجائے عدمِ منطقیت کو روا رکھتے ہیں اور منولاوسکی کے اس قول کی یاد دلاتے ہیں......

The technique of art is to make objects unfamiliar.

تاہم وحشی سعید نے کسی ارادی کوشش سے اس نوع کے علامتی افسانوں کو مشکل یا

وحشی سعید نمبر

بعید از فہم نہیں بنا دیا ہے۔

دو ایک افسانوں سے مطمح النظر بہ خود ماورائی حرکی اور وحشیانہ وغیرہ ہونے میں ظاہر بات ہے اس کے لئے خامی قارئین کی تنقیص، فکری ہے۔ بقولِ سٹینلے فش

''یاد رہے کہ اس نوع کے افسانوں میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ الفاظ کیا کرتے ہیں نہ کہ الفاظ کے کیا معنی ہیں۔''





وحشی سعید کے لکھنے کے انداز سے واضح ہے کہ وہ ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں اور ان کی پلاٹ کی بنت بہت مضبوط ہے جو قاری کو آخر تک اپنے ساتھ جکڑے رکھتی ہے۔ ان کے موضوعات روایت کے قریب ہیں اور ان کے موضوعات زیادہ تر شہر کے گلی کوچوں کی دنیا سے متعلق ہیں لیکن ان کے کمال فن نے ان میں جان ڈال دی ہے۔ ان کی کچھ کہانیوں میں مابعد طبیعاتی رویئے بھی موجود ہیں اور کہیں کہیں تصوف کا ذائقہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رچی بسی علامت نگاری بھی ان کے فن کا ایک واضح حصہ ہے جن پر قلم آزمائی کرنا بہت ہی کم اہل قلم کو آتا ہے۔ علامت نگاری جیسے مشکل فن پر ہاتھ ڈالنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ وحشی سعید افسانے تراشنے کا فن جانتے ہیں بلکہ اُردو زبان پہ بھی عبور رکھتے ہیں، ان کے مکالمے نہ صرف جاندار بلکہ پڑھنے والے کے ذہن میں اتر جانے والے ہیں۔ ان کے فقروں کی بنت اور ترتیب میں منفرد انداز پایا جاتا ہے جو ان کی فنی ریاضت کی دلیل ہے''۔

☆ رشید امجد (پاکستان)

وحشی سعید......افسانے کی نئی سڑک

☆ پروفیسر قدوس جاوید

افسانہ نہ صرف موضوع ہوتا ہے نہ محض ہئیت یا اسلوب، بلکہ معاشرہ اور ثقافت کے حوالے سے بیانیہ کا کون سا فنی یا جمالیاتی ،فکری یا احتساسی پہلو تحریر کو افسانہ بنا دے گا یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا لہذا ،کسی بھی افسانہ کے بارے میں کچھ بھی کہنے کیلئے ،افسانہ کے بیانیہ (Narration) کے اندرون میں اتر کر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ افسانہ میں، بیانیہ کو، زندہ، متحرک اور ترسیلی بنانے میں زبان کے کردار کی نوعیت کیا ہے۔ کھول دو ،ٹوبہ ٹوک سنگھ (منٹو) اپنے دکھ مجھے دے دو، گرہن (بیدی) اور بالکونی، دو فرلانگ لمبی سڑک (کرشن چندر) وغیرہ میں وہ کون سی بات ہے جو ان تحریروں کو شاہکار افسانہ بناتی ہے؟ سچ کی نشتریت، کرداروں کی سادہ لوحی ،خارجی حقائق کے اندرون کو بے نقاب کرنے کا رویہ، زبان کا خودنگر کردار یا پھر کوئی اور ''شئے''۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی ایک، سب کے لئے قابل قبول جواب نہ تو دیا جا سکتا ہے نہ دیا جا سکا ہے وارث علوی ہوں کہ ممتاز شیریں، گوپی چند نارنگ ہوں کہ وہاب اشرفی ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر منٹو، بیدی کرشن چندر اور انتظار حسین کے چنندہ افسانوں کو اعلی و عمدہ ثابت کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ اور یہ غلط بھی نہیں کیونکہ ادب پنپتا ہی ہے افتراق اور اجتہاد سے۔ لہذی وحشی سعید کی افسانہ نگاری کے بارے میں بھی میری یا کسی اور کی رائے نہ تو حتمی ہوگی اور نہ قطعی اسلئے کہ افسانہ میں افسانہ نگار، محض افسانہ نہیں بیان کرتا بلکہ اپنے ماحول معاشرہ اور ثقافت کے اندر نمو پذیر ہونے والے کسی بھی نوعیت کے رشتہ، جذبہ، احساس، تجربہ یا مشاہدہ (ڈسکورس) کی فنی و جمالیاتی صورت گری کرتا

وحشی سعید نمبر

ہئے۔لفظ،لفظ صورت گری کے اس عمل سے جو قلمکار مردانہ وار گذر جانے کا ہنر اور حوصلہ رکھتا ہئے وہی اپنی تحریر کو''افسانہ'' بنانے میں کامیاب ہوتا ہئے۔اور وحشی سعید مین یہ ہنر یہ حوصلہ ہے یہ میں نہیں ان کے افسانوں کی زندہ، متحرک اور خود نگر زبان بولتی ہئے جوان کے بیانیہ کی شہہ رگ ہے۔وحشی سعید نے افسانہ نگاری کا شوق کم وبیش پنیتیس چالیس سال قبل پالا تھا۔لیکن اب افسانہ نگاری ان کی فطرت کا لازمہ بن چکی ہے۔اپنے افسانوی مجموعہ''سڑک جارہی ہئے''میں شامل افسانہ''نیلام'' کے راوی کی زبانی وحشی سعید خود کہتے ہیں......

''میں وقت کے چرخے میں خون جگر کی داستان لکھتا رہا۔کبھی اس داستان میں فاروق بھی شامل تھا۔حقیقت تو یہ ہئے کہ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہی نہ تھا۔نئے نئے کردار، نئے نئے انداز سے پیش کرنے کا جذبہ نہ تھا فاروق کی شاعری نے مجھے کہانیاں لکھنے پر اکسایا۔پھر زندگی کے اچھے برے کردار آتے رہے۔''(افسانہ.....نیلام..ص..۹۵)

یاد آتا ہئے غالباً تیس پینتیس سال قبل وحشی سعید کا ایک مختصر افسانوی مجموعہ شائع ہوا تھا۔اور میں نے کشمیر یونیورسٹی کے مجلّہ''بازیافت''میں اس پر تبصرہ بھی لکھا تھا۔لیکن پھر وحشی سعید کی تخلیقیت کا جھیل ڈل اُلٹی سمت میں بہتا ہوا کہیں دور نکل گیا لیکن کشمیر کی ادبی محفلوں میں جب بھی وادی کے افسانہ نگاروں کا ذکر چھڑتا نور شاہ، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، پشکر ناتھ، کلدیپ رعنا، عمر مجید اور مخمور بدخشی وغیرہ کے ساتھ ساتھ وحشی سعید کا نام بھی لازمی طور پر لیا جاتا تھا۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وحشی کے مذکورہ افسانوی مجموعے میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جو انہیں ادبی محفلوں میں زندہ رکھے ہوئے تھا۔لیکن جیسا کہ ذکر ہوا خود افسانہ نگار وحشی سعید کہیں پسِ منظر میں گم ہوگیا تھا۔لیکن اکیسوی صدی کی پہلی دہائی تک آخر انکشاف ہوا کہ وحشی سعید کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنے بہاؤ کے نئے راستوں

کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کئی بزرگوں نے تو تھکن کو گلے لگا لیا تھا لیکن نور شاہ، عمر مجید اور اشرف آثاری اور شیخ بشیر احمد وغیرہ نہ صرف یہ کہ ثابت قدم رہے بلکہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس سے نمایاں ہونے والے جدیدیت کے رجحان اور پھر ۱۹۸۰ء-۸۵ بعد مابعد جدید تصور ادب کے عروج کے اثرات بھی قبول کیے۔ اس عرصہ میں ریاست جموں کشمیر میں افسان نگاروں کی ایک خاصی تعداد سامنے آئی اور برصغیر کے افسانوی منظر نامے پر چھا گئے۔ ان میں خالد حسین، ویریندر پٹوری، دیپک بدکی، ترنم ریاض، بلراک بخشی کے بعد کی نسل کے زاہد مختار، فارور ریزو، مشتاق مہدی، ریاض توحیدی، مشتاق کینی، غلام نبی شاہد، ایثار کشمیری وغیرہ کی افسانہ نگار کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔ اس پیش منظر میں بحثییت افسانہ نگار وحشی سعید کا مقام اور معیار کیا ہے؟۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ وحشی سعید کے افسانے اپنی لسانی ساخت، فکری نظام اور فنی و جمالیاتی درو بست کے حوالے سے نہ صرف جموں کشمیر بلکہ دوسرے ادبی مراکز میں لکھے جا رہے افسانوں سے بھی مختلف ہیں دراصل اکیسویں صدی کی پہلی دوسری دہائی میں وحشی سعید کے کئی افسانوی مجموعے تھوڑے تھوڑے وقفے سے سامنے آئے ظاہر ہے کہ یہ افسانے الگ الگ وقتوں میں لکھے گئے ہونگے ان افسانوں کے موضوعات، اسالیب اور تخلیقی واظہاری رویوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ وحشی سعید کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ "سڑک جا رہی ہے" کے نام سے جون ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ اگر برصغیر کے معاصر اردو افسانہ کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مجموعے میں شامل چھوٹے چھوٹے تیس افسانے، لازمی طور پر توجہ طلب افسانے ہیں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ حالانکہ کئی تحریروں میں محض کوئی ایک کیفیت، جذبہ، مشاہدہ یا حسی تجربہ کا بیان، ایک آدھ کردار اور واقعہ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لوگ یہی کہیں گے کہ مختصر افسانہ اسی کو تو کہتے ہیں، بات درست ہے۔ اردو میں اس انداز کے افسانے کثرت سے لکھے بھی جا

رہے ہیں۔لیکن اگر یہ یاد رکھیں کہ یہ افسانے ۲۰۱۴ء میں قارئین کی نذر کیے گئے ہیں اور ۲۰۱۴ء میں ریاست جموں کشمیر کے بعض نئے افسانہ نگار مثلاً، ترنم ریاض، ریاض توحیدی، ناصر ضمیر، طارق شبنم اور راجہ یوسف وغیرہ اور کشمیر سے باہر نجمہ مسعود، مشرف عالم ذوقی، حسین الحق، شوکت حیات، عبدالصمد اور خالد جاوید وغیرہ کے افسانوں میں تکنیک بیانیہ اور کینواس کا جو تنوع نظر آتا ہے وہ وحشی سعید کے یہاں بھی ہے لیکن ذرا مختلف انداز میں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس ماحول، معاشرہ اور ثقافت میں وحشی سعید کی تخلیقیت پروان چڑھی ہے، وہ دہلی اور ممبئی یا لاہور اور کراچی جیسے ادبی مراکز کے ماحول معاشرہ اور ثقافت سے بڑی حد تک مختلف ہے حالانکہ وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' میں اکثر افسانوں کا میدان عمل یا جائے وقوع ممبئی دہلی اور حیدرآباد جیسے ترقی یافتہ شہر ہیں جہاں کا ''دسیلیکون سماج اور ثقافت'' ریاست جموں وکشمیر کے سماج اور ثقافت سے مختلف ہے۔اس ضمن میں ''ہڑتال، جب ممبئی جھک جائے گی، الجھے لمحے، یاد، دل والی، احساس کا گھاؤ......وغیرہ افسانے اہم ہیں۔ممبئی دلّی وغیرہ کے سماجی اور ثقافتی کھوکھلے پن کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے گویا وحشی سعید کی زندگی انھیں خرابوں میں گذری ہو......

''جب ممبئی جھک جائے گی، تو تاج محل ہوٹل کی شاندار عمارت کہاں ہو گی ...... اس میں ٹھہرنے والے لوگ کہاں ہوں گے۔ممبئی کی دھرتی میں ان کے ایسے راز بھی پوشیدہ ہیں جن کے افشا ہوتے ہی ان کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا ہوگا۔'' (افسانہ-جب ممبئی جھک جائے گی، ص:۴)

''ممبئی رنگین تھی۔اس رنگین دنیا میں طاہر کی توجہ کا مرکز بہت سی لڑکیاں تھیں، لیکن جودھ پور کی حسینہ اس کے دل پر قابو پا گئی۔''

(افسانہ الجھے لمحے، ص:۵۵)

''فلم اسٹوڈیو کے پاس جو چھوٹا اور واحد ریسٹورنٹ تھا، وہ احمد خان کا

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

تھا احمد خان اس کا سب کچھ تھا بیرے سے لے کر مالک تک کے سب فرائض وہ انجام دیتا تھا'' (افسانہ یاد، ص:۸۱)

اپنی نگوڑی قسمت ہی ایسی ہے۔ پاندان سے پان اٹھاتے ہوئے چھوٹی بیگم نے بوڑھی نوکرانی سکینہ سے کہا، سکینہ نے پاندان کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا ایو بیگم صاحبہ! آپ کو اس کا علاج کرنا چاہیئے۔ (افسانہ: وارث کی تلاش، ص:۹۹)

اپنی ذاتی زندگی میں وحشی سعید ایک شریف النفس اور وضع دار انسان ہیں۔ انسانی قدروں کا احترام ان کی شخصیت اور فن کو تقدس بخشتا ہے۔ ''انسانی ضمیر، ایمان داری، انسانی اقدار...... وغیرہ صفات کے زوال نے ایک طرف تو انسان کو حیوان بنا دیا ہے دوسری جانب اس زوال آدم کے سبب معاشرے کے ہر شعبے میں خود غرضی، مفاد پرستی، بدعنوانی اور فرقہ واریت کی اثر پذیری ایک چیلنج ثابت ہورہی ہے۔ انسانی تشخص کے اس بحران کے خلاف پوری دنیا کے ادیب و دانشور صف آرا ہیں اردو کے کئی دوسرے ادیبوں اور دانشوروں کی طرح وحشی سعید کے افسانوں میں بھی اس صورت حال کے خلاف تشویش و احتجاج کا اظہار ملتا ہے لیکن بڑے ہی فن کارانہ انداز میں۔

''آدمی کا ضمیر جب مر جاتا ہے، سوچ سمجھ سو جاتی ہے تب وہ حیوان بن جاتا ہے۔ لیکن چند دنوں پہلے وہ حیوان نہیں تھا۔ اس کا ضمیر بیدار تھا۔ اس کی سوچ سمجھ زندہ تھی، وہ انفرادی طور پر زندگی کے ہر پیچ و خم کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ اسی ضمیر نے اس کو سیٹھ دھنی رام سے یہ کہنے پر مجبور کیا ''سیٹھ میں ایسا کام نہیں کرسکتا۔'' (افسانہ: گناہوں کا پجاری)

''ہر کام مقصد کے لئے ہوتا ہے۔ کچھ کام ضمیر کے لئے ہوتے ہیں۔ تم چلی جاؤ...... چلی جاؤ...... دوست...... ضمیر...... مقصد...... سب کچھ ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوگیا۔ ضمیر کے جھانسے میں آ گیا۔ دوستی کے

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

جال میں پھنس گیا۔ اپنا مقصد فوت ہوگیا۔ سیاہی کا پردہ گر گیا، ضمیر پتھر بن گیا۔" (افسانہ: الجھے لمحے، ص:۶۳)

مقصد براری اور دنیاوی جاہ وحشمت کے حصول کے لئے ضمیر وایمان فروشی ہمارے معاشرے کا لازمہ بن چکی ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ جہاں پیار محبت، رشتہ اور دوستی سب کچھ بکاؤ ہو گیا ہو وہاں اب ضمیر اور ایمان کے خریدار بھی نہیں ملتے۔

"تین سال بعد جب اپنے شہر آیا تو گلی کوچوں کو پہچان نہ پایا۔ نہ اپنے دوست فاروق کو۔ جو بہت امیر بن گیا تھا۔ جس کا اخبار اب ہزاروں میں فروخت ہوتا تھا اور جس کے پہلو میں میمونہ لچکتی مسکراتی ہوئی چلتی تھی۔ اب مجھے اس بات پر تعجب نہ ہوگا اگر میں اپنے ضمیر کو کسی چوراہے پر نیلام کروں لیکن شائد اس دفعہ کوئی خریدار بھی نہیں ملے گا۔"

(افسانہ: نیلام، ص:۹۸)

وحشی سعید کو اس بات کا احساس ہے کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانی، بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے رجحانات اگر عام ہیں تو اس کی جڑیں ہمارے، اخلاقیات سے عاری سماجی اور معاشی نظام میں پیوست ہیں۔ ایمانداری کی راہ پر چلنے والوں کو حالات "گناہوں کا پجاری" کے مرکزی کردار رشید کی طرح آخر کار ایمان فروشی کی راہ پر چلنے پر مجبور کر دیتے ہیں بے ایمانی کی دنیا کے بادشاہ دھنی رام کے پاس آکر باضمیر انسان رشید آکر کہتا ہے کہ

"ہاں، آگیا ہوں...... اپنے ایمان کے پیرہن کو چاک کر کے آگیا۔ ضمیر کی زبان کاٹ کر رکھ دی۔ اصولوں کو بے حس کر دیا اور احساسات کو قتل کر دیا اور اب میں بے ایمانی کے راستے پر چلنے کے لئے آمادہ ہوں۔" (افسانہ: گناہون کا پجاری، ص:۹۱)

وحشی سعید نمبر

وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جا رہی ہے'' میں شامل ایک افسانے کا عنوان ''بھنگی'' ہے۔ عنوان پر نظر پڑتے ہی کرشن چندر کے ''کالو بھنگی'' کی یاد آنا ایک فطری امر ہے اور سوچا جا سکتا ہے کہ جس طرح سریندر پرکاش نے پریم چند کے ''ہوری'' اور شوکت حیات نے گھیسو اور مادھو کو لے کر افسانہ میں متن پر متن قائم کرنے کی مثالیں پیش کی ہیں اسی طرح وحشی سعید نے بھی کرشن چندر کے کالو بھنگی کے کردار کو لے کر متن پر متن قائم کیا ہئے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے، یہ درست ہے کہ وحشی سعید نے سماج کے انتہائی نچلے اور ناپسندیدہ طبقے کے ایک فرد کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے لیکن کرشن چندر کے کالو بھنگی اور وحشی سعید کے صمد بھنگی میں فرق ہے۔ کالو بھنگی کرشن چندر کا گھڑا ہوا افسانوی کردار ہے لیکن صمد بھنگی سماج کا ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ کالو بھنگی کرشن چندر کا ذاتی ملازم ہے جو بھنگی پیدا ہوا اور بھنگی ہی رہنا چاہتا ہے۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ افسانہ نگار کرشن چندر کبھی اسکی بھی کوئی کہانی لکھ دے۔ کرشن چندر کو کالو بھنگی سے ہمدردی ہے لیکن کرشن چندر، کالو بھنگی یا عام بھنگیوں کے قابل رحم سماجی حالات بدلنے کے بارے میں اپنی کوئی تعمیری رائے دیتے نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس وحشی سعید سماج کے اس طبقاتی نظام پر ہی چوٹ کرتے ہیں جس نے بھنگیوں کو ہتک آمیز زندگی جینے پر مجبور کر دیا ہے۔ وحشی سعید ''بھنگی'' جیسے ان تمام الفاظ کو ہی لغت سے خارج کر دینے پر اصرار کرتے ہیں جن پر ہمارے سماج نے گندے گھناؤنے معانی کے لحاف چڑھا دئے ہیں۔

''بھنگی کا لفظ جب زبان پر آتا ہئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو اس لفظ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے۔ در اصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے اور ان کو ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گندا لحاف چڑھ

جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک سے ٹانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا تو کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منھ لٹک جاتے۔ تب میرا دل چیخنے لگتا اور میں خود سے کہتا، اٹھو اور لفظوں کا گندہ لحاف اتار کر پھینک دو۔"

(افسانہ: بھنگی، ص:۷۲)

کئی اعتبار سے وحشی سعید کا افسانہ "بھنگی" کرشن چندر کے "کالو بھنگی" سے کہیں بہتر افسانہ ہے۔ کالو بھنگی راضی بہ رضا کردار ہے، جو نہ کچھ سوچتا ہے نہ چاہتا ہے اگر اسکی کوئی چاہت ہے تو بس یہ کہ افسانہ نگار (کرشن چندر) کبھی اس کی بھی کہانی لکھ دے۔ اس کے برعکس وحشی سعید کا صمد بھنگی حوصلہ مند اور دور اندیش شخص ہے۔ صمد بھنگی بڑے یقین کے ساتھ کہتا ہے......

"نہیں بابو، وہ بھنگی نہیں بنے گا، وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں اس کو خوب پڑھاؤں گا۔"

وحشی سعید کے افسانہ بھنگی کا اختتامیہ بے حد دردناک اور متاثر کن ہے:

"پھر......ایک دن......صمد کا بیٹا، لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آ گیا۔ معصوم بچے کا خون سڑک پر پھیل گیا۔ صمد بت کی طرح کھڑا رہا وہ صرف اتنا کہہ سکا "میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا۔ اس لئے خدا نے اس کو واپس بلا لیا" دوسرے دن میں نے صمد کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا...... کیونکہ......وہ......بھنگی تھا۔"

(افسانہ: بھنگی، ص:۷۴)

چونکہ وحشی سعید کے افسانے اکیسویں صدی کی پہلی دوسری دہائی میں سامنے آئے ہیں لیکن ساخت موضوعات اور بنت کے اعتبار سے ان کے (سڑک جا رہی ہے) کے

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

افسانے نے ،کئی جہتوں سے بیسویں صدی کے (احمد ندیم قاسمی، اقبال مجید، رام لعل، جوگندر پال اور نور شاہ وغیرہ) نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں سے جدلیاتی رشتہ رکھتے ہیں دوسرے لفظوں میں فنی ،فکری اور اسلوبیاتی اعتبار سے وحشی سعید کے افسانوں کی سڑک کشمیر سے شروع ہو کر برصغیر ہندو پاک کے مختلف شہروں اور گلی کوچوں تک پہنچتی ہے۔

وحشی سعید کا افسانہ ''سڑک جارہی ہے'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے وحشی سعید نے اسی کو اپنی کتاب کا سرنامہ بھی بنایا ہے۔ یہ عنوان استعاراتی ضرور ہے لیکن مذکورہ افسانہ استعاراتی نہیں بن پایا ہے حلانکہ اس افسانے کے پہلے پیراگراف میں وحشی سعید نے تمثیلی فضا قائم کی ہے۔

> ''موسی محلے میں پہلی بار پختہ تارکول کی سڑک جارہی ہے۔ بل کھاتی ہوئی اس سڑک کے کنارے ایک مکان کھڑا ہے ایک ایسا مکان جو خود بھی ایک تمثیل بن کے رہ گیا ہے۔ اب تو اس مکان نے اپنے ساتھ ایک مخصوص نام بھی لپیٹ لیا ہے، خونی بنگلہ''۔

افسانہ کے اس ابتدائی ساختے میں سریت، تجسس اور ڈرامائیت کے عناصر ہیں۔ ''خونی بنگلہ'' کے اندر سے علامتی اور استعاراتی اسلوب میں تمثیلی اور داستانی افسانہ بنا جاسکتا تھا۔ اس افسانہ میں اس کے لئے خام مواد موجود بھی ہیں مثلاً پراسرار عمارت مغل دور، انگریزوں کا اقتدار، جاگیردارانہ نظام، دوسری جنگ عظیم، بے جوڑ شادی، جنسی نا آسودگی، طوائف اور فرسودہ اخلاقیات وغیرہ۔ لیکن ان سب کے باوجود دو قدم آگے چل کر کہانی نہ تو تمثیلی رہ جاتی ہے نہ داستانی پھر بھی افسانہ کے آخر کا ایک جملہ کہانی میں افسانویت پیدا کر دیتا ہے۔ کہانی کا بوڑھا کردار ہری لال اپنی جوان بیوی نینا کی بے وفائی سے بددل ہو کر بھکاری بن جاتا ہے اور نینا اپنے ہی سوتیلے بیٹے کے

ساتھ میاں بیوی کی طرح رہنے لگتی ہے۔اور ایک دن جب اچانک بھکاری ہری لال کے سامنے برج اور نینا میاں بیوی کی طرح آتے ہیں تو حیرت اور صدمے سے ہری لال پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

''مگر جب بھکاری کی نگاہوں نے ان کو دیکھا......

''تم!''

مگر وہ آواز ابھر نہ سکی۔بوڑھے کی زندگی صلیب پر چڑھ گئی۔''

اس افسانہ ''سڑک جارہی ہے'' کی معنویت کی تہوں کو کھولنے کے لئے اسے تمثیلی یا داستانی طور پر نہیں بلکہ IRONY کے طور پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔اخلاقی نظام سے محروم ہوتی نئی تہذیب کی ''نئی سڑک'' انسان اور انسانیت کو زوال کی کن حدوں تک لے جائے گی کچھ کہا نہیں جاسکتا،لیکن یہ ''سڑک جارہی ہے''۔وحشی سعید اس کا احساس دلانا چاہتے ہیں وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' میں شامل افسانوں کے حوالے سے وحشی سعید کی افسانہ نگاری کے اور بھی کئی امتیازات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے لیکن یہاں صرف ایک اور اضافی رائے کا اظہار کر کے گفتگو کو سمیٹنا بہتر ہوگا۔فکشن کے مشہور نقاد تودوروف کے مطابق افسانہ یا ناول میں تین جہات کا ہونا ضروری ہے۔ا۔معنیاتی جہت (SEMANTIC) یعنی مواد کی جہت، ۲۔نحویاتی جہت (SYNTACTICAL) یعنی کہانی کے مختلف اجزا میں ترتیب کی جہت،۳۔لفظیاتی جہت (VERBAL) یعنی لفظوں اور ترکیبوں کے خصوصی استعمال کی جہت اور وحشی سعید کے افسانوں میں یہ تینوں جہات یکجا ہو کر ان کے افسانوں کو فنی اور جمالیاتی،لسانی اور موضوعاتی ہر اعتبار سے اہم بناتے ہیں۔



اُردو کا ایک البیلا خادم: وحشی سعید

☆ ظہیر انصاری
مدیر: ماہنامہ تحریرِ نو، ممبئی

دوستوں کا دوست، دشمنوں کا بھی دوست، حاسدوں سے پیار کرنے والا، منافقوں کو پاس بٹھانے والا، صلح وصفائی کا راستہ اختیار کرنے والا، بھرپور محبت سے ملنے والا، نہایت ہی نرم گفتگو کرنے والا، ڈاؤن ٹو ارتھ (down to earth) کوئی شخص اگر سرینگر میں مل جائے تو سمجھیے وہ شخص وحشی سعید ہوگا۔ اس سے بھی تسلی نہ ہو تو اُس شخص میں وحشی سعید کو ڈھونڈ سکتے ہیں جو اُردو کا پرچم ایک نرالے شان وشوکت سے لہرا رہا ہو، افسانے تخلیق کر رہا ہو، اُردو کی محفلیں سجا رہا ہو، میٹنگیں، نشستیں منعقد کر رہا ہو اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ حکومت کی ناک کے نیچے کر رہا ہو، اس سے بھی تشفی نہ ہوئی ہو تو اس کے ظاہری رنگ وروپ سے اس کی شناخت کر سکتے ہیں۔ گورا چٹا، کشمیری ناک، چوڑی پیشانی بلکہ پیشانی اور سر تقریباً ایک ہو گئے ہیں، سر کے بچے کھچے بال بھی جاتے رہے، سر اور دھڑ کو جوڑنے والی گردن کا نام ونشان نہیں، چہرے پر ایک نورانی چمک، آنکھوں میں بلا کی ذہانت جسے عینک بھی ٹپکنے سے روک نہیں پاتی، مخاطبت میں غضب کی خود اعتمادی اور بھاری بھرکم جسم......اب تو اُردو کے غم میں اور بھی موٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ گنجے پن کو چھپانے کے لیے کبھی کبھی انگریزی ٹوپی کا سہارا لینا معیوب نہیں سمجھتے البتہ مسلمانی ٹوپی سے پرہیز ضرور کرتے ہیں۔

مجھے بالکل یاد ہے کہ میں وحشی سعید سے پہلی مرتبہ کب ملا۔ وہ ۵ر اگست ۲۰۱۴ء کا دن تھا۔ چونکہ ابھی سال بھی نہیں ہوئے ہیں، اس لیے یہ لکھنا بھی کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے کہ پہلی بار کب ملا۔ ایسا لکھتے ہوئے مجھے باقر مہدی یاد آ گئے۔ اُنھوں نے جس کا بھی

وحشی سعید نمبر

خاکہ لکھا، یہ ضرور لکھنے اور بتانے کی کوشش کی کہ متعلقہ ادیب یا شاعر سے وہ پہلی مرتبہ کب ملے۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ آخری بار کب ملے۔ جب تحریری طور پر کوئی بات وقوع پذیر ہوتی ہے تو اس کی حیثیت دستاویزی اور تاریخی ہو جاتی ہے، اسی لیے میں نے بھی مناسب جانا کہ پہلی تاریخ ملاقات لکھ دی جائے۔

اُس روز ہوٹل شہنشاہ پیلیس کے وسیع وعریض، خوشنما اور سرسبز لان (lawn) میں ٹیبل پر آمنے سامنے کئی نامور ہستیاں جلوہ افروز تھیں۔ میں اس لیے اُنھیں جانتا تھا کہ اِس شہر کے گذشتہ سفرِ کشمیر (نومبر ۲۰۱۳ء) میں ان سے ملاقات ہوگئی تھی جن میں نور شاہ، ڈاکٹر اشرف آثاری، شیخ بشیر احمد اور دیگر اراکین اُردو اکادمی (جموں کشمیر) موجود تھے۔ مظفر ایرج صاحب سے پہلی ملاقات اُسی دن شہنشاہ پیلیس میں ہی ہوئی، البتہ ہم فون پر گفتگو کرتے تھے اور انھیں کی دعوت پر اُس پروگرام میں میرا جانا ہوا تھا ورنہ میں وحشی سعید کو جانتا تک نہیں تھا۔ ایک لحیم شحیم شخص آگے بڑھا، مجھے گلے لگانے کی کوشش کی لیکن پیٹ بیچ میں حائل ہوگیا، سینے تک میں پہنچ نہیں سکا۔ اسی بیچ مظفر ایرج نے تعارف کرایا...... یہی ہیں وحشی سعید...... کشمیر کے مایہ ناز فکشن نگار۔ شخصیت واقعتاً پُرکشش تھی، ہم آمنے سامنے بیٹھے، مختصر گفتگو ہوئی۔ زیادہ ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ ملاقات پہلی تھی۔ البتہ انھوں نے خاص طور پر ضیافت کا خیال رکھا، حالانکہ ان کے کارندے کم نہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمام لوگ بمع وحشی سعید میرے انتظار میں دوپہر کا کھانا نہیں کھائے تھے، جب کہ گھڑیال ۳ سے تجاوز کر گیا تھا۔ یہ محبت کی گویا پہلی شروعات تھی۔

اُن کے برادخورد ظہور تنویر بھی بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے اور اپنی ادبی لگاؤ اور رچاؤ کا متعدد بہترین اور نایاب اشعار سنا کر ثبوت دے رہے تھے۔ اُنھیں دور سے دیکھنے پر ایسا لگا کہ کہیں یعقوب راہی (ممبئی کے مشہور سرپھرے شاعر جن کا کام دلت

وحشی سعید نمبر

شاعری کا اُردو میں ترجمہ بھی ہے) تو نہیں بیٹھے ہیں۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ آپ یعقوب راہی سے کبھی ملے ہیں، آپ بالکل انھیں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے نہ میں جواب دیا اور کہا کہ آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ میری طرح دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی حاضر جوابی پسند آئی اور بیساختہ مادھوری دیکشت کا وہ انٹرویو یاد آ گیا جس میں انٹرویو کرنے والے نے جب مادھوری سے یہ پوچھا تھا کہ ''آپ کو کیسا لگتا ہے جب لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی مسکراہٹ مدھوبالا جیسی ہے''۔ اُس نے پلٹ کر جواب دیا تھا کہ لوگ جب یہ کہتے کہ مدھوبالا کی مسکراہٹ میری جیسی ہے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ خیر اس میں احساسِ برتری کا عنصر بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ظہور تنویر میں اِس طرح کی کوئی بات نہیں تھی۔ ظہور تنویر اور مظفر ایرج کا ذکر خیر ہوتا رہے گا جب جب وحشی سعید کا نام آئے گا کیوں کہ یہ دونوں ہی وحشی سعید کی زندگی کے جزولاینفک ہیں۔

گذشتہ اگست ۲۰۱۴ء کی تقریب جو وحشی سعید نے سجائی تھی اور ملک بھر سے خاص طور پر مدیروں کو یکجا کیا تھا اور کچھ شاعروں کو بھی بلالیا تھا۔ اگر چہ مقامی شعراء وادباء کی تعداد بھی کم نہیں تھی مگر جو سب سے اہم بات اس تقریب کی تھی وہ اس کا حسن انتظام تھا۔ تمام اخراجات خود اُٹھائے، زبان پر اُف تک نہیں۔ بیک وقت ان کی فکشن کی چار کتابوں ''خواب حقیقت''، ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جارہی ہے'' اور ''پتھر پتھر آئینہ'' کا اجراء کشمیر کی تاریخ میں کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا......اور ساتھ ہی ''نگینہ'' دو ماہی کی مکرر رسمِ رونمائی۔ وحشی سعید نے جم کر خرچ کیا، اُردو کے لیے اپنی دولت لٹائی اور وہ بھی فخریہ۔ یہ جذبہ پورے برصغیر کیا، دنیا بھر میں کسی محبّ اُردو میں نہیں۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ''وحشی سعید جیسا محبّ اُردو کوئی نہیں''۔ اگر کوئی ہے تو سامنے آجائے اور اس ریکارڈ کو توڑ کر بتلائے۔

وحشی سعید نمبر

اُردو اور اُردو ادب سے لگاؤ کے تعلق سے وحشی سعید کا خاندان بھی کم اُتاولا نہیں ہے۔ خاندان کا بزنس مشترکہ ہے۔ دو بھائی ساتھ ساتھ ہیں......ظہور تنویر اور مجید جہانگیر کی رضامندی ہر پروگرام کے لیے یکساں رہتی ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ انھیں کی یاد میں ''نگینہ'' کو اِس ترمبو فیملی نے جاری کیا ہے۔ وحشی سعید کے داماد سپریم کورٹ کے ایک نامور وکیل ہیں جب کہ بیٹی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ بھی مضامین اور فیچر لکھتی ہیں۔ سب سے اہم بات جو میں وحشی سعید کے اُس اکلوتے بیٹے کے تعلق سے جو بحرین میں رہتا ہے، بتانا چاہتا ہوں، جسے خود وحشی سعید نے میرے گوش گزار کیا اور میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وحشی سعید اپنے دوسرے کاموں کے علاوہ اِن ادبی پروگراموں کے تعلق سے بیٹے کی رائے لینا مناسب سمجھتے ہیں، آخر اتنے بڑے بزنس کا وارث تو وہی ہے کہ اِن کے اِس شوق فضول (جسے اُردو سے کمائی کرنے والوں کے بچے خاص طور پر پکارتے ہیں) سے اُسے کچھ مسئلہ تو نہیں ہے۔ آپ بھی سنئے اور سر دھنئے کہ لائق بیٹا کیا جواب دیتا ہے......ابو! میرا شوق اچھی اور قیمتی گاڑیوں (کاروں) کا ہے۔ فرض کیجیے کہ وہ گاڑیاں ۵۰-۶۰ لاکھ روپئے کی ہوتی ہیں۔ ہر برس بیس فیصدی depereciation کی وجہ سے تقریباً ۱۰-۱۲/لاکھ روپئے ان کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور ۵/برس بعد وہ بے قیمت ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میرے شوق ہیں۔ آپ کا اگر ادب ہی شوق ہے، تو مجھے کوئی مضائقہ نہیں۔ اِتنی بڑی بات اور اپنے والد کو اِس طرح ہمت و ولولہ دینے والا کوئی فرزند مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔ اگر آپ کے اِرد گرد ہو تو ضرور بتائیں۔

چند دنوں پہلے ہی وحشی سعید کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ چونکہ ''نگینہ'' کے انٹرنیشنل ادب نمبر کا اجرا عمل میں آنے والا تھا (۱۹/مئی ۲۰۱۵ء کو) اور میں چاہتا بھی تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزاروں کیونکہ دل ہی دل میں اُن

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

پرخا کہ لکھنے کا ارادہ میں نے کرلیا تھا۔ وحشی سعید کے تیور و انداز وہی تھے (پروگرام کے تعلق سے) جو گزشتہ اگست میں تھے حالانکہ سیلاب (۶-۱۶ر ستمبر۲۰۱۴ء) کی عفریت نے سب کچھ غارت کردیا تھا لیکن پتہ نہیں یہ آدمی کس مٹی کا بنا ہوا ہے اور خدا پر کس اعلیٰ درجے کا ایمان رکھتا ہے۔ چونکہ سیلاب کے کچھ دنوں بعد بھی میرا کشمیر جانا ہوا تھا، وحشی سعید کو میں نے کافی پُرسکون، پُراعتماد اور پُرجوش پایا تھا۔ سیلاب سے ہوئی بربادی کا کوئی ملال نہیں تھا اُنھیں۔ ہوٹل برباد ہو چکا تھا، گھر کے فرنیچر، فرش اور دیواریں تباہ ہو چکی تھیں، لیکن ان کا عملی جذبہ متزلزل نہیں ہوا تھا اور ادبی جوش بھی بدستور قائم تھا۔ یہ وحشی سعید کا عزم ہی تھا کہ ''سیلاب'' کے بعد بھی ''نگینہ'' کے دوسرے دور کا دوسرا شمارہ شائع کیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو سپر ڈال دیتا کہ جو تباہیاں سیلا نے پھیلائی تھیں وہ ہما شما کے بس کی بات نہیں تھی کہ اِس 'بے فیض' کام میں پھر ہاتھ ڈالتا۔ لیکن اپنے دوسرے باز آبادکاریوں کے ساتھ وحشی سعید اور ظہور تنویر نے ''نگینہ'' کی باز آبادکاری کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا اور اپنے روزمرہ کے کام میں اسے بھی شامل کیا اور اُردو ادب کو ایک بہترین انٹرنیشنل ادب نمبر (نگینہ کے دوسرے دور کا تیسرا شمارہ) فراہم کیا۔

آج ادب میں کچھ لوگ باگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ وحشی سعید اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا۔ کیا یہ سب اپنے روپئے پیسے کے بل پر کر رہا ہے، شہرت کا تو بھوکا نہیں ہے اور یہ سب کر کے یہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ ارے بھئی، افسانہ نگار ہو...... ناولٹ بھی لکھے ہو...... بس، تو کیا ہوا...... اور کیا چاہیے؟ لیکن مجھے ایک فون آیا بہار کے ایک دور دراز علاقے بگہا، مغربی چمپارن (Bagha) سے تشنہ اعجاز کا اور میری زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ میں کشمیر آیا ہوں۔ میرے آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی تشنہ صاحب، یہ ان کا قلمی نام ہے، ہیں تو وہ مولانا حفظ الرحمٰن، گویا ہوئے کہ ظہیر بھائی، وہاں سے ایک رسالہ ''نگینہ'' کے نام سے نکلتا تھا جس میں میری بھی ایک کہانی ''اغوا'' کے عنوان سے

وحشی سعید نمبر

چھپی تھی، اچھا رسالہ تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ رسالہ پھر سے نکلنا شروع ہو گیا ہے اور میں تو اُسی کے خاص نمبر (انٹرنیشنل ادب نمبر) کی رسمِ رونمائی کے موقع پر یہاں آیا ہوں۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فون پر ہی کہا کہ اُس کے مدیر کوئی ساحل ہوا کرتے تھے۔ آپ اُن سے میری بات کرائیے اور نگینہ میرے نام سے جاری کروا دیجیے۔ اُنھوں نے پوچھنے پر بتایا تھا کہ وہ کہانی غالباً ۱۹۷۲ء میں چھپی تھی۔

یہ ساحلؔ کوئی اور نہیں بلکہ وحشیؔ سعید ہی ہیں جو پہلے وحشی سعید ساحلؔ ہوا کرتے تھے یعنی پتہ یہ چلا کہ یہ وحشیؔ سعید آج کے نہیں ہیں۔ انھیں لوگ برسوں سے جانتے ہیں۔ میں اور میری نسل کے لوگ بھلے ہی نہیں جانتے ہوں انھیں اور نگینہ کو۔ میں اس بات کا اعتراف کر چکا ہوں کہ اُس پہلی ملاقات سے پہلے میں بھی وحشیؔ سعید کو نہیں جانتا تھا کہ یہ میری بے خبری تھی اور نہ ہی کسی سے سنا تھا کہ یہ اُن کی بے خبری تھی۔ تشنہؔ اعجاز جن کا ذکر میں نے کیا ہے وہ میرے رسالہ ماہنامہ تحریرِ نو کے ایک مخلص قاری ہیں۔ وحشیؔ سعید جو ہر چار چھے مہینے میں لوگوں کو اکٹھا کرتے رہتے ہیں، ان کا مقصد، ادب کا قاری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ لوگوں کو اپنے تجربے میں شامل کرنا ہوتا ہے اور یہ کم بڑی بات نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو اجراء ایک بہانہ ہوتا ہے۔ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے......

اس کی آڑ میں محبت ہے، عقیدت ہے، جذبہ ہے، ایثار ہے، قربانی ہے...... کس کے لیے......؟ اس ظالم اُردو کے لیے...... یہ اُردو جو حسینہ ہے، اس کی زلف کا جو بھی گرہ گیر ہوا ہے، اُس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وحشیؔ سعید نوجوان ہوا کرتے تھے اور عالمِ نوجوانی میں کسی کی زلف کا اسیر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اُردو کے عشق میں گرفتار یہ نوجوان اپنے بھائیوں کے ساتھ اور فیملی کے فُل سپورٹ سے جب ۱۹۶۸ء میں ''نگینہ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کرتا ہے تو اس کی دیوانگی کے قائل اُس وقت کے مشاہیر اُردو

وحشی سعید نمبر

کے علاوہ جید علمائے اردو بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے ''نگینہ'' کے ۱۹۷۴ء کے ''تخلیق نمبر'' اور دسمبر ۱۹۷۵ء کے ''ادب نمبر'' کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں نمبر مجھے کسی طرح ہاتھ لگ گئے۔ ان میں شامل اکابرین اُردو میں زیب غوری، جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، حامدی کاشمیری، بشیر بدر، عادل منصوری، پرکاش فکری، بشر نواز، عتیق اللہ، کرشن موہن، رفیق راز، مظفر ایرج، فاروق مضطر، کمار پاشی، پرتپال سنگھ بیتاب، غضنفر، جوگندر پال، شوکت حیات .....اور ڈاکٹر وزیر آغا، عبدالعزیز خالد، شوکت سبزواری، سلیم احمد، مجید امجد، زہرہ نگاہ، انتظار حسین، ناصر کاظمی، ممتاز مفتی، منیر نیازی، قتیل شفائی، غلام عباس، ابن انشاء، احمد فراز، قمر احسن، ایاز رسول، صلاح الدین پرویز، شبنم قیوم، صادق، حکیم منظور، محمد زماں آزردہ، عشرت قادری اور وحشی سعید ساحل ہیں۔ اِن کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی، کرامت علی کرامتؔ، بلراج کومل، شفق، غلام نبی خیالؔ وغیرہ کے خطوط نہ صرف اہمیت کے حامل ہیں بلکہ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اِن میں بیشتر لوگ ''جید'' نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب یہ وہ لوگ ہیں جن سے اُردو کی تاریخ یعنی تاریخ ادب اردو متعین ہوتی ہے۔

تقریباً ۴۰ ربرس پہلے نگینہ کے ان دونوں شماروں میں وحشی سعید ساحلؔ کے دو ناولٹ ''ایک موسم کا خط'' اور ''پتھر پتھر آئینہ'' بتدریج شائع ہوئے ہیں اور ایک شمارہ میں ایک افسانہ ''کہانی کا آسیب'' بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے دیگر رسائل میں انھیں دنوں مثلاً ''شاعر'' میں ان کے استاد محترم حامدی کاشمیری کے ساتھ اور دیگر رسالوں میں بھی افسانے شائع ہوئے ہیں۔ مذکورہ ادباء وشعراء کی تخلیقات وحشی سعید کے زیرِ ادارت شائع ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ مذکورہ دونوں ناولٹ کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں چھپا ہے جس کا ذکر پہلے آیا ہے۔

اب یہ تو ثابت ہو گیا کہ وحشی سعید نئے نہیں ہیں۔ لیکن پتہ نہیں اپنے نام سے اب

وحشی سعید نمبر

ساحل کیوں ہٹا دیا ہے جب کہ جموں و کشمیر کی فکشن کی کشتی انھی کے کنارے لگی ہوئی ہے اوراب تو خیر سے نور شاہ، غلام نبی شاہد، سلیم سالک وغیرہ کے ساتھ مل کر جموں اینڈ کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ کا قیام بھی عمل میں لے آئے ہیں اور اس طرح ریاست میں فکشن کی زبردست کھیتی ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی اچھی فصل بھی کاٹ لی جاتی ہے۔ خود وحشی سعید نے اِدھر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً ''آسمان میری مٹھی میں'' اور ایک علامتی کہانی ''عجائب گھر کا طوطا''۔ اور بھی کئی کہانیاں متوقع ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وحشی سعید ایک کثیر السفر انسان ہیں۔ بیشتر ملکوں کا بارہا سفر کیا ہے اور سال میں ایک دو بار اب بھی جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے پاس کہانیوں کی کمی نہیں ہے، کہانیاں ان کے پاس آکر ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی ہیں۔

وحشی سعید ادب اور بزنس کو خلط ملط کرنا نامناسب سمجھتے ہیں۔ جب ادب کا کام کیا تو بزنس نہیں کیا اور جب بزنس کیا تو ادب کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ۳۵-۴۰ برس منظرنامے سے غائب رہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اب گدھے کے سر پر جو سینگ آیا ہے تو گدھا بھی خوش اور سینگ بھی ''نگینہ'' کی طرح چمک رہا ہے۔ اب لگتا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے اور وحشی سعید مذکورہ محاورے کو غلط ثابت کر کے ہی دم لیں گے۔ اب گدھا بھی ہوگا اور سینگ بھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم بلکہ متمم (compliment) ٹھہرائے جائیں گے۔

وحشی نام کا ان پر کوئی اثر نہیں ہے کیونکہ یہ نام ماں باپ یا بڑے بزرگوں نے نہیں رکھا ہے۔ وحشی بننے کی حتی الامکان کوشش تو انھوں نے زندگی بھر کی لیکن بری طرح ناکام رہے، چونکہ منفی چیزیں کوشش کرنے سے اپنائی نہیں جاسکتیں، یہ تو مزاج کا حصہ ہوتی ہیں بلکہ انھیں ''فطرت'' بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ لیکن وحشی، وحشی کی گونج سے یہ ہوتے بہت خوش ہیں اور

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

جب اس لفظ/ نام پر بحث مباحثہ ہوتا ہے تو ان کی باچھیں کھلنے لگتی ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح شیطان خوش ہوتا ہے۔ یہ قطعی نہ سمجھا جائے کہ میں ان کا موازنہ شیطان سے کررہا ہوں بلکہ میں تو شیطان کا موازنہ ان سے کررہا ہوں۔ جموں وکشمیر کیا، اب تو ملک بھر ہیں...... نہیں نہیں، دنیا بھر میں ان کی ادبی شیطنت کے چرچے ہورہے ہیں اور کوئی خطۂ اُردو بچا نہیں ہے جو ان کی اس حرکت سے محفوظ رہ سکے۔

''شیطان کے بعد دوسری شہرت ملی مجھے'' (باقر مہدی) ☆

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روز مرہ کی مخاطبت میں کوئی انھیں وحشی صاحب نہیں کہتا۔ سبھی سعید صاحب ہی کہتے ہیں خواہ وہ ملنے جلنے والے ہوں، دوست احباب ہوں، ہوٹل کے اسٹاف ہوں یا کوئی اور۔ اپنے تو خیر کہہ ہی نہیں سکتے۔ کسی پروگرام کے موقع پر ہی وحشی سعید، وحشی سعید کا رٹ لگتا ہے یا ان کے افسانوں یا کسی تحریر کے آگے۔ میں ان کے تعلق سے منعقدہ دو پروگراموں میں شریک ہوا ہوں۔ دونوں میں ہی لوگوں نے جو ڈائس پر موجود تھے، بار بار یہی کہا کہ پتہ نہیں یہ وحشی کیوں لکھتے ہیں جبکہ ان میں وحشت والی بات کچھ نظر نہیں آتی اور نہ ہی ان سے کوئی خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس بات پر یہ فقط تبسم کرتے ہیں۔ ایک لفظ بھی کبھی کچھ نہیں کہتے۔ مقررین اپنے گھر یہ اپنے گھر۔ لیکن میں نے جو محسوس کیا ہے اِس ''وحشی'' کے پیچھے ہی پوری داستان نہاں ہے۔ یہ تخلیقات اسی کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ دل کی آواز ہیں، کراہ ہیں، یہ جتنے معاملات ہیں اسی وحشی کا نتیجہ ہیں۔ یہ خاموشی، بردباری، سنجیدگی، متانت، ٹھہراؤ، پھیلاؤ، رچاؤ ان کی جو صفات حمیدہ ہیں اسی وحشی کی دین ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ گزشتہ ۵۰ ربرسوں سے اس لاحقہ کو چھوڑ نہیں رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ''لفظ'' ان کے لیے قسمت والا (lucky) ہے اور کسی قیمت پر یہ اسے تجنے کو تیار نہیں۔ کوئی چاہے تو قیمت لگا کر دیکھ لے۔ اسی لیے اُردو ادب میں صرف اور صرف ایک ہی

خواب حقیقت

☆ شان بھارتی

ہر دور میں ادب کی معنویت، علامت، نئی تعبیرات اور اس کی Adoptability نئی صورتیں اختیار کرتی رہتی ہیں اور عہد حاضر کی صداقت و بناوٹ سے متاثر ہو کر اسے نیا رنگ وروپ عطا کرتی ہے۔

وحشی سعید کے افسانے بھی علامتی انداز میں عہد حاضر کے حالات و حادثات و موضوعات سے متاثر ہیں۔ جگ ظاہر کہ ان کے افسانے علامتی نوعیت کے ہیں۔ علامتی روایت سے تعلق رکھنے کے باوجود ہمیں بہت متاثر کرتے ہیں۔ سچی بات اگر کہی جائے تو ان کے افسانوں میں مستقبل کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ لمبا آدمی چھوٹا قد، خواب حقیقت، قربان گاہ، وقت اور رنگ، سگریٹ، یہ دوڑ، سرخ چادر، آشوب آگہی اور جداجدا رستے ایسے علامتی افسانے ہیں جو خصوصیت سے لائق ستائش ہیں۔

تاریخی واقعات کے پس منظر میں لکھے گئے وحشی کے افسانے اردو ادب کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں جن کی قدر و منزلت ہونی چاہیے۔ منشی پریم چند، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی اور الیاس احمد گدی کے افسانوں کا علامتی روایت سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا لیکن انور سجاد، سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی، بلراج مینرا اور بلراج کومل کے افسانوں کی طرح وحشی سعید کے علامتی افسانے مذکورہ افسانہ نگاروں کے علامتی افسانوں کی جدید ترین کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرتے جائیے، دورانِ مطالعہ آپ کا ذوق تجسس باقی رہتا ہے۔ ''خواب حقیقت'' کے افسانے مثبت علامتی روایت کو عہد حاضر میں از سرنو دہرا رہے ہیں۔

اردو میں افسانوی ادب کے دوسرے دور سے اردو فکشن میں ایک علامتی روایت و شباہت بھی رہی ہے۔ ناول اور ناولٹ میں علامت کی چھاپ برائے نام رہی لیکن

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

افسانے بالخصوص مختصر افسانے اس روایت کے بہترین شارح اور نمائندہ ترجمان ثابت ہوئے۔ ''کب آئے گا سقراط''، ''میرا قاتل میرا مسیحا''، ''اپنا عکس اپنا آئینہ''، ''میٹھا چشمہ اور بیل''، ''وہ صبح کب آئے گی؟''، ''طوفان''، ''گھر سے کالج تک''، ''تقدیر''، ''آغوش''، ''نامکمل تصویریں'' اور ''پردہ'' وحشی سعید کے ایسے افسانے ہیں جو علامتی روایت کے مستحکم ترجمان ہیں، حیرت و استعجاب کی ان دیکھی راہوں پر گامزن کرتے ہیں۔ ''گھاس کا تنکا'' اور ''یہ دوڑ'' افسانوں میں پوشیدہ حقائق اپنی پوری اصلیت کے ساتھ نظر آئیں گے۔ یہ افسانے اپنا ایک منفرد علامتی نظام رکھتے ہیں اور مقام حیرت و تجسس تک پہنچاتے ہیں۔

''کب آئے گا وہ سقراط'' ایک کامیاب علامتی افسانہ ہے جو تاریخی واقعات کے پس منظر کو ظاہر کرتا ہے۔ چانکیہ ماضی کا KingMaker ہے اور شیخ چلی عہد حاضر کا سلطان بنا بیٹھا ہے۔ جھوٹ، فریب اور فرضی وکاس کے اتنے اچھے دن آ گئے ہیں کہ مردان خواتین کے لبادے پہن کر رقص کرنے لگے ہیں۔ شیخ چلی مسخرہ ہے وہ ایسا سادہ لوح بندہ ہے جس کا استعمال کر کے کسی وَستو کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ جیسے آج اسرائیل امریکہ کا زرخرید غلام ہے اور اسے زبردستی فلسطین پہ تھوپ دیا گیا ہے۔ کابل پہ ان ڈائریکٹ امریکہ کی سربراہی ہے۔ چانکیہ کی پالیسی ہے کہ غلام کو اقتدار ملک سونپ دو، وہ غلام شہنشاہی کے بوجھ تلے دب جائے گا۔ وحشی سعید کے افسانے بیاں کرتے ہیں کہ افسانہ نگار کی نگاہیں کہیں ہیں اور نشانہ کہیں اور لگا رہے ہیں۔ اس نئے دور میں وہ علامتی روایت کے قابلِ تعریف ترجمان ہیں۔ ان کے افسانوں میں ملکی غیر ملکی اور قومی حالات کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ ان کے بعض دلچسپ افسانے ایسے ہیں جس میں منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ اصل بات کچھ ہے اور وحشی کا اسلوب کچھ اور بیان کر رہا ہے۔

''تحریک ادب'' وارانسی کے زیر اہتمام زیر نظر افسانوی مجموعے کی اشاعت ہوئی ہے۔ خوبصورت طباعت مہاویر پریس وارانسی کی ہے۔ کاغذ عمدہ اور گٹ اپ جاذبِ نظر ہے۔ صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے اس کتاب کی انفرادیت ہے۔ ☆☆☆

جس کو وحشی سعید کہتے ہیں

☆ ڈاکٹر اشرف آثاری

ریاست جموں وکشمیر کی اردو افسانوی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو دور حاضر میں نورشاہ، عبدالغنی شیخ لداخی، عمر مجید، آنندلہر، خالد حسین اور کچھ اور نام ہیں جنھیں اردو کی پوری افسانوی دنیا قدر کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور ان کی افسانوی صلاحیت کا اعتراف کرتی ہے۔ وحشی سعید جنھوں نے بہت کم عمر میں یعنی ۶۰ر اور ۷۰ر کی دہائی کے درمیان افسانوں اور ناولوں کو لکھ کر اہل ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی، کچھ عرصہ ادب کی خدمت کرنے کے بعد کاروباری مصروفیات کے سبب نشرو اشاعت کے مراحل سے دور ہو گئے۔ لیکن یہ معاملہ بقول شاعر اس قسم کا نہ تھا کہ ۔

دنیا نے تری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

کاروباری مصروفیات کے باوجود وہ ادب کی دنیا سے بیگانہ نہیں رہے اور ان کا تخلیقی عمل جاری رہا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ محض ۳ر سال کے قلیل عرصہ میں ان کے افسانوں کے مجموعے اور ناول منظر عام پر آ کر داد و تحسین وصول کر رہے ہیں۔ ان افسانوی مجموعوں میں کئی پرانے افسانے بھی ہیں جو انھوں نے ۲۱-۲۰ سال کی عمر میں لکھے تھے۔ ان کو پڑھ کر ان کی اس وقت کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

ابھی حال ہی میں وحشی سعید کے جو چند افسانے منظر عام پر آئے ہیں انھوں نے اہل ادب کو اس غور وفکر پر مجبور کر دیا ہے کہ عہد حاضر میں ریاست جموں وکشمیر کا سب سے بڑا فکشن نگار کون ہے؟...... اس بات پر بحث ہو سکتی ہے کہ جموں وکشمیر میں کسی ایک فکشن نگار کو سب پر اولیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ کئی ایک کی اپنی اپنی منفرد شناخت

ہے اور اپنے اپنے میدان کے ماہر سب ہیں۔ لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو فکشن کے تمام میدانوں میں اپنی منفرد شناخت رکھنے کے ساتھ ساتھ وحشی سعید علامتی طرز بیان میں جو دسترس رکھتے ہیں اس میں ریاست جموں وکشمیر میں ان کے قد کا کوئی نظر نہیں آتا۔

وحشی سعید کا پورا نام محمد سعید ترمبو ہے۔ ابتدا میں وہ شاعری بھی کرتے تھے اور تخلص وحشی اختیار کیا تھا۔ اس وقت یہ ''وحشی سعید ساحل'' کے نام سے لکھا کرتے تھے لیکن اب ''وحشی سعید'' کے نام سے ہی اردو ادبی دنیا میں ان کی شناخت مستحکم ہو چکی ہے۔ وحشی سعید کے آبا و اجداد کا سلسلہ مرحوم حاجی عظیم الدین ترمبو سے جا کر ملتا ہے جو افغانستان کے بدخشاں صوبے سے ہجرت کر کے غالباً پٹھانوں کے دور میں کشمیر آئے تھے۔ پیشے سے تاجر تھے۔ ان کا شال و دوشالہ کا بڑا کاروبار تھا۔ انھیں کی آل سے وحشی سعید کے دادا مرحوم محمد رمضان ترمبو کشمیر کے نامی گرامی تاجر تھے۔ وہ اپنے سسرال والوں کے اشتراک سے تانبے کے برتنوں جس کو کہ ٹھانٹھر کہتے تھے، کی تجارت کرتے تھے اور اس مناسبت سے ان کا ایک لقب ٹھانٹھر بھی پڑ گیا تھا۔ ان کے ایک بھائی خضر محمد ترمبو کشمیری زیوارت کی تجارت کرتے تھے۔ اور انھوں نے اپنے بیٹے محمد عبداللہ ترمبو جو کہ وحشی سعید کے والد صاحب تھے، کو اس کاروبار میں شامل کیا۔ باصلاحیت باپ کے صلاحیت مند فرزند نے کاروبار کو اپنے خون پسینے کی محنت سے وسعت دی اور کشمیری زیورات کے علاوہ قیمتی پتھروں کی تجارت بھی شروع کی اور اس میں بھی نام پیدا کیا۔ وحشی سعید کے دادا حاجی محمد رمضان اپنے دور کی اتنی قد آور شخصیت تھے کہ وہ ڈوگرا مہاراج کے یہاں آکشن میں شریک ہوتے تھے۔ آکشن کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال ڈوگرا مہاراجہ اپنے یہاں کی پرانی چیزوں کی نیلامی کرتے تھے۔ اس نیلامی کو خریدنے کے لیے ریاست کے چار پانچ بڑے تاجر ہی شرکت کر سکتے تھے جن کی حیثیت اس نیلامی کے خریدنے کی ہوتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ جو پچھلے سال نیلامی میں شریک ہو کر نیلامی خریدنے میں

کامیاب ہوتا تھا، اسے ہی دوسرے سال نیلامی میں شرکت کی اجازت ملتی تھی۔ وحشی سعید کے دادا مرحوم حاجی محمد رمضان ترمبو ہر سال اس نیلامی میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے فرزند ارجمند محمد عبداللہ ترمبو نے اپنے والد کے نام سے ایک فرم ''ایم.اے. رمضانا'' قائم کی جس کے شوروم کشمیر کے شیخ کدل میں، کولکاتا میں کشمیر اسٹورز اور دہلی میں کشمیر پیلس کے نام سے کھولے گئے۔ کشمیر کی ''ایم.اے. رمضانا'' یونٹ نے کافی ترقی۔ مرحوم محمد عبداللہ ترمبو نے راولپنڈی، لاہور اور پنجاب وغیرہ کا سفر بھی کاروباری سلسلے میں کیا۔ کشمیری زیورات کے کاروبار کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنا قیمتی پتھروں کا جو ذاتی کاروبار شروع کیا تھا، اسی کو اولیت دی اور اس کو اپنا مستقل کاروبار بنایا۔ انھوں نے معاش کے دوسرے ذرائع پر بھی توجہ دی اور اور ہوٹل انڈسٹری میں بھی اپنے پاؤں پھیلائے جس کو بعد میں ان کے تینوں فرزند ارجمند محمد سعید ترمبو (وحشی سعید)، ظہور ترمبو اور عبدالمجید ترمبو نے اپنی دن رات کی محنت سے بلندیوں پر پہنچایا۔

وحشی سعید کو کوئی بہن نہیں ہے۔ تین بھائیوں میں سب سے بڑے وحشی سعید ہی ہیں، اس کے بعد ظہور ترمبو جو کہ ان کے ساتھ والد کے کاروبار میں حصہ دار ہیں اور خود کا بھی بڑا کاروبار ہے۔ چھوٹے بھائی عبدالمجید ترمبو لندن میں رہتے ہیں۔ وحشی سعید کی تعلیم و تربیت اور ادبی نشو و نما میں ان کی والدۂ محترمہ سارہ ترمبو کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ وحشی سعید جب سرینگر کے مشہور تعلیمی ادارے بسکو کالج میں میٹرک میں پڑھ رہے تھے، ان کا ادبی سفر شروع ہو گیا تھا۔ مطالعے کا شوق انھیں بچپن سے ہی تھا۔ یہاں ان کے ادبی ذوق کی آبیاری میں ان کے استاد مست لعل راز دان کا کردار بہت اہم رہا۔ بسکو کالج سے میٹرک پاس کرنے کے بعد انھوں نے یہاں کے معروف کالج ایس. پی کالج میں بی.اے. میں داخلہ لیا۔ اس دوران انھوں نے ''تاش کے باون پتے'' کے عنوان سے کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو اس وقت کے مؤقر اخبار روزنامہ آفتاب کے ہر ہفتہ وار ایڈیشن میں باقاعدگی سے پورے ایک سال تک شائع ہوتی

رہیں۔ کالج کے مجلّے میں بھی ان کی تخلیقات متواتر شائع ہوتی تھیں اور وہ کالج کے مجلّے کے مدیر بھی رہے۔ اسی دوران وہ ریڈیو کشمیر کے اردو ادبی پروگراموں میں افسانے بھی پڑھتے تھے۔ ریڈیو کے کسی بھی اہم ادبی پروگرام میں ان کو بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا۔ وحشی سعید کی ادب دوستی کا اثر ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں پر بھی پڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے گھر پر روز ادبی محفلیں سجنے لگیں۔ پچاسوں کپ چائے روز کا صرفہ تھا جس کا سارا خرچ ان کی والدۂ محترمہ اٹھاتی تھیں اور اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر ان کو دعائیں دیتیں۔ اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے کی غرض سے وحشی سعید نے کشمیر یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے ادبی ذوق کو مزید پرواز عطا ہوئی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور پروفیسر حامدی کاشمیری کی رہنمائی میں وحشی سعید کی اردو زبان و ادب پر گرفت مضبوط ہوتی گئی اور ان کا فن دن بہ دن نکھرتا گیا۔ اس وقت ادبی جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک دن میں کئی کئی افسانے تحریر کر لیتے تھے۔ ایسا اس لیے بھی ممکن تھا کہ ان کے بہت سے معیاری افسانے ۲-۳ صفحات پر مشتمل ہیں۔

۱۹۶۸ء میں وحشی سعید، ظہور ترمبو اور عبدالمجید ترمبو تینوں برادران نے ادبی رسالہ ''نگینہ'' جاری کیا۔ اس میں وحشی سعید کے ہمدم دیرینہ معروف شاعر مظفر ایرج بھی شامل ہو گئے اور ان تمام کی کاوشوں سے ''نگینہ'' وادئ کشمیر اور اردو ادب کا ایک اہم مجلّہ قرار پایا۔ اس کی اشاعت کے اخراجات حسب معمول ترمبو برادران اور ان کی والدۂ محترمہ سارہ ترمبو برداشت کرتی تھیں۔

۱۹۷۰ء میں بمبئی سے شائع ہونے والے معیاری رسالہ ماہنامہ ''شاعر'' میں وحشی سعید کا افسانہ شائع ہوا۔ اس کے بعد بحیثیت افسانہ نگار وادی سے باہر بھی ان کا نام اہل ادب کی توجہ کا مرکز بنا۔ متعدد رسائل و جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے اور داد و تحسین وصول کرتے رہے۔

وحشی سعید کا نکاح ۱۸ر جولائی ۱۹۶۸ء کو ان کے سگے چاچا کی بیٹی محترمہ سلیمہ ترمبو

وحشی سعید نمبر

کے ساتھ ہوا۔ ان کے دو بچے ہوئے جن میں ایک بیٹی صبیحہ ترمبو اور ایک بیٹا اشتیاق احمد ترمبو ہیں۔ اشتیاق احمد ترمبو کی بھی دو بیٹیاں سارہ اور سہا ہیں۔

وحشی سعید کی شادی کے بعد ہی ان کے والد نے اپنے تینوں بیٹوں کو کاروبار میں شامل کرلیا، جن سے ان کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ وحشی سعید کاروبار کے سلسلے میں امریکہ، برطانیہ، کناڈا سمیت کئی خلیجی ممالک کا متواتر سفر کرتے رہے۔ ظہور ترمبو بھی والد کے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ چھوٹے بھائی عبدالمجید ترمبو جو کہ معروف شاعر رفیق راز کے گہرے دوستوں میں تھے اور بقول ان کے ان دونوں بھائیوں سے بھی زیادہ خوبصورت تھے، لندن گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھیں دنوں ملازمت کے سلسلے میں مظفر ایرج کا تبادلہ بھی جموں ہو گیا اور اس طرح نگینہ کی اشاعت التوا میں پڑ گئی اور وحشی سعید کی ادبی سرگرمیاں بھی۔

۵رجنوری ۱۹۹۳ء کو ان کی شفیق والدۂ محترمہ سارہ ترمبو کا انتقال ہو گیا، (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ ان کے والد اور پورے گھر کے لیے یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ اس وقت اہل خانہ نے اپنے والد کو سنبھالا اور آگے کے ۱۴رسالوں یعنی ان کے انتقال تک ان کی ہر طرح خدمت کرتے رہے۔ انھیں اپنے والدین کی دعا لگی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ترمبو خاندان پھل پھول رہا ہے۔

۱۷رفروری ۲۰۰۷ء کو ان کے والد محمد عبداللہ ترمبو بھی مالک حقیقی سے جا ملے، (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ اس کے بعد سب سے بڑا ہونے کے سبب گھر کو متحد رکھنے کی ذمہ داری وحشی سعید کے سر آ گئی۔

اب وحشی سعید نے از سر نو نگینہ کی اشاعت شروع کی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی ظہور ترمبو اس کے مینیجنگ ایڈیٹر بنائے گئے ہیں۔ مظفر ایرج بھی ملازمت سے سبکدوش ہو کر دوبارہ ''نگینہ'' سے جڑ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ نور شاہ، ڈاکٹر اشرف

آثاری اور دیگر کئی اہم نام ہیں جو نگینہ سے جڑ کر اس کے وقار میں اضافہ کر رہے ہیں۔
وحشی سعید کو جموں و کشمیر اردو فکشن رائٹرس گلڈ کا صدر بھی منتخب کیا گیا ہے۔
وحشی سعید کے اب تک جو افسانوی مجموعے اور ناول منظر عام پر آئے ہیں ان کی فہرست ذیل میں درج ہے:

۱۔ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' (افسانوی مجموعہ) اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں
۲۔ ''خواب حقیقت'' (افسانوی مجموعہ) اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں
۳۔ ''سڑک جا رہی ہے'' (افسانوی مجموعہ) اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں
۴۔ ''پتھر پتھر آئینہ'' (ناول) اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اگست ۲۰۱۴ء میں ترمبو برادران نے اپنی والدۂ مرحومہ سارہ ترمبو اور والد مرحوم محمد عبداللہ ترمبو کی یاد میں یک روزہ سیمینار اور کل ہند مشاعرہ کی دو شاندار تقریب منعقد کی تھیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ ہر سال اپنے والدین مرحومین کی یاد میں اس قسم کی تقریب کا اہتمام کرتے رہیں گے۔

وحشی سعید کے فن پر کئی معتبر ادبی جرائد نے خصوصی گوشے شائع کیے ہیں۔ ''تحریک ادب'' وارانسی نے تو اپنے ہر شمارے کے چند اوراق ان کے لیے مخصوص کر لیے ہیں۔ ان کے علاوہ ابجد، تفہیم میں ان کے گوشے شائع ہوئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں بدایوں سے نکلنے والے ادبی جریدہ ''لمحے لمحے'' نے ۴۰۰ر سے بھی زائد صفحات پر مشتمل ان کے فن پر نمبر شائع ہو رہا ہے۔ وحشی سعید کے فن پر مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ رشید امجد، سرور عثمانی، نور شاہ، اصغر ویلوری، مظفر ایرج، سیفی سرونجی، قسیم اختر، ڈاکٹر مجیب شہزر، عرفان عارف، ڈاکٹر مشتاق وانی، رئیس الدین رئیس، نٹ کھٹ عظیم آبادی، عالم بنارسی اور جاوید انور کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے ان کے فن پر اظہار خیال کیا ہے۔ جاوید انور وحشی سعید کے فن اور شخصیت پر کتاب بھی ترتیب دے رہے

ہیں جو انشاء اللہ جلد ہی منظرِ عام پر آئے گی۔ اس کے علاوہ بھوپال کی برکت اللہ یونیورسٹی میں وحشی سعید کے فن اور شخصیت پر پی ایچ .ڈی بھی ہو رہی ہے۔



نگینہ کے عالمی ادب نمبر کی رسمِ اجرا

وادیٔ کشمیر کے فرزند وحشی سعید جو اپنی تخلیقی کاوشوں اور ادبی سرگرمیوں کے طفیل ریاست اور ریاست سے باہر کافی نامدار ہیں، کی نگرانی میں دو ماہی میگزین ''نگینہ'' کے انٹرنیشنل ادب نمبر کی رسم رونمائی پر کل بلیووارڈ پر واقع معروف ہوٹل شہنشاہ کے سبزہ زر شامیانے میں ایک محفلِ سخن اور مجلس مذکرہ منعقد ہوئی۔ اس نشست پر کشمیری اور اردو ادب کے معروف ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری کی عزت افزائی کی گئی۔ وحشی سعید کی جانب سے مسٹر ظہور تنویر نے حامدی صاحب کے تئیں عقیدت سے بھرے ایک سپاس نامہ کو انتہائی دلکش انداز اور خوبصورت پیرائے میں پیش کیا۔ جواب میں حامدی صاحب نے وحشی سعید کو ادب کے تئیں ان کی محبت اور فنکاروں کے ساتھ قربت پر اظہار مسرت کیا اور امید ظاہر کی کہ ادب کی خدمت اور ادب نوازوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا ان کا جذبہ سدا برقرار رہے گا۔ اس موقعہ پر سابق چیف جسٹس مسٹر بشیر احمد کرمانی نے مجلس کے اختتام پر حاضرین کو اپنی پرکشش آواز اور دلچسپ اندازِ بیان سے کافی مسرور اور متاثر کیا۔ انھوں نے ادب اور صحافت پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے محفل کو لوٹ لیا۔ مہمانِ خصوصی غلام نبی خیال نے اُردو زبان کے تئیں سرکاری سطح پر ظلم وستم کی کارروائیوں پر شدید غم وغصہ کا اظہار کیا اور کہا کہ دورِ حاضر میں نہ صرف اُردو کو ختم کرنے کی دانستہ کوششیں ہو رہی ہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچائی جا رہی ہیں۔ محفل میں صحافی غلام حسن اور بے شمار ادیبوں شاعروں اور دانشوروں نے شمولیت کی۔ محفل میں مشاعرہ میں جنھوں نے کلام سنایا ان میں رفیق راز، شبیب رضوی، ایاز رسول نازکی، نگہت نظر، ہمدم کشمیری، رخسانہ جبین شامل ہیں۔ سلیم سالک نے ایک مکالمہ پڑھا اور ممبئی سے آئے ہوئے مہمان ظہیر انصاری ایڈیٹر ''تحریرِ نو'' نے بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ محفل میں نور شاہ کی کتاب کا بھی اجرا کیا گیا۔

☆ سرینگر ٹائمس (۲۰ رمئی ۲۰۱۵ء)

وحشی سعید اور اردو علامتی افسانہ

☆ ڈاکٹر اشرف آثاری
صدرہ بل حضرت بل سری نگر (کشمیر)

''وحشی سعید کے افسانوی مجموعے کے مطالعے پر' نظر پر میرا قلم رک گیا۔ یہ مجموعی ان کے بقیہ مجموعوں سے بالکل الگ نوعیت کا ہے یہ غیر روایتی افسانوی تکنیک، ہیت نگاری ،لفظ شناسی ،فنی برتاؤ، کردار نگاری، معنی آفرینی اور جدت طرازی کی تابندہ مثال ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ افسانے زبان و بیان کے مشہور تخلیقی سرچشموں کو جگانے اور حیرت ونشاط سے ہمکنار کرنے کی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں جو تخلیقیت کے اسرار ورموز سے قاری کو حقیقت سے الگ کرکے' فن کی طلسمی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ظاہری طور پر یہ مقصدیت یا خارجی حقیقت سے منحرف نظر آتے ہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ افسانے اپنے خالق کے نظریاتی موقف ،سماجی نشیب و فراز، حسن وعشق، جنس ورومان، سیاسی چنگیزیت ،فرد کی گمشدگی، خوابوں کی شکست ،محرومی اور آزردگی کے رمز وایما کے امین ہیں۔''
(پروفیسر حامدی کاشمیری)

وحشی سعید کے تازہ افسانوی مجموعے پر، پروفیسر حامدی کاشمیری کے اوپر مذکورہ تاثرات وآراء واقعی ایک بہت بڑی سند اور اعزاز وافتخار سے کم نہیں ہیں۔ یہاں ضمناً یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ پروفیسر حامدی صاحب کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آس پڑوس میں رہنے والے اردو زبان وادب کے قلمکاروں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر لکھا ہے۔اس بات کو ایک طرف رکھ کر اگر پروفیسر حامدی کاشمیری جیسے نابغہ روزگار استاذ قد آور اردو شاعر، افسانہ نگار،

ہیں جو انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آئے گی۔ اس کے علاوہ بھوپال کی برکت اللہ یونیورسٹی میں وحشی سعید کے فن اور شخصیت پر پی ایچ ڈی بھی ہو رہی ہے۔



نگینہ کے عالمی ادب نمبر کی رسمِ اجرا

وادی کشمیر کے فرزند وحشی سعید جو اپنی تخلیقی کاوشوں اور ادبی سرگرمیوں کے طفیل ریاست اور ریاست سے باہر کافی نامدار ہیں، کی نگرانی میں دو ماہی میگزین "نگینہ" کے انٹرنیشنل ادب نمبر کی رسم رونمائی پر کل بلیووارڈ پر واقع معروف ہوٹل شہنشاہ کے سبزہ زر شامیانے میں ایک محفل سخن اور مجلس مذکرہ منعقد ہوئی۔ اس نشست پر کشمیری اور اردو ادب کے معروف ادیب، شاعر اور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری کی عزت افزائی کی گئی۔ وحشی سعید کی جانب سے مسٹر ظہور تنویر نے حامدی صاحب کے تئیں عقیدت سے بھرے ایک سپاس نامہ کو انتہائی دلکش انداز اور خوبصورت پیرائے میں پیش کیا۔ جواب میں حامدی صاحب نے وحشی سعید کو ادب کے تئیں ان کی محبت اور فنکاروں کے ساتھ قربت پر اظہار مسرت کیا اور امید ظاہر کی کہ ادب کی خدمت اور ادب نوازوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا ان کا جذبہ سدا برقرار رہے گا۔ اس موقعہ پر سابق چیف جسٹس مسٹر بشیر احمد کرمانی نے مجلس کے اختتام پر حاضرین کو اپنی پرکشش آواز اور دلچسپ اندازِ بیان سے کافی مسرور اور متاثر کیا۔ انھوں نے ادب اور صحافت پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے محفل کو لوٹ لیا۔ مہمانِ خصوصی غلام نبی خیالؔ نے اُردو زبان کے تئیں سرکاری سطح پر ظلم و ستم کی کاروائیوں پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا اور کہا کہ دورِ حاضر میں نہ صرف اُردو کو ختم کرنے کی دانستہ کوششیں ہو رہی ہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچائی جا رہی ہیں۔ محفل میں صحافی غلام حسن اور بے شمار ادیبوں شاعروں اور دانشوروں نے شمولیت کی۔ محفل میں مشاعرہ میں جنھوں نے کلام سنایا ان میں رفیق راز، شبیب رضوی، ایاز رسول نازکی، نگہت نظر، ہمدم کشمیری، رخسانہ جبین شامل ہیں۔ سلیم سالک نے ایک مکالمہ پڑھا اور ممبئی سے آئے ہوئے مہمان ظہیر انصاری ایڈیٹر "تحریر نو" نے بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ محفل میں نور شاہ کی کتاب کا بھی اجرا کیا گیا۔

☆ سرینگر ٹائمس (۲۰ رمئی ۲۰۱۵ء)

وحشی سعید اور اردو علامتی افسانہ

☆ ڈاکٹر اشرف آثاری
صدرہ بل حضرت بل سری نگر (کشمیر)

''وحشی سعید کے افسانوی مجموعے کے مطالعے پر' نظر پر میرا قلم رک گیا۔ یہ مجموعی ان کے بقیہ مجموعوں سے بالکل الگ نوعیت کا ہے یہ غیر روایتی افسانوی تکنیک، ہیت نگاری، لفظ شناسی، فنی برتاؤ، کردار نگاری، معنی آفرینی اور جدت طرازی کی تابندہ مثال ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ افسانے زبان و بیان کے مشہور تخلیقی سرچشموں کو جگانے اور حیرت ونشاط سے ہمکنار کرنے کی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں جو تخلیقیت کے اسرار و رموز سے قاری کو حقیقت سے الگ کرکے' فن کی طلسمی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر یہ مقصدیت یا خارجی حقیقت سے منحرف نظر آتے ہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ افسانے اپنے خالق کے نظریاتی موقف، سماجی نشیب و فراز، حسن و عشق، جنس ورومان، سیاسی چنگیزیت، فرد کی گمشدگی، خوابوں کی شکست، محرومی اور آزردگی کے رمز وایما کے امین ہیں۔''

(پروفیسر حامدی کاشمیری)

وحشی سعید کے تازہ افسانوی مجموعے پر، پروفیسر حامدی کاشمیری کے اوپر مذکورہ تاثرات وآراء واقعی ایک بہت بڑی سند اور اعزاز وافتخار سے کم نہیں ہیں۔ یہاں ضمناً یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ پروفیسر حامدی صاحب کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آس پڑوس میں رہنے والے اردو زبان وادب کے قلمکاروں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر لکھا ہے۔ اس بات کو ایک طرف رکھ کر اگر پروفیسر حامدی کاشمیری جیسے نابغہ روزگار استاذ قد آور اردو شاعر، افسانہ نگار،

وحشی سعید نمبر

اور سب سے بڑھ کر ایک مستند و معتبر نقاد، کسی قلمکار کے متعلق اسطرح کی رائے رکھتے ہیں تو واقعی اس کی تخلیقات میں اسطرح کی خوبیاں ضرور موجود ہونگیں جنہوں نے پروفیسر حامدی صاحب کو ان پر کچھ کہنے یا لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ یہ باتیں ایک ایسا معتبر و قدآور نقاد کہہ رہا ہے جو ایک عرصہ تک یونیورسٹی میں لاتعداد طلاب و ریسرچ اسکالروں کو اردو کے عظیم افسانہ نگاروں کو پڑھاتے رہے ہیں اور پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سے لیکر انتظار حسین سے ہوتے ہوئے معاصر افسانہ نگاروں پر جن کی نہ صرف گہری نظر ہی ہے بلکہ جو خود بھی کئی افسانوی مجموعوں کے خالق بھی ہیں۔ اور اردو کے مشاہیر افسانہ نگاروں پر بہت کچھ لکھ کر نام بھی کما چکے ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وحشی سعید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ......

> ''وحشی سعید کے افسانے اپنی لسانی ساخت، فکری نظام اور فنی و جمالیاتی دروبست کے حوالے سے نہ صرف جموں و کشمیر بلکہ دوسرے ادبی مراکز میں لکھے جا رہے افسانو سے بھی مختلف ہیں۔''

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے مباحث اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ادب برائے اظہار تخلیق ہو رہا ہے اور اظہار کے طور طریقے اور پیرائے منفرد و مختلف بھی ہیں اور موثر و غیر موثر بھی۔ مبہم و سخت فہم بھی ہیں اور مقبول و غیر مقبول بھی اور علامتی بھی۔ اردو زبان میں علامت کے ہم معنی یا ملتے جلتے الفاظ جیسے تشبیہہ' استعارہ' تلمیح' تمثیل' اشارہ' نشانی' رمز و کنایہ وغیرہ ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ادب میں علامت نگاری کا آغاز تب ہوا ہے جب بذاتِ خود ادب کا آغاز ہوا ہے۔ زبان و ادب اور بیان و اسلوب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ' علامت نگاری کا بھی ارتقاء شروع ہو گیا۔ علامتی اظہارِ رائے کی جمالیات سے انکار کی گنجائش نہیں۔ افسانہ اپنے فنی اور تکنیکی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

لوازمات' اختصار' موثر اور مخصوص زبان واسلوب' بیانیہ اور پلاٹ وغیرہ کی وجہ سے کسی حد تک علامتی طرز اظہار و ترسیل کا محتاج بھی ہے۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے میں جو تبدیلی رونما ہوئی اور اس کا ڈکشن تبدیل ہو گیا ان تبدیلیوں کا باعث کچھ مغربی اثرات و تحریکات کو بھی گردانا جاتا ہے۔ ان سے اردو افسانے کو نئی جہت اور نیا موڑ مل گیا۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اس دوران بے ربطی' بکھراؤ' مقصدیت سے فرار' تجریدیت ولا یعنیت وغیرہ کے ہیتی تجربے بھی ہونے لگے اور علامتی افسانے کے نام پر ہونے لگے۔ اسطرح سے افسانے کی مروجہ اور روائتی حقیقت نگاری یکسر نظر انداز ہونے لگی۔ اور کہانی پن کے فقدان کا معاملہ شروع ہو گیا اور اس جدید افسانے کو اینٹی اسٹوری افسانہ بھی کہا جانے لگا۔ جس میں علامتی' اشاراتی اور ابہام والی تکنیک اپنائی گئی اور پھر اس کے سلسلے معروف افسانہ نگاروں' منٹو' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' اور دیگر قدآور اردو افسانہ نگاروں کے ساتھ بھی جوڑے گئے۔ لیکن اس دوران جو افسانہ نگار فرنٹ لائن پر آئے اور انہوں نے علامتی افسانے کے توسل سے نام بھی کمایا ان میں سریندر پرکاش' عابد سہیل' اقبال مجید' اقبال متین' جوگندر پال' بلراج مینرا' رتن سنگھ' شفق وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن کچھ مشہور افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو اس دور میں بھی اپنی اصل ڈگر پر قائم و دائم رہے، ہٹے نہیں ان میں عبدالصمد' سلام بن رزاق' انتظار حسین' غیاث احمد گدی' ممتاز مفتی' نور شاہ' عبدالغنی شیخ' لداخی وغیرہ شامل ہیں۔

معیاری علامتی افسانوں میں بھی عصرِ حاضر کے مسائل کو ترجیح ملی۔ جن معاملات ومسائل کے ساتھ ایک فرد نبرد آزما تھا ان کا بھرپور اظہار علامتی پیرائے میں ہوا اور موثر طریقے سے ہوا۔ وحشی سعید نے اب تک جتنے افسانے تخلیق کئے ہیں ان میں کثیر تعداد علامتی افسانوں کی ہے اور آج بھی وہ اس طرح کے افسانے تخلیق کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے اس طرح کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ افسانے

وحشی سعید نمبر

مبہم نہیں ہیں ان میں باقاعدہ علامتی افسانوں کے لوازمات کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔

''وحشی سعید کی فکشن نگاری کا ایک کمال یا یوں کہیں کہ ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ جس عہد کی بات کرتے ہیں اور جس شہر، جس گلی، جس مقام کے حالات کو صفحہ قرطاس پر ابھارتے ہیں وہ مکالمے اور منظر کشی کے اعتبار سے اتنے مستحکم ہوتے ہیں کہ قاری اسی شہر اور اسی عہد میں پہنچ جاتا ہے ان کے افسانے جہاں حیرت واستعجاب میں مبتلا کردیتے ہیں وہیں ان کے ناول بھی اپنی فکشن کی شعریات کے حوالے سے بہت اہمیت کے حامل ہیں''۔

(عالم بنارسی)

اوپر تذکرہ ہو چکا ہے کہ کئی اہم افسانہ نگاروں نے اپنی ڈگر ان دنوں بھی تبدیل نہیں کی جب علامتی افسانہ عروج پر تھا اور ہر چھوٹا اور بڑا افسانہ نگار علامتی افسانہ لکھنے اور پھر انہیں کسی معیاری رسالے میں چھاپنے کا مطمئنی ہوا کرتا تھا۔ آج جب کہ علامتی افسانے کا چلن نہیں رہا لیکن اس بات کے باوجود بھی وحشی سعید آج بھی، علامتی افسانوں کی ڈگر پر رواں دواں ہیں اور آج بھی علامئی افسانوں کی تخلیق شدومد سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے اس دوراں کئی علامتی افسانے تخلیق کئے ہیں جو مختلف رسائل وجرائد میں چھپ بھی گئے اور جنہیں ان کے غیر علامتی افسانوں کی طرح ہی پسند بھی کیا گیا۔

''وحشی سعید کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بہت موضوعات ہیں جہاں ایک طرف نیاپن اور تنوع ہے وہیں افسانے کے ٹریٹمنٹ اور زبان پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے یہی نہیں بلکہ ان کے افسانوں کے عنوانات بھی اپنے اندر افسانوں

وحشی سعید نمبر

جیسی ہی معنویت کے حامل اور معنی خیز ہیں اور قاری کو غور و فکا کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی انفرادیت اور تخلیقی ہنر مندی ہے جو انہیں دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز و منفرد بناتی ہے"۔

(سلیم انصاری، جبل پور)

وحشی سعید معاصر اردو افسانے' کے ساتھ مکمل طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ اس بات کے باوجود بھی کہ وہ ایک عرصہ تک تصنیف و تالیف' مطالعے اور چھپنے چھپانے سے لاتعلق بھی رہے اور کئی دہائیوں پر محیط ایک لمبے وقفے کے بعد انہوں نے پھر اردو افسانے کو جوئن کیا۔ کہتے ہیں کہ ہر دہائی کے بعد تخلیق ہونے والے ادب کا ٹرنڈ تبدیل ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود بھی انہوں نے پھر اسی اعتماد اور حوصلے کے ساتھ لکھنا پڑھنا دوبارہ شروع کرلیا۔ نہ ان کا زبان و بیان اور نہ ان کا انداز و اسلوب ہی متاثر ہوا ، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ موثر اور نکھر کر سامنے آ گیا۔

"وحشی سعید اردو افسانوی ادب پر اس طرح ابھرے اور اس طرح روشن ہوئے کہ جموں کشمیر کا افسانوی ادبی منظر مزید تابناک نظر آنے لگا۔ یہ بات اس لئے اپنا منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس قسم کی زبان و اسلوب کا استعمال انہوں نے اپنے افسانوں میں کیا ہے وہ خالص فکشن کا اسلوب ہے"۔

(سیفی سرونجی مدیرِ انتساب سرونج)

یہ بات بجا ہے کہ وحشی سعید کے افسانوں کے تانے بانے بننے میں جو دماغ کارفرما ہے وہ بہت زرخیز ہے اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں بود و باش اختیار کرنے والے انسانوں کے مسائل و معاملات سے آگاہ ہی نہیں، ان کے ساتھ ساتھ انہیں خود جھیل بھی رہا ہے۔ ظاہر بات ہے ان کے افسانوں میں بھی انہیں مسائل کا عکس نظر

آئے گا۔ان کا دل بہت حساس ہے کہ ذرا سا ہوا کا جھونکا بھی انہیں متاثر کر دیتا ہے۔ وقت کی ہر گردش، ان کی دھڑکن بن جاتی ہے اور ان کا قلم، ان کی دھڑکنوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔

''جہاں تک فکر و خیال کا تعلق ہے وحشی سعید کی نگارشات میں ذہنی ارتقاء کی نشاندہی کی جا سکتی ہے وہ وقت کی گردش کے ساتھ زندگی کے سوچ سمندر میں، بہت آگے نکل چکے ہیں............ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وحشی سعید کے یہاں ایک حساس دل اور تخلیقی دماغ ہے انہیں غریبوں، مزدوروں اور سماج کے کم پایہ طبقوں سے محبت ہے اور ان کی کسمپرسی کو اپنے افسانوں میں منعکس کرتے ہیں''۔

(دیپک بدکی)

اردو علامتی افسانے کو دورِ حاضر میں بھی عزیز رکھنے والے وحشی سعید اپنی ڈگر پر اطمنان کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے معیاری رسائل و جرائد کی زینت بن رہے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آرہے ہیں اور ان کے افسانوں کو نہ صرف ملک کے طول و عرض میں سراہا اور پسند کیا جارہا ہے، بلکہ اردو کی عالمی بستیوں میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے یہ بات کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔



وحشی سعید اور میں۔ بہتے دریا کو مٹھی میں بند کرنے کی سعی

☆ کرشن کمار طور

وحشی سعید کے افسانوں پر جب میں کچھ لکھنے بیٹھا تو ذہن میں سلیم احمد کا ایک فقرہ بار بار ابھرنے لگا۔ انھوں نے کہیں لکھا تھا کہ ''ہر سال ایسے مضامین کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے جس میں چبائے ہوئے نوالوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا''۔ اس تنبیہ کے بعد ایک نامعلوم سی جھجک میرے ذہن پر وارد ہوئی کہ کیوں نہ وحشی سعید کے افسانوں میں ایک ایسی جہت دریافت کی جائے جو کہ لکیر سے ہٹ کر ہو تا کہ قاری کو دوسروں کی سنی سنائی باتوں سے نجات مل سکے اور اس میں میری اور وحشی سعید دونوں کی نجات مخفی ہو۔ میرے ان نوٹس کو آپ Loud thinking بھی ایک طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرے ذہن میں اجمال کی صورت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کسی لام بند مقالے کی طور پر نہیں۔

کسی بھی مقالے کے لیے یہ نہایت ضروری ہوتا ہے کہ متن کو اقتباسات سے مزین کیا جائے تا کہ قارئین کے پیشِ نظر وہ مفروضات آئینہ کی طرح روشن ہو جائیں۔ جن نظریات کے باعث کوئی پارہ لکھا جاتا ہے یعنی کہانی معروض سے مقصود کی طرف راستہ طے کرتی ہے اور ایک صفاتی پیکر خلق ہونے پر دوسرا اصفاتی پیکر تخلیق کے دائرے میں آجاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کہانی نگار قاری کے ذہن کو اس حقیقت کی طرف منقلب کرنے میں کامیاب رہتا ہے جو کہ لمس سے عیاں ہے اور پیکری صفت سے مقصود کشکول، آتش بیاں، آشوب آگہی، قرباں گاہ کچھ ایسی ہی کہانیاں ہیں، جن میں یہ صفت اصولی چشت اور نبوت کی طرح روشن پذیر ہوئی ہے۔ ان کہانیوں کے ٹکڑوں کو میں نے جان بوجھ کر یہاں پیش نہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ

وحشی سعید نمبر

طوالت کا خوف تھا۔

اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ افسانوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ ایک دروازہ کو توڑتے ہیں تو دوسرا دروازہ محبس خانہ کی مانند موجود رہتا ہے۔ بعض دفعہ ایک بنیادی مسئلہ حل ہوتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ آن کھڑا ہوتا ہے جس کی طرف رجوع تعبیر و تشریح کا جواز بن جاتا ہے۔ وحشی سعید کے افسانوں میں اضافی معانی کچھ اس طرح سے وجود آشکار ہوتے ہیں کہ آدمی خود کو اس جہت کا، اس مرکز کا ایک حصہ گردانے لگتا ہے، کیوں نہ اچھی بات کو ان کے افسانہ کے ایک ٹکڑے سے محیط بیان کریں کہ وجود آشکاری اپنے آپ میں ایک ممکن و محسن دلیل ہے...... ''وہ اپنی انا کے سامنے اپنے مزاج کی خودسری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ کشمکش اس کی ذات کے لیے بڑی تلخ اور تکلیف دہ تھی۔ اب وقت کے ساتھ یہ احساس بھی حاوی ہونے لگا تھا کہ اپنے سرمایۂ حیات، سب سے حسین بت وہ خود مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اسی لمحے اس نے دل کو نیزہ کی نوک پر محسوس کیا، وہ ٹوٹتا رہا۔ آہستہ آہستہ خودسپردگی کا عنصر اس پر قابو پانے لگا۔ وہ جب اپنے بت کو چھونے لگا تو بت نے کہا تم کون ہو؟ میں یوسف، اس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا۔ تم یوسف نہیں ہو اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا''۔ اقتباس کا یہ پورا ٹکڑا ایک رومانی جذب اور فکر لیے ہوئے ہے اور انسان کو اپنے اندرونی مگر اہم بنیادی تجربہ سے روشناس کراتا ہے۔ اس حقیقت کے سامنے تمام ظاہری کلیشے فرسودہ نظر آتے ہیں۔

ادبی اصطلاح میں اعتراف ایک ایسی روشنی ہے جو اندرون سے پھوٹتی ہوئی ظاہر ہوتی اور ایک فیصلے کی طرح احساس پر وارد ہوتی ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب افسانہ نگار کا سفر خارج سے داخل کی طرف ہو۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تجزیہ پر مزید کچھ لکھنے

وحشی سعید نمبر

کی، کہنے کی گنجائش کم سے کم رہ جائے اور استدلال یہ شکل اختیار کر لے کہ ادب ایک کل کی اور پارہ ایک جز کی حیثیت سے آپ کے روبرو ہو۔ یہ واردات افسانہ کے حوالے سے خاص طور پر تناظری حیثیت رکھتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ دو کہانیاں ایک سی نہیں ہوتی، دو طریقے ایک سے نہیں ہوتے۔ کہانیاں جو مختصر قصوں کی طرح ہوتی ہیں۔ کہانیاں جن میں عمل اور رد عمل یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ کہانیاں جن میں افسانہ نگار کہیں دور بلندی سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے۔ کہانیاں جو ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ بس زندگی سے تراش کر رکھ دی گئی ہوں۔ کہانیاں جو رمزی ہوتی ہیں، کہانیاں جو صرف تصویری ہوتی ہیں، کہانیاں جن میں سوچتا ہوا ذہن دکھائی پڑتا ہے۔ کہانیاں جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتی ہیں۔ کہانیاں جو محض رپورتاژ کے ٹکڑے ہوتی ہیں۔ کہانیوں کی تعمیر میں تکنیک ایک بڑا ضروری جزو ہے لیکن مکمل اور خوبصورت چیز اسی وقت تیار ہوگی جب مواد اچھا ہوگا۔ اسلوب تحریر اور بیان نفیس ہو اور لکھنے والا سب کو اس طرح گوندھے کہ یہ ہم آہنگ ہو جائیں اور مواد اور ہیئت میں کوئی فرق نظر نہ آئے بلکہ صرف اتنا کہا جائے کہ یہ کہانی بہت اچھی ہے۔ خواب حقیقت، پردہ، وقت اور ریگ کچھ ایسی ہی کہانیاں ہیں جنھیں آگہی کے آئینے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ طوالت کے خوف سے میں نے ان کہانیوں کے ٹکڑے جان بوجھ کر درج نہیں کیے ہیں ورنہ وحشی سعید کہ مندرج کہانیاں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انھیں تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے تا کہ وہ اندھیرے میں روشنی سی چمک سکیں۔

وحشی سعید کو اس بات کا اعتراف ہے اور وہ کہتے ہیں کہ میں وہاں کا رہنے والا ہوں جہاں سرسبز وادیاں ہیں، صاف شفاف پانی کی بے شمار جھیلیں ہیں، رنگ رنگ کے پھولوں کے لاتعداد باغیچے ہیں، میٹھے پانی کے بہتے ہوئے جھرنے ہیں، ہزاروں پرند چرند ہیں، گاتی ہوئی بلبلیں ہیں، اڑان بھرتے ہوئے خوبصورت کبوتر ہیں۔ وہاں لوگ

وحشی سعید نمبر

دن کو چراغ جلاتے ہیں اور رات کو سورج اگاتے ہیں، مرگ کو حیات اور حیات کو مرگ کا درجہ دیتے ہیں، وہ شہر جو اونچی اونچی پہاڑیوں کے گھیرے میں ہے اس میں ایک پہاڑی کوہِ ماراں کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر میں ایک مسخرہ، شیخ چلی بھی رہتا تھا۔ وہ دن بھر شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتا۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں کو سنہرے خواب بیچتا، ریت کے محل بناتا، شہر کے سادہ لوح لوگ اس کی باتوں پر ایسا یقین کرتے تھے جیسے کہ فرمان۔ اس مسخرے کی باتوں میں وہ اپنا روشن مستقبل ڈھونڈتے۔ اُس مخرج کا سراغ لگانے میں انھیں ذرا سی بھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ خدا جیسی عظیم ہستی نے بڑی فیاضی سے انھیں افسانے لکھنے، سیدھی بات کو پیچ میں رکھنے، روشنی کو رفتار سے سفرا کرانے کے ہنر سے، نفسیات، مذہب، لاشعور اور دیگر جہتوں سے روشناس کرانے میں ایک ایسا ہنر بخشا ہے جو، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ خدائے برتر کے عین شان شایاں ہے۔ وحشی سعید یہ تسلیم بھی کرتے ہیں اور انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ وہ کہانی کو اس راستے پر لا کر اختتام پذیر کرتے ہیں کہ ان کے اسی جوہر کو لافانی تسلیم کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اگرچہ ان کی اس تخلیقیت میں کئی سخت مقامات بھی آتے ہیں۔ وہ احساس کرواتے ہیں کہ مجھ سے میرے جاننے والے کہتے ہیں کہ میں نے اپنی پہچان مسخ کر دی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ زمانے میں ہمارے وہ ساتھی بھی ہوا کرتے تھے جو ان راستوں سے گزرتے تھے جو کانٹوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اب تم دودھ سے نہاتے ہو اور اطلس سے اپنے بدن کو سجاتے ہو، ہیرے جواہرات سے انگلیوں کو سنوارتے ہو۔ کروڑوں کی گاڑی میں گھومتے ہو۔ افسوس تم کو کانٹوں سے بھرے راستے راس نہ آئے۔ تم نے کاغذ پر کتنے بت تراشے، کہاں گیا وہ تخلیق کار، افسانہ ایک لمبی راہ پر گامزن ہے، ہر رات پچھلی رات کی طرح آنکھوں میں کٹتی ہے۔ المناک

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

رات، خوفناک رات، راستہ بہت لمبا ہے جسے طے کرنا ہے، نئے موسموں کی بشارت کے لیے حافظہ میں فہم وادراک کی کیفیت ہونا لازمی ہے۔ زمان ومکاں سے پرے دیکھنے کی تاب نہایت ضروری ہے۔ کہانیاں یوں ہی وقت کی فعالیت سے جنم نہیں لیتیں۔ ترغیب کے لیے فن کی اساس کا احساس ایک لازمی امر ہے۔ گیرائی اور گہرائی افسانوں میں از خود سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ پلاٹ، کردار نگاری اور واقعیت، موضوع کی صداقت اور اہمیت یہ سب کچھ افسانوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کے احترام میں فن کی پہلی اینٹ کیونکہ دریافت کا قصہ روزِ ازل سے ایک بنیادی نکتہ کی طرح سامنے آتا رہتا ہے اور اس پر قیاس در قیاس افسانہ نگار کے حق میں جاتا ہے۔ وحشی سعید اپنے افسانوں میں اسی پل صراط سے بخوبی اور آسانی سے گزرے ہیں۔ ان کے تنقید نگاروں کو ان سے شکایتیں کم سے کم ہیں کیونکہ افسانوی تاثر قاری کے ذہن میں پہلی ضرب کی مانند تازہ اور دائم رہتا ہے۔

اب اگر میں آپ حضرات کے ذہن رسا کو اس افسانوی محفل سے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شعر کی طرف راغب کروں تو ظاہر ہے کہ میں مجسم الزام کی زد میں آؤں گا لیکن یہ آپ کی نظر میں ہے کہ کتنے ہی اشعار خود کو منوانے کی طاقت رکھتے ہیں، سو میں آپ کی تفنن طبع کے لیے ایک نظم یہاں درج کرنے کی سعی کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے خودسری اور یہ کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے......

وہ رات لمبی اور اذیت ناک تھی
کر کے جھرمٹ میں زندگی کی ساعتوں کو
جب اس نے دم توڑتے ہوئے دیکھا
تو وہ خوف زدہ ہوگیا
کہیں کسی حسین شاہکار کی تکمیل کے لیے بھیانک اندیشے بھی

وحشی سعید نمبر

زندگی کے ساجھے دار بنتے ہیں۔
وہ دیر تک اپنے دل کو آنے والی
دل فریب آشاؤں سے بہلاتا رہا
پھر اچانک کسی نے
اسے خواب شیریں سے جگایا
وہ سفید گون پہنے ہوئے
قد آور شخص
اپنی آہنی آواز میں کہنے لگا
کیا یہ ضروری ہے
کہ تمہاری خودسری تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو
لیکن قد آور شخص نے آگے کہا
شاہکار کا بننا تو دور کی بات ہے
اب تو معمار بھی ٹوٹ گیا
وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے
اس نے اپنی خودسری سے
اُن میں جان ڈال دی

آپ نے نظم ملاحظہ فرمائی۔ یہ نظم جذبات اور احساسات کے اظہار سے مملو ہے اور ایہام اور ابہام کی نادر مثال بھی۔ بیتے لمحات اور واقعات کو بڑی تصویری شکل اور انداز میں پیش کرتی ہے۔ اب اگر ہم اس ٹکڑے کو نظم کی بجائے افسانہ کے روپ میں آپ کے سامنے پیش کریں تو آپ کیسا محسوس کریں گے اور آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ اس میں افسانہ نگاری کے سبھی لوازم بکثرت موجود ہیں۔ انداز کی ندرت، اسلوب کی

وحشی سعید نمبر

انفرادیت، مشاہدے کی گہرائی، زبان کی جدت اور موضوع کا چابک دستانہ تنوع اور پرکشش اندازِ بیان اور افسانہ کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار، غرضیکہ اس میں سبھی کچھ موجود ہے۔ ایسے مختصر افسانوں کو جنھیں وحشی سعید نے بکثرت لکھا ہے۔ اگر نثم کے نام پکارا جائے تو کوئی قباحت کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ پارے افسانہ اور نظم دونوں کے تاثر سے بھرپور ہیں اور یہ وحشی سعید کا حق بنتا ہے کہ وہ جس روپ میں چاہیں اپنے تخلیقی جوہر کو قاری کے روبرو پیش کرسکیں کیونکہ وجودی سچائیاں چاہے وہ کسی بھی سطح اور عناصر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئیں، متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

اور آخر میں خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔ کہانی اپنے جدیدیت کے پُرفن دور سے بیانیہ کی طرف مراجعت پذیر ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا تھا کہ بچھو کا کاٹا روتا ہے اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ وحشی سعید سے گزارش ہے کہ اب وہ کچھ ایسی کہانیوں کی طرف راغب ہوں جو قارئین کے لیے بچھو کی کاٹ کا درجہ رکھتی ہوں کیونکہ وحشی سعید کی نو دریافت ہمارے لیے نہ صرف عمدہ کاوش میں شمار ہوگی بلکہ وہ ہماری مبارکباد کے بھی مستحق ہوں گے۔

حضرات! آپ نے میری پریشان خاطری کو نہایت سکون اور اطمینان سے سنا جس کے لیے میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ وحشی سعید پر بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا جس سے شاید میں پوری طرح انصاف نہیں کرسکا۔ یہ اہم کام میں کسی اور مجلس کے لیے اٹھا رکھتا ہوں، شکریہ۔



وحشی سعید کی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ

☆ دیپک بدکی

وحشی سعید آزادی کے بعد کشمیر کے نثری ادب کا اہم دستخط ہیں۔ ادبی میدان میں وہ ایسے وقت پر وارد ہوئے جب ترقی پسند تحریک دم توڑ رہی تھی اور جدیدیت کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے ابتدائی دور میں کرشن چندر کی طرح، جن کا بچپن کشمیر کی وادیوں میں گزرا تھا، اپنی کہانیوں میں ترقی پسندی کے ساتھ رومانی فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔ شاید یہ کشمیر کی خوبصورتی اور رومانی مناظر کا اثر ہو۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جن دنوں ترقی پسندی کا بول بالا تھا انھی دنوں فرائڈ کے نفسیاتی نظریئے نے کچھ ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے نفسیاتی تجزیے کو اپنے افسانوں کا اوڑھنا بچھونا بنا دیا۔ اس کارواں کے سرخیل ایک اور کشمیری تھے جن کا نام سعادت حسن منٹو تھا۔ وحشی سعید کی تحریروں پر اس نظریئے کا بھی خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ان کے پہلے مجموعے ''سڑک جا رہی ہے'' کی جلد اول پر یہ تحریر درج ہے......

''وحشی سعید ساحل نے اس کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ایک عورت کے جنسی نفسیات کی تصویر پیش کی ہے''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی نفسیات افسانہ نگار کے مشاہدے اور مطالعے کا مرکز رہی ہے۔ انھوں نے مختلف نسلوں، قوموں اور طبقوں کی نسوانی فطرت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو افسانہ نگار کے بیشتر افسانے خارجی واقعات و حادثات پر مبنی ہیں لیکن کہیں کہیں ان میں ذاتی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ادبی سفر کے اگلے پڑاؤ پر وحشی سعید نے تجریدی اور علامتی اظہار کا سہارا لیا اور موجودہ

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

زمانے میں انسانی وجود کی لاچاری اور بے معنویت، ذات کے کرب وادراک، انسان اور انسانیت کی گمشدگی اور اقدار کے زوال کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی جو دورِ جدیدیت کی دین تھی اور یہ دور ان کے تخلیقی سفر کا دوسرا دور کہا جا سکتا ہے۔ نتیجے میں کہانی ان سے رخصت ہوگئی اور ان کا قلم جمود کا شکار ہوگیا۔ ۱۹۹۰ء میں کشمیر میں رونما ہوئے حالات نے انھیں پھر سے حقیقت پسندانہ افسانے لکھنے کے لیے مجبور کیا اور ان کی کہانیوں میں کہانی پن لوٹ آیا۔ حالانکہ اس دور میں بھی وہ علامتوں اور استعاروں کا استعمال کرتے رہے مگر اب وہ علامتوں کو منزل سمجھنے کے بجائے منزل تک پہنچنے کا وسیلہ گردانے لگے۔

۱۶ر نومبر ۱۹۴۶ء کو سری نگر، کشمیر میں جنمے وحشی سعید کا اصلی نام محمد سعید ترمبو ہے۔ شہر کے شہرت یافتہ بسکو سکول اور ایس پی کالج میں تعلیم پا کر انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم.اے (اُردو) کی ڈگری حاصل کی اور پھر آبائی پیشے (تجارت) کے ساتھ جڑ گئے۔ چھٹی دہائی کے اواخر میں اپنے ہاتھ میں قلم اُٹھایا، پہلے سری پرتاپ کالج سری نگر کے میگزین ''پرتاپ'' سے وابستہ رہے اور پھر ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک دو ماہی 'نگینہ' کی ادارت سنبھالی۔ انہی دنوں موصوف کے افسانے مقامی ''روزنامہ آفتاب'' کے ادبی صفحے پر چھپتے رہے اور بعد میں ۱۹۷۰ء کے آس پاس ان کا پہلا افسانہ ''جمود کا جنازہ'' ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کی زینت بنا۔

ابتدا میں محمد سعید ترمبو ''وحشی سعید ساحل'' کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ افسانوی مجموعے ''سڑک جا رہی ہے'' کے پہلے ایڈیشن پر یہی نام درج ہے مگر بعد میں انھوں نے 'ساحل' کا لاحقہ ترک کر کے صرف 'وحشی سعید' اپنا لیا۔ ''سڑک جا رہی ہے'' کا دوسرا ایڈیشن جون ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ افسانوں کے دو اور مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' (ستمبر ۲۰۱۳ء) اور ''خواب حقیقت'' (جون ۲۰۱۴ء) شائع

وحشی سعید نمبر

ہو چکے ہیں۔ مزید "پتھر پتھر آئینہ" کے عنوان سے ایک اور کتاب مارچ ۲۰۱۴ء میں شائع ہو چکی ہے جس میں ان کے دو ناولٹ "پتھر پتھر آئینہ" اور "ایک موسم کا خط" شامل ہیں۔

وحشی سعید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سڑک جا رہی ہے" پوش پبلشنگ کمپنی سرینگر نے بہت عرصہ پہلے شائع کیا تھا۔ مجموعے پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ مجموعہ دوبارہ ادارہ "تحریک ادب، وارانسی" کے تعاون سے جون ۲۰۱۴ء میں شائع ہو چکا ہے جس میں تیس افسانے شامل ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں کئی افسانے (تصویریں الجھی الجھی، انداز، پردہ، قربان گاہ، سرخ چادر، آشوب آگہی، جدا جدا راستے، طوفان، گھاس کا تنکا، مکان مالک کے نام، گھر سے کالج تک، یہ دوڑ سگریٹ، وعدہ، تقدیر، وقت اور رنگ، اور آغوش) شاملِ اشاعت نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں دو ایک افسانوں کے عنوان بھی بدل دیئے گئے ہیں جیسے 'نجلی او نجلی' کے بدلے 'نجلی' اور 'ایک کرن اور ایک موتی' کے بدلے 'موتی اور کرن'۔ پہلا مجموعہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے نام منسوب ہے مگر دوسرے ایڈیشن میں انتساب حذف کیا گیا ہے۔ ان تبدیلیوں کا جواز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کتاب کی طوالت کے مدنظر انھوں نے ان افسانوں کو خارج کیا ہو۔ چنانچہ دونوں ایڈیشنوں کے درمیان کا وقفہ بہت طویل ہے اس لیے متن میں بھی کچھ جگہوں پر ترمیم کرنے کی ضرورت پڑی ہے، خاص کر جہاں روپے پیسے کے لین دین یا پھر اجرتوں اور قیمتوں کا ذکر ہے۔ البتہ ایسا کرتے ہوئے احتیاط نہیں برتی گئی ہے مثلاً ص ۱۱۸ پر بھیڑ کی خریداری میں نظر ثانی کر کے جو حساب لگایا گیا ہے وہ غلط ہے۔

چنانچہ افسانہ نگار کشمیری نژاد ہیں اس لیے ان کے کئی افسانوں کا پس منظر کشمیر ہے اور کئی جگہوں پر کشمیر کے اہم مقامات، گلی محلوں اور بود و باش کا ذکر آ چکا ہے (وہ ہار گیا، جوا، ترک)۔ ان کا اثر انگیز افسانہ 'جوا' پڑھ کر مجھے اپنی گمشدہ دھرتی میں بیتا ہوا بچپن یاد آیا۔

ہول سیل مارکیٹ مہاراج گنج اور متصل گاڑہ کوچہ میں اکثر ایسے بے ایمان جواری نظر آتے تھے جو خریداری کرنے کی خاطر آئے ہوئے غریب معصوم دیہاتیوں کو تین پتی (غلام بیگم بادشاہ میں بیگم ڈھونڈنا) کے دام میں پھنسا کر ٹھگ لیتے تھے یہاں تک کہ ان کے کپڑے اتارنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ہم بچوں کو آس پاس کھڑے ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ مذکورہ افسانہ وحشی سعید کی حقیقت نگاری پر دال ہے۔اس کھیل کا ذکر افسانہ ''گھر سے کالج تک'' (مجموعہ 'خواب حقیقت') میں بھی آیا ہے۔'سڑک جارہی ہے' میں کئی افسانے رومانوی نوعیت کے ہیں جیسے نجلی، وہ ہار گیا، ترک، موتی اور کرن وغیرہ۔ کچھ افسانوں میں نفسیاتی اور جنسیاتی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے مثلاً تلخ یادیں، الجھے لمحے اور سڑک جارہی ہے۔آج کل جس کرائے کی کوکھ (Surrogacy) کی بات زور وشور سے ہورہی ہے۔اس کے ابتدائی نقوش وحشی کے افسانوں، 'وارث کی تلاش' اور 'جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے' میں ملتے ہیں۔ اسی طرح ان کا افسانہ 'دل والی' پلاسٹک سرجری سے متعلق ہے۔لگتا ہے افسانہ نگار کافی عرصے تک ممبئی میں قیام پذیر رہے ہیں کیونکہ انھوں نے وہاں کی زندگی کی تصویریں اپنے افسانوں اور ناولٹوں میں بڑی ہنر مندی سے کھینچی ہیں (ہڑتال، جب ممبئی جھک جائے گی، یاد، عورت اور مچھلی وغیرہ)۔

ان کے افسانوں میں ایک جانب بڑے شہروں میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے غریبوں، مفلسوں، بے روزگاروں، مل مزدوروں، مچھلی والوں، ادنیٰ کلرکوں اور فلموں میں کام ڈھونڈنے والوں کی کسمپرسی ملتی ہے اور دوسری جانب سیٹھوں اور ساہوکاروں کی بدنیتیاں اور کارستانیاں نظر آتی ہیں۔ چند افسانوں جیسے ترک، یہ تہذیب یافتہ لوگ وغیرہ میں رنگ ونسل کے امتیاز پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے فلم نگری ممبئی سے متعلق ہیں مثلاً یاد، ہڑتال، جب ممبئی جھک جائے گی وغیرہ۔ امیری غریبی کی جنگ میں کہیں سکھی مچھیرن کی آبروریزی ہوتی ہے اور اس کو سمندر کی آغوش

وحشی سعید نمبر

میں پناہ لینی پڑھتی ہے (عورت اور مچھلی)، کہیں بدچلنی نیک چلنی پر غالب آتی ہے (نیلام)، کہیں دولت منداور طاقت ور اپنی دولت اور قوت کے بل بوتے پر استحصال کرتا ہے (یادوں کی دلہن)، کہیں دولت کے نشے میں ایمان کا دامن چھوٹ جاتا ہے (یاد، ہڑتال) اور کہیں حرصِ دولت آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے (جب ممبئی جھک جائیگی)، غرض افسانہ نگار کے یہاں کرداروں کی بوقلمونی بھی ہے اور موضوعات کا تنوع بھی۔

ایک اہم نکتہ جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اکثر افسانوں میں جب تضاد کو نقطۂ عروج پر لے جایا جاتا ہے تو آخر میں اس کا حل ضمیر کی آواز میں ڈھونڈا جاتا ہے۔ اس ضمن میں سودا، گناہوں کا پجاری، ہنسی کا قتل، احساس کی بجلی اور ترک بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ناولٹوں میں بھی اس روش کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ ٹریٹمنٹ مثالیت پسندی کی دین ہے جس کی بنیاد پریم چند اور یلدرم نے اپنے اپنے انداز میں روایتی افسانوں میں ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ افسانوں کے اختتام پر مروج طریقۂ کار کے عین مطابق بچھو کی مانند دُم کے ڈنک (Sting in the tail) کی تکنیک سے تحیر پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے (دل والی، پتھر کا زخم)۔

ستمبر ۲۰۱۳ء میں وحشی سعید کے افسانوں کے دوسرا مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' ادارہ تحریک ادب کی وساطت سے شائع ہوا۔ ان کے پہلے اور دوسرے مجموعے میں کئی دہائیوں کا وقفہ حائل ہے جو شاید ان کی دیگر پیشہ ورانہ مصروفیات، جدید لب ولہجہ کے سبب افسانے کے تئیں قارئین کی بے رُخی یا پھر کشمیر کے دگرگوں حالات کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ خیر جو بھی وجہ ہو ادب سے ان کی مراجعت ایک خوش آئند بات ہے اور مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقے اس کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ اس حوالے سے جاوید انور، مدیر و مالک ''تحریک ادب'' فرماتے ہیں:

''حالانکہ ان کا شمار ۸۰ء کی دہائی کے معتبر فکشن نگاروں میں ہوتا ہے

وحشی سعید نمبر

لیکن ایک عرصہ تک ان کی تخلیقات رسائل و جرائد کی زینت نہ بن سکی تھیں۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ از سرِ نو اشاعت کے توسط سے اردو فکشن کی خدمت کر رہے ہیں"۔

(جاوید انور، ناول: 'پتھر پتھر آئینہ'، گرد پوش)

وحشی سعید کے اس سکوتِ قلم (Writer's Block) کے بارے میں جاوید انور ایک اور جگہ یوں رقم طراز ہیں:

"وحشی سعید جنت نشان جموں و کشمیر کے وہ صاحب طرز فکشن نگار ہیں جن کے افسانے اپنے وسیع تر کینوس کے ساتھ جموں و کشمیر کی پوری تاریخ بالخصوص ۸۰ء کے بعد ہونے والے حالات اور اس کے اسباب جو تاریخ کے پنوں میں درج ہیں ان کے مشاہدے اور تجربے سے منسلک ہو کر بیان کا ایسا اسلوب اختیار کر لیتے ہیں جو قاری کے ذہن پر منفرد اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ۹۰ء کی دہائی کے بعد ان کی دوسری مصروفیات ادبی سرگرمیوں پر اس طور غالب آ گئی تھیں کہ ان کا تخلیقی سفر تو جاری رہا لیکن اشاعت کے لیے رسائل و جرائد میں اپنی تخلیقات ارسال نہ کر سکے"۔

(جاوید انور، ناول: 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ'، گرد پوش)

جہاں تک 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ' کا سوال ہے اس میں اکیس افسانے شامل ہیں جن میں سے کئی افسانے مثلاً آتش بیاں، پہچان، خودسری، گمراہی اور کنوارے الفاظ کا جزیرہ، اتنے مختصر ہیں کہ ان کو افسانچوں کے زمرے میں رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس مجموعے میں روایتی اندازِ بیاں کے بدلے جدید تجریدی طرزِ تحریر کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ گو بیانیہ پوری آب و تاب کے ساتھ یہاں بھی جلوہ گر ہے تاہم افسانے مختصر ہو

چلے ہیں اور علامتوں، استعاروں اور تلمیحات کو بڑی ہنروری سے برتا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پیراگراف اور چست و بکثرت مکالمے جابجا نظر آتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار پر جدیدیت کا رنگ چڑھتا گیا اور انھوں نے خارجیت کے بدلے داخلیت اور اجتماعیت کے بدلے انفرادیت کو اپنا شعار بنا لیا۔ کھلے اظہار کے بدلے انھوں نے اشاروں اور کنایوں میں بات کہنا مناسب سمجھا۔

'کنوارے الفاظ کا جزیرہ' کے اکثر افسانوں میں وجود اور اس کی معنویت، عصری تناظر میں انسان کی حقیقت، اقدار کی شکست و ریخت، بشر کی تنہائی اور بے چہرگی وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'آب حیات' میں اسطوری انداز اپناتے ہوئے وجودی کشمکش اور لافانیت پر فوکس کیا گیا ہے جبکہ 'پہچان' اور 'مٹھی، اڑان اور آسمان' میں انسان اپنی انا کا قیدی بن جاتا ہے۔ اسی نہج کے اور افسانوں کے نام یوں ہیں: 'خودسری'، 'گمراہی'، 'سکوت در سکوت'، 'اندھا کنواں'، 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ' وغیرہ۔ یہاں بھی چند افسانوں میں نفسیاتی و جنسیاتی گرہیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً افسانہ 'کشکول' میں دوست کی بیوی کی لاشعوری طلب اور 'بڑا دروازہ' میں رشتوں کے تقدس کو درشایا گیا ہے۔ کچھ افسانوں میں جیسے 'آتش بیاں' اور 'طلسم کلام' سیاسی و سماجی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ کشمیر کے حالات کی عکاسی بھی چند افسانوں میں علامتوں اور استعارات کے ذریعے کی گئی ہے مثلاً نیا حکمران اور منفی کا قاعدہ۔

تیسرے مجموعے کا نام ہے...... 'خوابِ حقیقت'، جو جون ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس مجموعے میں ستائیس افسانے شامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ 'سڑک جا رہی ہے' کے دوسرے ایڈیشن میں کئی افسانے حذف کیے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشن میں موجود تھے (تصویریں الجھی الجھی، انداز، پردہ، قربان گاہ، سرخ چادر،

وحشی سعید نمبر

آشوب آگہی، جدا جدا راستے، طوفان، گھاس کا تنکا، مکان مالک کے نام، گھر سے کالج تک، یہ دوڑ، سگریٹ، وعدہ، تقدیر، وقت اور رنگ، اور آغوش)۔ یہ سبھی افسانے 'خواب حقیقت' میں شامل ہیں البتہ 'تصویریں الجھی الجھی' کا عنوان، 'نامکمل تصویریں' اور 'انداز' کا 'تصویر' رکھا گیا ہے۔ ان افسانوں میں وہی اسلوب ملتا ہے جو 'سڑک جا رہی ہے' کے دوسرے افسانوں میں نظر آتا ہے اور جس کے بارے میں پہلے بحث ہو چکی ہے۔ اس طرح مذکورہ مجموعے میں صرف دس نئے افسانے شامل ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں کہانی پن کو پھر سے جگہ دی ہے اور اپنے جذبات کو کھلے طور پر اظہار کرنے کا قصد کیا ہے۔ اب وہ علامتوں اور استعاروں کو اپنا مقصد بنانے کے بجائے محض ذریعہ بنا لیتے ہیں حالانکہ چند ایک افسانے ابھی بھی تجریدی نوعیت کے ہیں۔ 'خواب حقیقت' کے کئی افسانے کشمیر، خاص طور سے ۱۹۹۰ء کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں جیسے کب آئے گا وہ سقراط، نجات دہندہ، اپنا عکس اپنا آئینہ، میٹھا چشمہ اور میں، وہ صبح کب آئے گی اور طوفان۔ ان کہانیوں میں کشمیر کے سیاسی منظر نامے کو منعکس کیا گیا ہے اور تاریخی واقعات و راہنماؤں کی کوتاہ نظری کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ 'نجات دہندہ' میں مظلوم قوم کسی مسیحا کی منتظر ہے جو ان کو موجودہ مایوس کن حالات سے نجات دلا سکے، 'میٹھا چشمہ اور میں' میں بھی منزل کے دور ہونے کی تلقین کی گئی ہے جبکہ 'وہ صبح کب آئے گی' میں یہ باور کیا گیا ہے کہ منزل جتنی نزدیک نظر آتی ہے اتنی ہی وہ دور ہے۔ چند ایک افسانے تجریدی نہج کے ہیں۔ 'لمبا آدمی چھوٹا قد' اور 'تصویر' میں انسانی وجود اور بشر کی آئیڈینٹٹی کرائسس پر روشنی ڈالی گئی ہے، 'آشوب آگہی' میں اقدار کا زوال درشایا گیا ہے، 'جدا جدا راستے' میں انسانی اڑان پر سماج کی بیڑیوں کا اثر دکھایا گیا ہے، 'طوفان' میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کی ہمت اور حوصلے کی آزمائش تبھی ہوتی ہے جب اس پر مصیبتیں آتی

وحشی سعید نمبر

ہیں، 'گھاس کا تنکا' میں دو نیم وجود یہ طے نہیں کر پاتا ہے کہ وہ اقدار و ایمان کو گلے لگائے یا پھر ان رسموں سے لاتعلق ہو جائے۔ دو ایک افسانوں میں عشق و محبت کے قصے رومانی حقیقت نگاری کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں جیسے عجب پریم کہانی اور وعدہ۔ کچھ کہانیاں انسانی نفسیات پر مبنی ہیں جیسے سرخ چادر (Mother Fixation)، وقت اور رنگ (Fetishism) اور آغوش (Oedipus Complex)۔ مجموعے میں سماجی شعور کی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ 'گھر سے کالج تک' ایک تاثراتی افسانہ ہے جس میں مروج تعلیم پر طنز کیا گیا ہے۔ 'یہ دوڑ' میں راوی کالج میں ہو رہی دوڑ کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ہو رہی دوڑ کے ساتھ موازنہ کرتا ہے۔ اس طرح 'دوڑ' ہم عصر مسابقتی زندگی کی دوڑ کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح افسانہ سگریٹ میں زندگی اور سگریٹ کی مشابہت کی گئی ہے۔ 'تقدیر' افسانہ کم اور انشائیہ زیادہ لگ رہا ہے جس میں تقدیر کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ تین اور افسانوں میں ظرافت اور طنز کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ عنوان ہیں: نامکمل تصویریں، مکان مالک کے نام اور پردہ۔ افسانہ 'قربان گاہ' میں خدا کے نام پر قربانی دینے پر سوال اٹھایا گیا ہے۔ افسانے میں بکرا معصوم نگاہوں سے کہہ رہا ہے۔ "مجھے بھی نئی زندگی چاہیے، مجھے بھی یہی زندگی چاہیے"۔ مگر پاسِ رسومات کی خاطر قصائی کا بیٹا کہتا ہے۔ "جائے گا کہاں حرامی...... آخر دم توڑنے کے لیے اس کو قربان گاہ میں آنا ہی ہوگا"۔

وحشی سعید کی تازہ ترین کتاب 'پتھر پتھر آئینہ' مارچ ۲۰۱۴ء میں تحریکِ ادب کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر رونما ہو چکی ہے۔ کتاب میں دو ناول (ناولٹ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) 'پتھر پتھر آئینہ' اور 'ایک موسم کا خط' شامل ہیں۔ دونوں ناولٹوں میں حقیقت نگاری صاف جھلکتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناولٹ بہت عرصہ پہلے تحریر کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'پتھر پتھر آئینہ' ۷۰ء کے دہے کی تخلیق لگتی ہے کیونکہ صفحہ ۳۶ پر دس ہزار

وحشی سعید نمبر

ڈالر کا تبادلہ پونے ایک لاکھ روپے دکھایا جا چکا ہے جو اُس وقت کی جانب اشارہ کرتا ہے جب ڈالر کی ریٹ ساڑھے سات روپے مقرر کی گئی تھی۔ ناولٹ 'ایک موسم کا خط' بھی بہت پہلے لکھا جا چکا ہے اور اب ۲۰۱۴ء میں 'پتھر پتھر آئینہ' کے ساتھ اکٹھے چھپا ہے۔ ناولٹ میں ریل کے تیسرے درجے میں سفر کرنا (ص ۷۴) اور ریڈیو گرام کا استعمال کرنا (۱۴۱) میرے اس مفروضے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ مجموعی طور پر اگر ان ناولٹوں پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو پس منظر، کردار اور موضوع کی پیش کش ترقی پسند دور کی یاد دلاتی ہے۔ بقول عالم بنارسی:

''وحشی سعید کی فکشن نگاری کا ایک کمال یا یوں کہیں کہ ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ جس عہد کی بات کرتے ہیں اور جس شہر، جس گلی، جس مقام کے حالات کو صفحۂ قرطاس پر ابھارتے ہیں، وہ مکالمے اور منظر کشی کے اعتبار سے اتنے مستحکم ہوتے ہیں کہ قاری اسی شہر اور اسی عہد میں پہنچ جاتا ہے۔ ان کے افسانے جہاں حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیتے ہیں وہیں ان کے ناول بھی اپنی فکشن کی شعریات کے حوالے سے بہت اہمیت کے حامل ہیں''۔ (عالم بنارسی: 'پتھر پتھر آئینہ'، گرد پوش)

'پتھر پتھر آئینہ' دو اناؤں کے تصادم کی داستاں ہے جس میں ایک غریب لڑکا سرور امیر اور مغرور لڑکی ایتا سے محبت کرنے کی جسارت کرتا ہے مگر بدلے میں اس کو تحقیر و تذلیل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک جانب صابر اور نیک سیرت سرور احمد ہے جو اپنی ذہانت اور محنت شاقہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتا ہے اور مصوری کے میدان میں عالمی شہرت سے سرفراز ہوتا ہے مگر ماضی اور زمینی حقیقت سے اپنا رشتہ نہیں توڑتا اور دوسری جانب مغرور اور ایذا رساں ایتا ہے جو اپنے والد کی دولت پر نازاں ہے اور اپنے ہم جماعت سرور کو آئے دن سب کے سامنے ہدفِ ملامت بناتی ہے۔ یہ نفرت سرور کو اپنی زندگی خوب سے خوب تر بنانے کے لیے ترغیب دیتی ہے تا کہ وہ

وحشی سعید نمبر

بہت بڑا آدمی بن جائے جبکہ اپیتا پر منفی اثر کرتی ہے اور وہ حسد اور بغض کی آگ میں جل کر خود تخریبی کی نذر ہو جاتی ہے۔ حالات جب کروٹ لیتے ہیں تو اپیتا خود کو لاچار پاتی ہے کہ اس کے والد کی دولت کافور ہو جاتی ہے، اس کا منگیتر اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور اس کا اکلوتا سہارا اس کا باپ مجبور ہو کر اپیتا کو ڈاکٹر سرور کے حوالے کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا۔ باوجودیکہ اپیتا سرور کی منکوحہ بن جاتی ہے لیکن وہ حالات سے سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوتی جب تک تنہائی اس کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے اور وہ تپ دق کے عارضے میں مبتلا ہو کر ایک بار پھر سرور کی عنایتوں پر نربھر ہو جاتی ہے۔ انجام کار یہی بیماری اور موت کی آہٹ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ ناولٹ میں سرور اور اپیتا دونوں کے کردار مضبوط دکھائے گئے ہیں جو ان کی جبلت اور ذہنی تربیت کی دین ہے۔ حالانکہ سرور زندگی کی اونچ نیچ کو بھانپ کر خود کو بدلتا رہتا ہے مگر اپیتا اخیر تک خود کو بدلنے سے انکار کرتی ہے۔ کرداروں کی یہ تصویر کشی ناولٹ کو بہت دلکش بناتی ہے۔

دوسرے ناولٹ کا عنوان 'ایک موسم کا خط' ہے۔ اس ناولٹ میں ممبئی کی مدنی زندگی کی جھلک ملتی ہے جس میں امیری اور غریبی کے تفاوت کو منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو رومانی واقعہ نگاری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ناولٹ میں فلمی کہانیوں کی مانند میلوڈرامائیت ملتی ہے اور نرینہ مرکزی کردار انل کروٹ بدلتے ہی قلی سے قارون بن جاتا ہے۔ انل گھر سے بھاگ کر ممبئی میں ایک امیر صنعت کار کی بیٹی کومل کا ڈرائیور بن جاتا ہے۔ نوکری کے دوران میں اسے مالکن کے قہر کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو وہ نوکری چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ دوسری جانب جذباتی مالکن ایک معمولی ڈرائیور کی منہ زوری کو اپنی بے عزتی سمجھ بیٹھتی ہے جسے وہ برداشت نہیں کر پاتی۔ وہ انل سے بدلہ لینے کی سبیلیں کرتی ہے۔ موقعہ پرست انل اپنے دولت مند دادا

کی پناہ میں جا کر اس کی دولت کا وارث بن جاتا ہے۔ اسی دولت سے وہ نہ صرف صنعت کار بلکہ کومل کی کمپنی کا حصے دار بھی بن جاتا ہے اور پھر سبھی کمپنیوں کا چیئر مین مقرر ہوتا ہے۔ اس تحقیر سے خار کھا کر کومل کئی بار انل کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے یہاں تک کہ اس کو مارنے کے لیے سپاری بھی دیتی ہے لیکن اس کی ہر چال اُلٹی پڑ جاتی ہے۔ آخر کار جب کومل کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انل اس کو نیچا دکھانے کے لیے زیر نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ اسے محبت کرتا ہے تو دونوں دائمی طور پر ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔

'پتھر پتھر آئینہ' کی طرح ہی 'ایک موسم کا خط' کا پلاٹ بھی نپا تلا ہے جو وقت کی گردش کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ کہانی تدریجی مراحل طے کر کے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے اور پھر منطقی طور پر انجام تک سفر کرتی ہے۔ کہانی میں کہیں کوئی جھول نہیں ملتی۔ مرکزی نسوانی کردار گھمنڈی، خود غرض اور سادیت پسند ہے جو اپنی اسکیموں کو انجام دینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے جبکہ نرینہ کردار خوددار، محنتی، اولوالعزم اور ہمدردانہ طبیعت کا مالک ہے جو نہ صرف انسانی قدروں کا پاسدار ہے بلکہ حالات کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھال دیتا ہے۔

افسانہ نگار نے بیانیہ کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے لیکن جہاں کہیں مکالمے حسب ضرورت استعمال ہوئے ہیں وہ برمحل اور چست ہیں۔ ان کی منظر نگاری قاری کو اپنے طلسم میں باندھتی ہے۔ نمونے کے لیے ملاحظہ ہو چند اقتباسات:

> ☆ میں وہاں کا رہنے والا ہوں جہاں سرسبز وادیاں ہیں، صاف شفاف پانی کی بے شمار جھیلیں ہیں۔ رنگ رنگ کے پھولوں کے لاتعداد باغیچے ہیں، میٹھے پانی کے بہتے ہوئے جھرنے ہیں۔ ہزاروں پرندے چرندے ہیں، گاتی ہوئی بلبلیں ہیں، اڑان بھرتے ہوئے خوبصورت کبوتر ہیں۔ وہاں لوگ دن کو چراغ جلاتے ہیں اور رات

کوسورج اگاتے ہیں۔ مرگ کو حیات اور حیات کو مرگ کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ شہر جو اونچی اونچی پہاڑیوں کے گھیرے میں ہے۔ ایک پہاڑی کوہ ماراں کے نام سے مشہور ہے۔

(کب آئے گا وہ سقراط، مجموعہ خواب حقیقت؛ص:۵)

☆ اچانک اس شہر کو کالی آندھی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ آناً فاناً سنسناتی ہوئی گولیوں نے شہر کی خاموشی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس کی سرزمین لہولہان ہوگئی۔ ایک گولی نوجوان کے سینے کو پار کر گئی۔ اس کے نیم مردہ جسم کو گاڑی کے اندر پھینکا گیا جیسے کسی مردہ جانور کو!

(عجب پریم کہانی؛ مجموعہ خواب حقیقت،ص:۳۰)

مکالموں کی زبان کردار کی آئینہ دار ہو تو مکالموں میں جان پڑ جاتی ہے، اس حوالے سے وحشی سعید سرخ رو ہو چکے ہیں۔ ان کی زبان رواں، سلیس اور شگفتہ ہے۔ اس حوالے سے عثمان جوہری فرماتے ہیں:

''(وحشی سعید) کی یہ تابنا کی اس لیے اپنا منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس قسم کی زبان کا استعمال انھوں نے اپنے افسانوں کی تحریر کے لیے استعمال کیا ہے وہ خالص فکشن کا اسلوب ہے اور مختصر افسانوں کے لیے بہت موزوں ہے...... مکالمہ، منظر، کردار، واقعہ ہر جگہ وحشی سعید نے اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ جو ان کے افسانوں کی کامیابی کی بہت بڑی اور اہم خصوصیت ہے''۔

(عثمان جوہری؛ سڑک جا رہی ہے، گرد پوش)

کچھ جگہوں پر کمپوزنگ کی غلطیاں در آئی ہیں جو بہتر پروف ریڈنگ سے صحیح ہو سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر ناول 'پتھر پتھر آئینہ' کی ہیروئن اینتا کا نام کہیں کہیں پر انیتا،

ابیتا، میتا اور مینا لکھا ہے۔ اسی طرح جنونی جنوبی، سادھورام مادھورام، دل دن اور صلیب سلیب بن چکا ہے۔ افسانہ 'وعدہ' کی شروعات میں غالبؔ کا شعر بھی غلط نقل کیا جا چکا ہے۔

جہاں تک فکر و خیال کا تعلق ہے، وحشی سعید کی نگارشات میں ذہنی ارتقا کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ وہ وقت کی گردش کے ساتھ زندگی کے سوچ سمندر میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ان کی نگارشات سے چند اقتباسات یہاں پر پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

☆ ''سکینہ ٹھیک کہتی تھی۔ نواب غازی الدین میلی قمیض کو بدلنے میں تھوڑی دیر لگا دیتے ہیں۔ لیکن بڑی سے چھوٹی بیگم لانے میں دیر نہیں کرتے''۔ (وارث کی تلاش، ص:۹۹)

☆ ''کیوں یہ آدمی ایک عورت کو غلام سمجھتا ہے۔ ایک مچھلی کی طرح بے بس اور بے کس...... جو مرد کے ہر جال میں ایک مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی ہے''۔ (عورت اور مچھلی، ص:۱۲۸)

☆ ''بشر غلط فہمی کی زنجیر اپنے گلے سے لپٹائے رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دانش کے دریچے اس پر وا کر دیئے گئے ہیں۔ پھر یہ منطق بھی تراش لیتا ہے کہ سفر کے اختتام کے بعد سفر کا آغاز ہوتا ہے''۔

(سکوت در سکوت، ص:۲۶)

☆ ''ڈھلتی ہوئی عمر میں آدمی کا اپنا سایہ بھی گھٹتا جاتا ہے۔ سایہ جس کے دراز ہونے پر وہی آدمی گمان کی رسہ کشی کے جال میں الجھ جاتا ہے''۔ (سکوت در سکوت، ص:۲۶)

☆ یہ لوگ اس مٹی کی پیداوار ہیں جس کی جھیل کا صاف شفاف پانی

ان کے اعمالوں سے غلیظ ہو گیا۔ جہاں کے سرسبز جنگل بھی ریگستان بن گئے۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے نفرت نہ کرو کیونکہ نفرت ہم سے پشیمان ہو جائے گی۔ ہم پر ترس نہ کھاؤ کیونکہ ترس بھی ہزاروں سوال کھڑے کرے گی۔ ہم وہ ہیں جو اپنے بچوں کو اپنے جہیز سے خود واقف کرتے ہیں کیونکہ ہم اپنے آپ پر کبھی شرمندہ نہیں ہوتے''۔

(وہ صبح کب آئے گی؛ مجموعۂ خواب حقیقت، ص:۳۹)

☆ ''دنیا کے حوادث انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ ذہنوں کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ زندگی کے رخ کو موڑ دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی آدمی دل کے سہارے حیات کی لمبی دوڑ طے کر لیتا ہے۔ بے حس دل والے بت بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ زمانے کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے ہیں''۔

(تصویر؛ مجموعہ خواب حقیقت، ص:۴۸)

☆ ''قدروں کے ساتھ انسان بدل رہے ہیں، تقاضے بدل رہے ہیں اور یہی نئے تقاضے آج کی عورت سے برہنہ ہو جانے کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ اس کی مخالف جنس اس بات کے لیے عورت کو جھنجھوڑتی ہے۔ سماج کے بدلے ہوئے اصول ہر انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ نئی قدروں اور نئے تقاضوں کو اپنائے''۔

(گھاس کا تنکا؛ مجموعہ خواب حقیقت، ص:۶۴)

☆ ''انسان کو یہ دوڑ کہاں لے جائے گی۔ دنیا نے ایک تباہ کن راستہ اختیار کیا جہاں ہر دم موت کا سایہ انسانی زندگیوں پر لٹکتا ہے۔ جہاں ویتنام کے بموں کا دھواں، ہزاروں انسانوں کو موت اور

وحشی سعید نمبر

زیست کی کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ بھی تو ایک دوڑ ہے......جس نے سچائی کو جھوٹ کے لبادے میں ڈھانپ لیا۔ یہ دوڑ انسانوں کو کہاں لے جائے گی"۔

(یہ دوڑ: مجموعہ خواب حقیقت؛ص:۷۴)

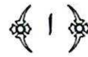
مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وحشی سعید کے یہاں ایک حساس دل اور تحلیلی دماغ ہے۔ انھیں غریبوں، مزدوروں اور سماج کے کم پایہ طبقوں سے محبت ہے اور ان کی کسمپرسی کو اپنے افسانوں میں منعکس کرتے ہیں۔ البتہ وہ ان کرداروں میں اولوالعزمی، دیانت داری اور خودداری دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ ایک ایسے سماج کے خواہاں ہیں جس میں مساوات ہو، خوشحالی ہو اور ہر چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ حال ہی میں ان کا قلم بہت عرصے کے بعد دوبارہ فعال ہو چکا ہے اور 'نگینہ' کا بھی ازسرنو اجرا ہو چکا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسی جنون سے اپنے افسانوں میں رنگ بھرتے رہیں گے جس جنون کے ساتھ وہ ابتدائی دور میں بھرتے رہے، آمین!



'پتھر پتھر آئینہ' کے کامیاب ناولٹ نگار - وحشی سعید

☆ رئیس الدین رئیس

محترم رئیس الدین رئیسؔ نے وحشی سعید کے فکروفن پر مختلف اوقات میں جو کچھ تحریر کیا ہے اسے ہم ایک ساتھ شائع کر رہے ہیں۔(ادارہ)



شاعری نثر گاری اور تحقیق وتنقید جیسے بیانیاتی علوم ہمارے اُردو ادب کا اہم اور اٹوٹ حصہ ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس کی عظمت ومقبولیت سے انکار ممکن ہی نہیں۔ ہمارے اُردو ادب کا گرانقدر سرمایہ بڑی حد تک شعریات (Poetics) پر ہی انحصار کرتا ہے۔ لیکن نثر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ نثر میں سب سے زیادہ شرف قبولیت فکشن نگاری کو حاصل ہے۔ حکایات اُسطوری قصص لوک کہانیاں ناولٹ ناول اور افسانے سبھی فکشن کے دائرہ کار میں شمار ہوتے ہیں اور ان میں بھی جو زبردست مقبولیت ناول اور افسانے کو حاصل ہے، وہ کسی اور کو نہیں ہے۔ ناول، ناولٹ اور افسانہ سبھی یوں تو بیانیہ (Narrative) سے وابستگی وہمرشتگی کے سبب مزاج ومنہاج میں قدرے یکسانیت کے حامل ہیں لیکن ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے وہ اِک دوسرے سے مختلف بھی ہیں ایڈگر ایلین پو (Edgar Ellen Poe) کے مطابق افسانہ ایک کردار ایک واقعہ اور وحدت تاثر کا حامل ہونے کے علاوہ بس اتنا ہی طول ہو کہ اس کی قرأت نصف گھنٹے میں یا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں مکمل ہو جائے اور اُسے دوسری نشست کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ افسانہ کی وحدتِ تاثر قرأت کی اولین نشست میں ہی برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس ناولٹ طویل ہوتا ہے۔ اس میں مرکزی کردار کے علاوہ ضمنی کردار بھی ہوتے ہیں جو مرکزی کردار کو سپورٹ کرتے ہیں۔ ناول کی

طرح اس میں بڑی مقدار میں جزویات کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ ناول میں جزویات کی طوالت پر کوئی پابندی نہیں۔ ناول چاہے جتنا بھی طول طویل ہوسکتا ہے مگر یاد رہے کہ ناول کا کوئی باب کبھی افسانہ نہیں بن سکتا۔ ناول میں پیچیدگی، تہہ داری، تجسس، تصادم اور تحلیل اجزائے لاینفک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ناول میں واقعات کی پینت کاری کے علاوہ کہانی پلاٹ، کردار ماجرا مکالمہ اور منظر کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

ہمارے یہاں رزمیہ، رومانی، تاریخی، جاسوسی، مہماتی، معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی سبھی قسم کے ناول لکھے جاتے رہے ہیں۔ ناول وافسانہ مغرب کی دین ہیں۔ ہمارے یہاں ان اصناف کی عمر تقریباً سوا سو سال ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی 'مراۃ العروس' اُردو ادب کی پہلی ناول ہے جو ۱۸۷۹ء میں پہلی بار منصۂ شہود پر جلوہ طراز ہوئی۔ اسی طرح 'نشے کی پہلی ترنگ' اُردو کا پہلا افسانہ ہے جس کے خالق سجاد حیدر یلدرمؔ ہیں اور یہ افسانہ ۱۹۰۰ء میں پہلی بار معارف کی زینت بنا تھا۔ ناول افسانے میں حقیقت پسندی کا رنگ منشی پریم چند سدرشن اور ''اُمراؤ جان ادا'' کے خالق مرزا ہادی رُسواؔ کے قلم کی دین ہے۔ پھر ترقی پسندیت کے دور (۱۹۳۶ء تا ۱۹۶۰ء) ناول وافسانہ منتہائے عروج کو پہنچ گیا۔ اس دور کو عہد نشاۃ الثانیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ناول کو معیار و وقار عطا کرنے والوں میں منشی پریم چند، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، اُپیندر ناتھ اشکؔ، مہندر ناتھ، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر اور واجدہ تبسم وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔ عصر حاضر میں بھی بیانیہ اور غیر بیاتیہ یعنی نئی نئی تکنیک میں آفاقی رنگ وآہنگ کے ناول عالم ظہور میں آرہے ہیں اور حقِ ناول نگاروں نے ناول کی دنیا میں نام کمایا ہے۔ اُن میں چند نام اس طرح ہیں: مشرف عالم ذوقی، شوکت حسین، غضنفر، پیغام آفاقی، نورالحسنین، شموئل احمد، اقبال انصاری، نقشبند قمر نقوی، نور شاہ، شائستہ

وحشی سعید نمبر

فاخری اور صادقہ نواب سحر وغیرہ۔ ناموں کی اس دمکتی چمکتی مالا کے ناموں میں ایک گوہر آبدار و تابدار سا نام وحشی سعید کا بھی ہے۔ سرینگر کشمیر کے متوطن وحشی سعید بیک وقت افسانہ نویس بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔ آپ گزشتہ صدی کے آٹھویں دہے سے ناول و افسانے تخلیق کرتے چلے آرہے ہیں۔ درمیانی عرصہ گاہ بیگاہ بامر مجبوری اس طرف توجہ نہ دے سکے مگر فی زمانہ جبکہ وہ اپنی معاشی اور مالی حالت قابل رشک بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو آپ پھر سے بڑی آب و تاب اور آن بان شان کے ساتھ آفاق ادب میں اپنی ظفریابیوں اور فتح مندیوں کا پرچم لہرا رہے ہیں اور اُن کی شہرت و شہامت پر لگا کر فلک الافلاک کی بلندیوں کو چوم رہی ہے۔ موصوف کی نگارشات بین الملکی رسائل و جرائد کے قرطاس ابیض پر متواتر گہر پاشیاں کرتی رہتی ہیں علاوہ ازیں آپ کے نام کا سونا ان کی تصنیفات کی فہرست کو بھی نور افشاں کیئے ہوئے ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' اور ''سڑک جارہی ہے'' زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہوکر اور جلوہ گہہ آفاق پر طشت از بام ہوکر حلقہ ہائے شائقین افسانہ اور ارباب نقد و نظر سے جھولیاں بھر بھر کے داد و ستائش اور تحسین و تہنیت کے نذرانے قبول وصول کر چکے ہیں۔ اُن کی ایک اور کتاب ''پتھر پتھر آئینہ'' بھی منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوچکی ہے۔ اس کتاب میں دو ناولٹ شامل کی گئی ہیں جن کے عنوان ہیں: ''پتھر پتھر آئینہ'' اور ''ایک موسم کا خط''۔

چونکہ میں ''پتھر پتھر آئینہ'' کی قرأت مکمل کر چکا ہوں لہٰذا اسی پر گفتگو مقصود ہے۔ یہ ناولٹ جو ۶۵ صفحات کو محیط ہے باعتبار موضوع نفسیاتی اور رومانی ناولٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ سُرور اور امتیاز ناولٹ کے مرکزی کردار ہیں۔ کہانی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چند ایک ذیلی و ضمنی کرداروں کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ وِکی سرور کا سچا اور بے غرض، بے لوث قسم کا دوست ہے جو ذہنی اُلجھن اور پریشانی کے عالم میں اسے

وحشی سعید نمبر

تسلی دیتا ہے۔ ممتاز بیگ جو اُمیہ کے......کی شکل میں اپنے والد امتیاز کے ساتھ ناولٹ میں متعارف ہوتا ہے بعد میں وہ چہرے سے نقاب اُلٹ کر وِلن کے روپ میں سامنے آ جاتا ہے اور سازش کر کے اُمیہ کے باپ شہاب الدین کو اقتصادی اور معاشی طور پر تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ سمبھو اقبال کا بوڑھا خادم ہے جس نے امیتا کو بچپن سے جوان ہوتے دیکھا تھا اس کے علاوہ ڈاکٹر ورما اور نرس چند وقفوں میں رسمی طور پر نمودار ہو کر غائب ہو جاتے ہیں دو ایک منظر میں اُمیہ کا بھائی رشید بھی وقتی طور پر اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔ مرکزی کردار سرور اور امیتا کے ہی ہیں جو ناول کے آخر تک موجود رہتے ہیں اور ناول کی کہانی اول تا آخر انھیں کے گرد گردش کرتی رہتی ہے۔

ناولٹ کی کہانی کو منضبط کرنے آگے بڑھانے میں مصنف نے کہانی، پلاٹ، کردار، منظر، مکالمہ، ماجرا سبھی عناصر سے کام لیا ہے اور ایک اچھے ناول کے لیے جن باتوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہوتا۔ ان کا التزام و اہتمام بھی روا رکھا ہے۔ یعنی ناولٹ میں پلاٹ کی کساوٹ، پیچیدگی، تہداری، تجسس، تصادم اور تحلیل جیسے سبھی اہم لوازمات کا اعادہ کر کے ناولٹ کو کامیاب بنایا گیا ہے۔

ناولٹ کے تکنیکی خصائص کے افہام و تفہیم کی ذمہ داری کو بجا طور پر نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ کہانی کا خلاصہ بیان کر دیا جائے تاکہ کہانی کی روشنی میں قارئین خود بھی میرے خیالات کو کہانی سے ہم آہنگ کر کے صورت حال کا جائزہ لے سکیں۔ یہ ایک رومانی اور نفسیاتی کہانی ہے جس کی بنیاد تضاد پر رکھی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک تو کہانی کا ہیرو سرور ہے اور دوسرا کردار ہیروئن امیتا ہے کہانی کا ہیرو ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ ہے اس کے مرحوم باپ کی تمنا تھی کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر ایک بڑا ڈاکٹر بنے وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور چند ہی دن کے بعد وہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہو جاتی ہے۔ امیتا کی ماں گزر چکی ہے اور وہ دولت مند باپ شہاب الدین کی ناز و نعم میں پلی

وحشی سعید نمبر

بڑھی لاڈلی بیٹی ہے۔سرور جس کالج میں پڑھتا ہے اس میں اگلے سال امیتا بھی پہنچ جاتی ہے۔اسے اپنے حسن اور امیر باپ کی بیٹی ہونے کا غرور ہے جبکہ سرور ایک محنتی اور قابل طالب علم ہے اور مصوری اس کا دلچسپ مشغلہ ہے۔امیتا اس سے متاثر تو ہوتی ہے مگر اس کا تاریک مستقبل دیکھ کر اسے خاطر میں نہیں لاتی ہے۔مگر اس کی تعلیمی قابلیت اسے بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ حاسدانہ انداز میں اسے اپنے طعن وطنز کا نشانہ بنانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی ہے۔سرور پری میڈیکل میں اچھے نمبروں سے پاس ہوکر پٹنہ میڈیکل کالج چلا جاتا ہے اور وہاں سے ڈاکٹر بن کر ایک اسپتال میں مریضوں کا علاج کرنا شروع کر دیتا ہے۔وہاں وہ ایک مریض امتیاز بیگ کا علاج کرتا ہے۔مریض کے بیٹے کا نام ممتاز بیگ ہے وہ بھی باپ کی تیمارداری میں مصروف ہے۔یہ ممتاز بیگ امیہ کا منگیتر بھی ہے لہٰذا منگیتر کے باپ کی عیادت کے لیے اپنے باپ شہاب الدین کے ساتھ امیہ بھی وہاں آتی ہے۔دورانِ گفتگو امیہ وہاں بھی طنز کرنے سے باز نہیں آتی اور سرور سے کہتی ہے کہ وہ ہے تو اسپتال کا ملازم ہی، وہ کبھی نرسنگ ہوم کا مالک تو ہونے سے رہا۔شہاب کو آگے چل کر اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ امیتا کو جو سرور سے خداواسطے کا بیر ہے یہ بیر نہیں بلکہ درپردہ وہ سرور سے محبت کرتی ہے۔لہٰذا وہ دل میں دشمنی رکھ کر شہاب الدین کو ایک غلط کام میں سرمایہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔نتیجتاً وہ تباہ وبرباد ہوکر دانے دانے کو محتاج ہوجاتے ہیں۔ممتاز بیگ اب باپ بیٹی پر اپنی کھل کر دشمنی ظاہر کرنے کے ساتھ صاف الفاظ میں شادی سے انکار کر دیتا ہے۔اس پر شہاب الدین کو دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔سرور ان کا علاج کرتا ہے۔شہاب الدین بیماری کے عالم میں جب اس سے اپنا ہاتھ تھامنے کی درخواست کرتے ہیں تو وہ قبول کر لیتا ہے۔شہاب الدین جابر نہ ہوکر جاں بحق ہوجاتے ہیں۔

سرور اور امیتا کی شادی ہوجاتی ہے۔سرور پچھلی باتوں پہ خاک ڈال کر آگے بڑھنے کا

وحشی سعید نمبر

تہیہ کرلیتا ہے اور شب عروسی میں جب دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتا ہے تو وہ [illegible] بولی بولتے ہوئے کہتی ہے...... میں مانتی ہوں آج تم نرسنگ ہوم کے مالک، ایک کامیاب انسان ہو اور میں ایک بے معنی وجود۔ مجھ سے شادی کرکے تم آج مجھ سے انتقام لینے میں کامیاب ہوگئے ہو، تم جیت گئے ہو اور میں ہار گئی ہوں۔ لیکن شوہر کے طور پر تم میرا سرد لاش سا بے جان جسم تو حاصل کرلوگے مگر میری روح تک کبھی نہ پہنچ سکو گے۔ یہ سن کر سرور کو دھکا لگا اور اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ پھر وہ فوراً ہی حجلہ عروسی سے باہر چلا گیا۔

اُس دن کے بعد سرور نے خود کو کام میں مشغول کرلیا اور اُمیہ کی طرف سے مکمل لاتعلقی اور غفلت اختیار کرلی۔ کچھ دن بعد امیتا بیمار ہوگئی۔ سرور کو پتہ چلا تو وہ اس کے علاج میں مصروف ہوگیا۔ بیماری کے دوران امیتا کی سوچ بدل گئی اور وہ اُسے سرتاپا شرافت اور نیکی کا مجسمہ نظر آنے لگا اور جب ایسے ہی خیالات اس نے اس پر ظاہر کئے تو سرور نے اسے گلے سے لگالیا اور دونوں پیار کے بندھن میں بندھ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہوگئے۔

نفسیاتی الجھن کی بنیاد پر استوار اس ناولٹ کی کہانی نظامات کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ ایک امیر ہے ایک غریب؛ ایک کی دلچسپی تعلیم میں ہے تو دوسرے کو اپنی مہارت کا اپنا منگیتر بنا کر نازاں ہے اور اس کے مقابلے میں سرور کو کمتر سمجھتی ہے، وہی ممتاز بیگ بعد میں شیطان بن کر سامنے آتا ہے۔ کہانی اور پلاٹ میں فرق ہوتا ہے۔ راجہ مرگیا اور رانی بھی مرگئی، یہ پلاٹ ہے۔ لہٰذا جہاں تک ناولٹ کے پلاٹ کا تعلق ہے وحشی سعید نے اس میں کہیں بھی ڈھیلا پن نہیں آنے دیا ہے۔ اس کسے کسائے پلاٹ کے زیرِ تحت واقعات کی تمام کڑیاں پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

کہانی کا آغاز دلچسپ ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ قاری کہانی کا قدم بہ قدم ساتھ دینے پر مجبور ہوجائے۔ وحشی سعید نے اس کو ملحوظ خاطر رکھ کر کہانی کے آغاز میں ہی اس قدر تجسس پیدا کردیا ہے کہ قاری آگے کا حال جاننے کی دھن میں کہانی کے ساتھ آگے

وحشی سعید نمبر

بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ کہانی کا آغاز دو نوجوانوں سے ہوتا ہے جو آندھی اور بارش کے عالم میں ایک ویران و سنسان سڑک پر دوڑتے ہوئے ایک میخانے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں ایک سرور ہے اور دوسرا اس کا دوست وکی۔ دونوں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور بے عزتی کے احساس سے شدید ذہنی تناؤ میں مبتلا ہے اس کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے اور وہ شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ وکی اس کی تسلی بندھا رہا ہے۔ ظاہر ہے موجودہ صورت حال قاری کو یہ جاننے کے لیے بے قرار کر دیتی ہے کہ آخر سرور کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ شراب کو پہلی بار منہ لگانے پر مجبور ہے۔ جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے وحشی سعید نے اسے طول دینے سے گریز کیا ہے اور کم سے کم الفاظ میں ماحول کی مرقع کشی کر دی ہے البتہ کردار نگاری پر انھوں نے بہت زور دیا ہے اور چونکہ پوری کہانی نفسیاتی الجھن سے بنت کی گئی ہے لہٰذا یہ مشکل کام انجام دینے کے لیے انھیں کردار نگاری پر اور بھی زور دینا پڑا ہے اور یہ کام انھوں نے مرکزی کرداروں کے بطونی میں اتر کر اور ان کی فطری عمل واد و عمل کی آگہی حاصل کر کے بڑی شاقی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ناولٹ میں مکالموں کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وحشی سعید نے مکالموں کی صحبت اور ضرورت کو بھی دھیان میں رکھا ہے۔ ناولٹ میں موقع محل کے اعتبار سے جو مکالمے لکھے گئے ہیں وہ چست اور درست ہیں یہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب ناول ہے جو خوشگوار انجام پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔



ہندوستان میں اردو کے اہم ترین مراکز کی مانند جنت نظر کشمیر کو بھی گہوارہ اردو یا دبستانِ اردو زبان و ادب کہلانے کا امتیاز و افتخار حاصل رہا ہے۔ اس وادی گلپوش کی مہکتی مردم خیز مٹی سے ادب کے ایسے ایسے گہر آبدار و تابدار نمود و ورود پاتے رہے ہیں

لمحے

وحشی سعید نمبر

جنھوں نے میدانِ ادب میں معرکتہ الآرا کارنامے انجام دے کر ادبی حیثیت سے بھی دنیا بھر میں کشمیر کی قدر و وقعت اور شہرت و شہامت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ سیاست، صحافت، تاریخ ادب، تحقیق تنقید، ناول نویسی، شاعری اور افسانہ نگاری کوئی بھی صنف کیوں نہ ہو ہر فن کو منتہائے کمال پر پہنچانے اور نام کمانے والے قلم کاروں اور فنکاروں کی یہاں آج بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ صنف افسانہ کو ہی لے لیجیے کون نہیں جانتا کہ معروف وممتاز افسانہ نگار نور شاہ، ویریندر پٹواری، دیپک بدکی، حسن ساہو، زاہد مختار، مشتاق احمد وانی، بلراج بخشی، پریمی رومانی، ابن اسماعیل اور بشیر شاہ جیسے اور بھی متعدد افسانہ نگار وادئ کشمیر کے سر کا تاج بنے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام ممتاز ادیب اور ناول وافسانہ نگار وحشی سعید کا بھی ہے جو کئی دہوں سے فکشن نگاری میں تخلیقی کردار نبھاتے چلے آرہے ہیں۔ گو آپ بسبب دیگر مصروفیات عرصے افسانوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہ دے سکے لیکن سال گزشتہ اور سال رواں میں آپ نے اپنی ناولوں اور افسانوں کے مجموعے (ا) ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' اور (۲) ''سڑک جارہی ہے'' منظر عام پر لاکر اس کمی کا ازالہ کر دیا ہے۔

ناول اور مختصر افسانہ اصلاً دونوں ہی مغرب کی دین ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پہلے تو ودیشی افسانوں کے ترجموں میں دلچسپی لی گئی اور پھر ان میں قارئین کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھ کر طبع زاد ناول اور افسانے بھی تخلیق کیے جانے لگے۔ ''مراۃ العروس'' ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا طبع زاد ناول ہے جو ۱۸۷۹ء میں طبع ہوا۔ اسی طرح پہلا افسانہ ''نشے کی ترنگ'' ہے جس کے خالق قرۃ العین کے پدر محترم سجاد حیدر یلدرم ہیں اور غالباً ۱۹۰۲ء میں منظر عام کی زینت بنا تھا۔ جس کا مطلب صاف ہے کہ ہمارے یہاں فکشن نگاری کوئی قدیم صنف نہیں ہے اور اس کی عمر بمشکل سو سوا سال کے آس پاس ہی ہے اور اس دور کے فکشن نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، عبدالحلیم شرر

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اور سجاد حیدر یلدرم کے نام تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

اس دور ابتدا میں افسانوں سے مذہب کے فروغ، دینی و اخلاقی تعلیم اور قوم کی اصلاح کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ افسانے پند و نصائح اور وعظ و تبلیغ کے بارِ گراں سے بوجھل بس نام کے ہی ناول افسانے تھے جن میں ان کے متعینہ حدود اربعہ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ناول و افسانہ کو حقیقتاً ناول و افسانے کا پیکر عطا کرنے اور ان کو زندگی کے حقائق سے روشناس کرنے کا فریضہ منشی پریم چند، سدرشن اور مرزا ہادی رسوا نے ناول امراؤ جان ادا لکھ کر ادا کیا۔ پھر ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ کچھ ایسے ذہین ادیب یکجا ہو گئے جن کے پروردگارانہ، آفریدگارانہ، خلاقانہ، فنکارانہ فشوں کارانہ اور ساحرانہ و والہانہ تخلیقی رویئے نے فکشن نگاری کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا اور ایسا معیاری ادب پیش کیا جسے دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں فخریہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب ترقی پسندی کو معزول کر کے جدیدیت نے اقتدار سنبھالا اور عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو ادب کا روپ رنگ ہی تبدیل ہو گیا۔ افسانہ سے پلاٹ کہانی، کردار سازی اور واقعاتی تسلسل جیسے سبھی عناصر عضو معطل کی مانند تراش کر دور پھینک دیئے گئے اور یاسیت، قنوطیت اور وجود کی لایعنت کو موضوع بنا کر ترسیل و ابلاغ سے عاری افسانے تخلیق کیے جانے لگے۔ یہ دور مختصر ثابت ہوا۔ قارئین افسانہ سے متنفر ہو کر جب دور چلے گئے تو پھر سے افسانے میں کہانی، پلاٹ اور باقاعدہ آغاز و انجام کی روایت کو دہرایا جانے لگا۔ وحشی سعید نے جب آنکھ کھولی تو یہ جدیدیت کے عروج کا دور تھا۔ اس وقت ان کے ہم عصر جس انداز کے افسانے تخلیق کر رہے تھے انھوں نے بھی افسانوں کی تخلیق میں ہی رنگ و آہنگ اپنا کر کہانی پلاٹ اور ترسیل کے روایتی عناصر کو لائق توجہ نہ سمجھا۔ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میں شامل افسانے ان کے اسی دور کی یادگار ہیں۔ افسانہ کے حوالے سے اس دور کو ہم سریندر پرکاش، بانی، بلراج کومل اور زیب غور کے دور سے منسوب کر

سکتے ہیں۔ بعد میں جب جدیدیت کا یہ طوفان سر سے گزر گیا تو دیگر افسانہ نگاروں کی طرح وحشی سعید نے بھی افسانہ میں کہانی اور پلاٹ والی وہی پرانی ڈگر پکڑ لی۔ لہٰذا ''سڑک جا رہی ہے'' میں مشمولہ افسانے اس بدلی ہوئی نوعیت کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں جن کرداروں کو پیش کیا گیا ہے وہ حقیقی دنیا میں پائے جانے والے انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، ایثار و انکسار کے مجسمے بھی ہیں اور بہیمانہ ظلم و ستم کے شیطانی پیکر بھی مہر و وفا کے پتلے بھی ہیں اور جور و جفا کے علمبردار بھی، جنھیں حقیقی رنگ روپ دینے میں وحشی سعید نے کردار نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ ان کے اس مجموعے ''سڑک جا رہی ہے'' میں شامل افسانوں میں آغاز انجام کہانی پلاٹ ماجرا منظر نگاری اور کردار سازی جیسے سبھی اہم عناصر اپنا کام بحسن و خوبی انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی سادگی لہجے کی شائستگی اور اسلوب کی دلکشی کے علاوہ روانی اور مکالموں کی چستی بھی ان کے فنی رویئے کی خاص الخاص خوبیاں ہیں جن کی مدد سے کہانی برق رفتاری سے اپنی منزلیں سر کرتی رہتی ہے ساتھ ہی قاری کو بھی اپنی مضبوط گرفت میں ہلنے ڈلنے کا موقع نہیں دیتی۔ ان کے افسانے دار و گیر سماج میں رونما ہونے والے واقعات اور زندگی کو درپیش مصائب و مشکلات کے رد عمل کا شاخسانہ بھی ہیں اور آئینہ دار بھی۔

رومانویت حسن آفرینی پر دال ہے اور صالح ادب بذات خود حسن ہے۔ رومانویت کا ایک سرا اگر وصل کی نشاط آگہی کی جانب اشارہ کرتا ہے تو دوسرا سرا ورڈ سورتھ کے برخلاف ارسطو کی Tragedy کے نظریئے Catharsis سے بھی ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ یعنی بذریعے المیہ ذات کا خوف و ہراس اور خود پرستی و خود ترحمی کے ناخوشگوار احساسات اگر ابھر کر ذات سے خارج ہو جائیں تو Catharsis یعنی تزکیہ نفس کا سبب بن کر بعد میں صاحب المیہ کے صبر و سکون کا ضمانت نامہ بن جاتے ہیں۔ یہ تمہید میں نے مجموعے

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

کے اولین افسانے ''سائے کی لاش'' کے تجزیئے اور تحلیل نفسی کے لیے باندھی ہے کہ کہانی کا ہیرو جو مصور ہے اپنی پسندیدہ شکل والی کسی حسینہ کی تصویر مکمل کرنے کا آرزو مند ہے اور اس سے قبل کہ تصویر مکمل ہو وہ حسینہ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تیسری حسینہ بھی اسے بوڑھا قرار دے کر اس سے علاحدگی اختیار کرتی ہے۔ اس طرح سات سال کی عمر سے اس کے دل میں پلنے والی تصویر مکمل کرنے کی آرزو عہد شباب گزر جانے کے باوجود اس کی ادھوری تصویر کی ہی طرح ادھوری ہی نہیں رہتی بلکہ ہمیشہ کے لیے مر جاتی ہے۔ وہ آرزو جو امید وبیم کی کشمکش کے سبب اک عمر مصور کے حق میں سوہان روح بنی رہی اور اسے خوف وہراس اور خود ترحمی کے اذیت رساں احساسات سے گزارتی رہی اب اس آرزو کی موت کا المیہ ارسطو (Aristotle) کے نظریہ المیہ کے مطابق مصور کی راحت اور صبر وسکون کا ضامن بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی صرف ایک لمحہ انسان کی عادت ہی کیا اس کی فطرت ثانیہ تک کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ وحشی سعید نے تحلیل نفسی کے عمل کو بروئے کار لا کر ایک نوجوان کے وسیلے سے اپنے اس نظریئے کو منطقی استدلال سے ثابت کر کے دکھایا ہے۔

کہانی کا عنوان ہے ''ہنسی کا قتل''، ایک نوجوان جو کہانی کا ہیرو بھی ہے، اس کا کام ہی ہمہ وقت ہنسنا ہنسانا ہے۔ وہ آفس میں لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے۔ پھر جب ایک سریتا نام کی حسین سی لڑکی اپوائنٹ ہو کر دفتر میں آتی ہے تو وہ اس سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ دونوں تنہائیوں میں ملتے ہیں، مگر بے تکلفی کے باوجود بھی وہ ہر بار اسے اپنے احمریں لبوں کا بوسہ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ اسے خرافات قرار دیتی ہے۔ پھر ایک دن وہ جب انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس کا بوسہ لینے میں ناکام ہو جاتا ہے تو بپھرے ہوئے جذبات پر قابو حاصل کرنے کے لیے وہ شراب کا

وحشی سعید نمبر

سہارا لیتا ہے اور نشے کے عالم میں اپنے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اس کی کنواری بہن اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی اور اس کی نصف چھاتیاں بلاؤز سے باہر ابھری ہوئی تھیں اور اس کے خمیدہ لب بھی سریتا کی طرح سرخ تھے۔ وہ اس پر جھکتا چلا گیا تاکہ اسے باںہوں میں کس کر اور اسے سریتا مان کر اس کے ہونٹوں کا رس چرالے کہ ناگہاں اور ایکا ایکی اس کا ضمیر جاگ اٹھا اور نہیں کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے سنجیدہ ہو چکا ہے۔ افسانہ بھنگی انسان کی ازلی بدقسمتی اور معاشرتی و معاشی جکڑ بندیوں کے جبر و استعداد پر کاٹ دار طنز کرتی ہے۔ ''جب ممبئی جھک جائیگی'' بھی سفاک امیروں کی بدعنوانیوں اور خودغرضانہ وخود پرستانہ رویوں کی تنقید کا درجہ رکھتی ہے۔ ''سود'' ایک ایسی بے آسرا لڑکی کی کہانی ہے جو دولت حاصل کر کے شہر شہر گھومنے کے شوق میں ایک دولت مند عورت کو بچہ دینے کے لیے خود کو ایک نوجوان کے حوالے کر دیتی ہے۔ وہ صرف پیشہ چاہتی ہے، اس لیے شادی سے انکار کر دیتی ہے، مگر حمل گر جانے پر وہ ملنے والی دولت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ وہ نہ گھر کی رہی ہے نہ گھاٹ کی۔

مجھے اور بھی بہت سی کہانیوں کا جائزہ لینا تھا مگر طوالت مانع آگئی، اس لیے اتنے پر ہی مکتفی ہوتا ہوں، الوداع۔



کشمیر کے ناول وافسانہ نگار جناب وحشی سعید کا ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' اور افسانوں پر مشتمل مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میرے پیش نگاہ ہے۔ جہاں ان کی کتابوں کے بوالعجب ومنفرد سرنامے دعوتِ فکر دیتے ہیں وہیں ان کا نامِ نامی بھی خیال انگیز ہے جو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عام طور پر شعرا وادباء اپنے خاندانی ناموں کو لاحقوں سے جوڑ دیتے ہیں اور وہ لاحقے ہی تخلص کہلاتے ہیں جیسے اسداللہ خاں غالبؔ، نواب مصطفیٰ

خاں شیفتہ اور رگھوپتی سہائے فراق۔ ان میں ایسا تو کسی نے بھی نہیں کیا کہ تخلص کو اولیت اور خاندانی نام کو ثانویت کے درجے پر رکھا ہو۔ ہمیں یہ مان لینے میں کوئی عذر نہیں کہ بعض فنکاروں کو بزعم ندرت وانفرادیت تخلص شعار کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا۔ اگر وحشی سعید ہم سے اپنا تعارف سعید وحشی کے نام سے کراتے تو کوئی بات ہی نہ تھی مگر وحشی کو خاندانی نام پر اولیت دینا یعنی تخلص کو نام اور نام کو تخلص بنا دینا تو ایسا انوکھا کارنامہ ہے جو پہلی بار ہی نگاہ میں آیا ہے۔

وحشی سعید نے وحشت وجنون کی عظمت ورفعت کو بڑی گہرائی وگیرائی سے سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے نام وحشی اور تخلص سعید پر بجا طور پر فخر ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل مدعا پر آنا یعنی ان کے افسانوں پر مبنی مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' اور ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' کو موضوعِ گفتگو بنانا بھی اپنا فرضِ اولین خیال کرتے ہیں۔ وحشی سعید وادیِ گل وگلزار اور جنت نظیر کشمیر کی خاک مردم خیز سے نمود وورود پانے والی ایک ایسی باغ وبہار شخصیت کا نام ہے جو سیرت وکردار کی لائق تحسین افضل واعلیٰ خصوصیات سے مختص ہے۔ وہ ایک کشادہ ذہن، وسیع المشرب، روادار، خوش گفتار، وضع دار، رقیق القلب، دردمند انسان دوست واقع ہوئے ہیں۔

وحشی سعید کو سِن بلوغ میں چشم شعور کے وا ہونے پر ادب کا جو منظر نامہ دیکھنے کو ملا وہ ۱۹۸۰ء کا جدیدیت کے نظریات اور نئے طور طریق کی اساس پر تخلیق کئے گئے مخصوص ایسے ادب کا منظر نامہ تھا جو ترقی پسند ادب سے سرتاسر مختلف تھا۔ بیانیہ اسلوب کا قلعہ قمع ہو چکا تھا اور اس کے شہہ نشیں پر استعارہ اور علامت نے اپنا قبضہ جما لیا اور افسانہ نگاروں نے شعور کی لہر کے بہاؤ میں بہہ کر بغیر کہانی اور پلاٹ کے بغیر استعاراتی اور علامتی انداز کے افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے، جس کی سرپرستی کا فریضہ شب خون کے ذریعہ شمس الرحمٰن فاروقی انجام دے رہے تھے۔ یہ منتشر ومتضاد اور بے ہنگم

وحشی سعید نمبر

خیالات پر مبنی افسانے دور از کار علامتوں کی بھر مار سے نثر نظم کی سی شکل میں ظہور پذیر ہو کر ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ کھڑا کر دیتے تھے مگر اس کی افسانہ نگاروں کو مطلق بھی پروا نہیں تھی۔ فطری بات ہے ہر فنکار اپنے ہمعصر فنکاروں سے متاثر ہوتا ہے لہٰذا وحشی سعید بھی ان سے متاثر ہوئے۔ ان کی ناول اور افسانوں کے مجموعے کے عناوین ''پتھر پتھر آئینہ'' اور ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' بذات خود میرے اس دعوے کی پختہ دلیل ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کی پہلی دو کہانیاں ''کشکول'' اور ''آب حیات'' بھی اگرچہ علامتی اور استعاراتی کہانیاں ہیں، مگر واقعاتی تسلسل کی موجودگی ان کے افہام و تفہیم کو مسئلہ نہیں بننے دیتی جبکہ باقی تمام مختصر کہانیاں پلاٹ کہانی اور واقعاتی تسلسل سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے قاری کو اپنے ذہن پر زور دینے اور روح المعانی تک رسائی کے لیے اپیل کرتی نظر آتی ہیں۔

وحشی سعید نے عام طور پر الف لیلوی ماحول سے استعارے اور علامتیں اخذ کی ہیں جس سے ان کی کہانیاں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھ لی جاتی ہیں اور مطلب اگر نہ بھی سمجھ میں آئے تب بھی قاری مطمئن ہو جاتا ہے اور غور کرنے پر وہ کچھ نہ کچھ مطلب بھی اخذ کر لیتا ہے۔ مجموعے کی پہلی کہانی ''کشکول'' میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ حد سے زیادہ دولت عیش و عشرت اور رنگ و رامش کی محفلیں اسے دردمندی، غمگساری اور رقیق القلبی جیسی انسانیت خیز فطری حسیات سے محروم کر کے اسے پتھر کا بنا دیتی ہیں اور پتھر میں پھنسا آئینہ چاہ کر بھی پتھر کو پگھلا کر اسے موم بنانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ پتھر اور آئینہ دونوں کا تحفظ اسی میں ہے کہ وہ اپنی اپنی دنیاؤں تک ہی محدود رہیں۔

افسانہ ''آب حیات'' زمان و مکاں اور زندگی سے انسان کے غیر معمولی عشق و عاشقی کا پروردگارانہ خلاقانہ آفریدگارانہ، ہنرورانہ، فنکارانہ، فسوں کارانہ اور ساحرانہ و والہانہ اظہار ہے۔

وحشی سعید نمبر

کھاتے پیتے نواب غیاث الدین کے ایک دوست تو میر علی تھے جو اپنی بے حساب دولت کو خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ دوسرا دوست ان کا ایک نوجوان تھا جو نواب غیاث الدین کی ذاتی لائبریری کی کتب میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے سبب ان کا رفیق بن گیا تھا۔ ایک دن ایک خستہ سی کتاب میں ہمیشہ زندہ رہنے والا نایاب نسخہ ان کے ہاتھ لگ گیا۔ ہمیشہ زندہ رہنا اور کبھی نہ مرنا، نہ صرف نواب غیاث الدین کی تمنا تھی بلکہ میر علی اور نوجوان بھی نسخے کی بابت سن کر آب حیات حاصل کرنے کے لیے بری طرح بے چین ہو اُٹھے۔ تلاش کے اس امر میں میر علی کی دولت کام آئی اور جدید آلات سے لیس ایک سمندری جہاز بن کر تیار ہو گیا جس میں سوار ہو کر وہ تینوں ساحل سے بہت دور سمندر میں بہت آگے تک نکل گئے۔ نسخے کے مطابق انھوں نے یکے بعد دیگرے سبھی مرحلے طے کر لیے اور زیر آب پہاڑ کے دہانے میں داخل ہو کر اس دنیا میں پہنچ گئے جہاں آب حیات ان کا منتظر تھا۔ انھوں نے آب حیات سے پیاس بجھائی اور جس طرح وہاں پہنچے تھے اسی طرح اپنے مقصد میں فتح یاب ہو کر واپس بھی آگئے۔ سب کے سب بہت خوش تھے کہ وہ قیامت تک زندہ رہ کر دنیا اور دنیا کے عیش و آرام سے خوب خوب مستفیض ہوں گے اور پھر ایک دن ایک پرندہ ان کے قریب آیا اور چونچ سے اخبار چھوڑ کر چلا گیا۔ تینوں نے دیکھا ان تینوں کی اخبار میں تصویریں چھپی تھیں اور نیچے لکھا تھا یہ تینوں ایک ٹرین حادثے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ غرضکہ ثابت کر دیا ہے کہ آب حیات محض مفروضہ ہے۔

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' سے مراد ہے ایسے انسانوں کا جزیرہ جنھیں خوف و دہشت نے گونگا بنا دیا ہے اور وہ کنوارے الفاظ سے مشابہ ہیں۔ کتاب ''پتھر پتھر آئینہ'' میں دو ناولیں پیش کی گئی ہیں۔ دونوں نفسیاتی ناولیں ہیں اور دونوں میں اس نفرت کا ذکر ہے جو رعونت و انا کی دین ہے۔ بعد میں ایک خاص موقع پر نفرت کا سیاہ لبادہ اپنے آپ اُتر

جاتا ہے اور آپ کی محبت روبرو ہو کر رفاقتوں کی گہر پاشیاں کرنے لگتی ہے۔ مجموعہ ''خواب اور حقیقت'' میں ۲۷/افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ ان میں دو ایک کو چھوڑ کر سبھی علامتی رنگ و آہنگ میں رچے بسے ہیں۔ ان کی کہانیاں ''کب آئے گا سقراط''، ''میرا قاتل میرا مسیحا''، ''نجات دہندہ''، ''اپنا عکس اپنا آئینہ''، ''میٹھا چشمہ اور میں''، ''عجب پریم کہانی''، ''لمبا آدمی چھوٹا قد'' اور ''وہ صبح کب آئے گی'' میں ''عجب پریم کہانی'' کو چھوڑ کر سبھی کہانیاں علامتی رنگ کی با مقصد اور معنی آفرینی کہانیاں ہیں۔ کسی کہانی میں دوسروں کو امن و خوش حالی کے جواب دکھانے والے ایک ایسے سچے رہنما کا ذکر ہے جسے شاطر تخریب کار زیر کر لیتے ہیں۔ کوئی کہانی جبر و ظلم کے گھنے اندھیروں کو صبح نو کے اجالوں کی بشارت دیتی ہے۔ کوئی کہانی انا کے قیدی، کسمپرسی پر اظہار افسوس کرتی ہے اور تصنع پسند پر طنز۔ کسی کہانی کا تانا بانا اس گمراہ بھیڑ کی حالت زار سے بُنا گیا ہے جو کھلی ہوا میں سانس لینے کو ترس رہی ہے اور رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ان کے افسانوی مجموعے ''سڑک جا رہی ہے'' کے ۳۰/افسانوں میں کئی ایک بڑے معرکتہ الآرا فسانہ میں جو زندگی کے مقاصد کی تکمیل میں اعانت و استعانت کرنے والے مقصدی اور معنی آفرین افسانے ہیں جو ہر حال میں زندہ رہنے اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ سائے کی تلاش، جمود کا جنازہ، ہڑتال، یہ تہذیب یافتہ لوگ اور سڑک جا رہی ہے، افسانہ نگار کی وسعت نگاہ، سماجی شعور اور گہری بصارت و بصیرت کی غماز ایسی موثر اور بامعنی کہانیاں ہیں جو حیرت و مسرت ہی نہیں دعوتِ فکر بھی دیتی ہیں۔ ابھی ایک طویل مفر اُن کے قلم کو طے کرنا ہے، اللہ انھیں کامیاب و کامران کرے۔



(۱)

وحشی سعید بحیثیت ناول نگار

☆ سیفی سرونجی

پچھلے دس پندرہ سالوں میں اتنے خوبصورت اور معیاری ناول شائع ہوئے کہ ان پر نہ صرف ابھی تک گفتگو جاری ہے بلکہ ان کی گونج دیر تک سنائی دے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک بار پھر فکشن کا سنہری دور آ گیا ہے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ فکشن کا سنہری دور ترقی پسند تحریک کا ہی دور تھا، بعد میں جدیدیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ناول اور افسانے سے کہانی پن یعنی اس کی روح چھین لی اور علامتی اور ایسی گنجلک تحریریں وجود میں آنے لگیں کہ اس سے فکشن پڑھنے والا قاری ہی روٹھ گیا۔ رفتہ رفتہ جدیدیت اپنی بے معنی تحریروں کے بوجھ تلے دبتی چلی گئی اور ایک بار پھر افسانے اور ناول میں کہانی پن نظر آنے لگا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ افسانے اور ناول میں بھی ہمیں زندگی رقص کرتی نظر آنے لگی۔ پروفیسر انیس اشفاق لکھتے ہیں:

> ''نئی ادبی فکر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس تنقیدی رویئے کی روشنی میں معاصر ناولوں کا جائزہ لینے سے قبل اس پہلو کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ جدیدیت کے شدید نفوذ کے زمانے میں شاعری کا بول بالا تھا اور یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ ہمارا بیشتر جدید تنقید شاعری ہی کے گرد گھومتی رہی، اس زمانہ میں افسانہ کم لکھا جا رہا تھا اور ناول تو معدوم صنف میں شمار ہونے لگا تھا۔ ۷۰ء کے بعد کہانی پیش منظر میں آئی اور ان کے کھوئے ہوئے عناصر کی واپسی کے ساتھ آئی، جو کہانی کی اصل شناخت ہیں۔ پھر ہم ناول کی طرف متوجہ ہوئے اور اس طور متوجہ

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ہوئے کہ بیسویں صدی کے آخری پندرہ سالوں میں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ ناول ہی کا زمانہ ہے۔نوجوان لکھنے والوں میں کم وبیش فکشن کے ہر نمائندہ ادیب نے اس صنف کی طرف توجہ کی، یہی نہیں ان ادیبوں کی دیکھا دیکھی بعض پرانے ادیب بھی ناول کی طرف مائل ہوئے اور یوں اچھے خاصے ناولوں کی تصنیف ہوئی''۔

یہاں ہمیں ناول کی تاریخ نہیں لکھنا بلکہ چند ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے وحشی سعید کے ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' پر گفتگو کرنا ہے۔اب تک میں نے جن ناولوں کو پڑھا ہے یا ان پر گفتگو کی ہے،ان میں اقبال متین کا چراغ تہہ داماں، اقبال مجید کا نمک، غضنفر کے ناول پانی، کینچلی، شوراب، مانجھی، ترنم ریاض کا مورتی، پیغام آفاقی کا مکان، پلیتہ، صادقہ نواب سحر کا کہانی کوئی سناؤ متاشا،ان کے علاوہ رحمٰن عباس کا خدا کے سائے میں آنکھ مچولی، صوفیہ انجم تاج، آنندلہر، نورالحسنین، انل ٹھکر، شائستہ فاخری کے علاوہ جس ناول نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ہے مشرف عالم ذوقی کا ناول آتش رفتہ کا سراغ اور اب تازہ ناول وحشی سعید کا ''پتھر پتھر آئینہ''۔ان ناولوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آج کے ناول نگار اپنے عہد کی ترجمانی اپنے پورے فنی لوازمات کے ساتھ کر رہے ہیں۔ان کے ناولوں میں وہ سب کچھ ہے جو کسی دوسری زبان کے ناولوں میں ہے اور یہ بات پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صحیح ثابت ہوئی کہ اکیسویں صدی ہے، وحشی سعید ہم عصر ناول نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ان کے ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان بہت صاف ستھری ہے کہ اسے پڑھتے وقت قاری کی نہ صرف دلچسپی برقرار رہتی ہے بلکہ ناول میں ایک تجسس ہے کہ اب کیا ہوگا؟ جو قاری کو آخر تک باندھے رہتی ہے۔حالانکہ ناول کے موضوع میں کوئی نیا پن نہیں ہے لیکن یہ ناول نگار کی فن کاری ہے کہ اس میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ سماجی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ ناول کو ایک اہم موڑ پر ختم کر کے اسے بہت ہی معیاری بنا دیا ہے اور انسانی قدروں کے عروج و زوال کی ایک ایسی تاریخ لکھ ڈالی کہ اسے پڑھ کر قاری میں ترقی کا جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے اور دلوں میں محبت، ایثار قربانی کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔

اس ناول کے خاص کردار تو سرور اور امیتا ہیں لیکن سرور کا دوست وِکی جو قدم قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے بلکہ اسے ترقی کرنے اور بڑا آدمی بننے کے خواب دکھاتا ہے۔ امیتا کے والد شہاب الدین ہیں اور امیتا کا منگیتر ممتاز احمد بیگ ہے، یوں تو اس ناول میں اور بھی کردار ہیں لیکن مرکزی کردار امیتا اور سرور ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسی کہانی ہے جو کالج سے شروع ہوتی ہے جہاں سرور، وکی اور اس کے دوست کالج کے ہونہار طالب علموں میں سے ہیں لیکن اچانک امیتا کے آنے سے کالج کی شان بڑھ گئی کہ وہ ایک بہت ہی خوبصورت اور مالدار گھرانے کی لڑکی ہے، کئی لڑکے اس کی جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کرتے ہیں، اسے اپنی خوبصورتی اور مالدار ہونے پر فخر ہے۔ کالج کا ہر لڑکا اس سے بات کرنے اور اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سرور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا کہ اسے پڑھائی کر کے خود کو اور اپنے گھر والوں کو غربت کے دلدل سے باہر نکالنا ہے۔ اسے اپنی غریبی کا بھی احساس ہے، اس لیے وہ لڑکیوں کے چکر سے دور رہنا چاہتا ہے۔ امیتا اس کے برتاؤ اور اس پر توجہ نہ دینے کو اپنی توہین سمجھتی ہے اور بار بار اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی کچھ جملہ کس دیتی، کبھی اس کی غریبی کا مذاق اڑاتی اور کبھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتی اور سرور اپنے غصے کو ضبط کر کے رہ جاتا۔ اس کے اندر انتقام کا جذبہ ابھرتا، ایسے میں وِکی سرور کو سمجھاتا کہ اس کا جواب یا انتقام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم اپنی پڑھائی میں نہ صرف ہمیشہ اول آؤ بلکہ ایک بڑے ڈاکٹر بن کے دکھاؤ، سرور دن رات

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

پڑھائی میں جٹ گیا اور ہر امتحان میں اول آتا رہا اور ایک دن بڑا ڈاکٹر بھی بن گیا۔ اس درمیان ایتا سے دو ایک بار ملاقات بھی ہوئی لیکن اس کے رویئے میں کوئی فرق نظر نہیں آیا جبکہ سرور اسے دل ہی دل میں چاہنے لگا تھا لیکن اس کے رویئے سے اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ایک دن ٹرین کے ایک سفر میں اس کی ملاقات ممتاز احمد بیگ سے ہوئی اور دوسری ملاقات جب کئی دن بعد ہوئی تو اس نے ایتا کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان سے ملئے یہ ایتا ہیں، میری منگیتر۔ سرور کے دل پر ایک جھٹکا لگا لیکن ایتا کا اب بھی وہی طنز کرنے کا انداز نہیں بدلا۔ ارے صاحب! انھیں کون نہیں جانتا، سرور کے دل پر ایک اور چوٹ لگی۔

وقت گزرتا رہا اور سرور ایک سرکاری ہاسپٹل میں ڈاکٹر ہو گیا۔ سرور میں انتقام کی آگ بڑھتی گئی۔ دراصل ایتا اور سرور کے درمیان ایک انا کی جنگ تھی، دونوں اپنی اپنی جگہ انا کے خول میں بند تھے۔ باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ سرور اس کے ہر طنز کو چیلنج سمجھ کر قبول کرتا رہا اور اپنا ہر قدم بڑھاتا گیا۔ ایک دن ممتاز احمد صاحب اپنے والد کی طبیعت خراب ہونے پر اسی کے ہاسپٹل میں لے آئے جہاں سرور ڈاکٹر تھا۔ اس نے بڑی دلجوئی سے ان کا علاج کیا، ساتھ ہی ایتا کو بھی، سرور کچھ ہدایتیں دے رہا تھا کہ ایتا نے پھر ایک بھرپور وار کر دیا، ''رعب ایسے جھاڑتا ہے جیسے اس نرسنگ ہوم کا مالک ہو'' سرور ایک بار پھر اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ دراصل ایتا شروع ہی سے سرور سے محبت کرتی تھی، سرور نے اسے لفٹ نہیں دی، تو وہ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور جب جب اس سے ملاقات ہوتی وہ زہر اگلتی رہی، جسے سرور نے اپنی توہین سمجھا۔ ممتاز احمد بیگ سے منگنی تو اس کی ہو گئی تھی لیکن ممتاز احمد بیگ کا پورا خاندان مکار تھا، لالچی تھا، شہاب الدین کی دولت پر ان کی نظر تھی۔ منگنی ہی لالچ میں کی تھی۔ انھوں نے شہاب الدین کو اپنی پرفریب باتوں سے ایسے بزنس میں لگا دیا کہ تھوڑے ہی دن میں اس کمپنی کا دوالیہ

نکل گیا اور شہاب الدین سڑک پر آ گئے۔ حد تو یہ ہے کہ شہاب الدین کا بیٹا بھی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ ایتا کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ شہاب الدین کی حویلی نیلام ہو گئی۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور صدمے سے ان پر اٹیک آ گیا۔ ایسے میں سرور جس نے اب نیا نرسنگ ہوم بھی کھول لیا تھا، کام آیا اور ہاسپٹل میں بھرتی کر لیا۔ شہاب الدین اب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور انھیں فکر تھی تو بس اپنی بیٹی کی، وہ سرور کے اخلاق و کردار سے بہت متاثر تھے، اکثر ملاقاتوں میں وہ اس کا اظہار بھی کر چکے تھے اور اب تو اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ ایک دن سرور کو تنہا دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھا اور کہنے لگے بیٹا! تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے، کیا مجھ پر ایک احسان اور کر سکتے ہو؟ آپ حکم فرمائیں، میں ضرور کوشش کروں گا۔ میری بیٹی میرے بعد تنہا ہو جائے گی، اگر اس کے لیے کوئی لڑکا میری زندگی ہی میں مل سکے تو اس کا نکاح کرا دو، سرور نے کہا...... کیا آپ مجھے اپنی فرزندی میں لے سکتے ہیں؟ شہاب الدین خوشی سے کھل اُٹھے۔ بیٹا اس سے بڑھ کر میرے لیے اور فخر کی بات کیا ہوگی؟ کہ میری بیٹی تم جیسے شریف انسان کے گھر جائے۔ سرور نے کہا کہ لیکن اس سے پہلے آپ کو اپنی بیٹی کی مرضی بھی جاننا ضروری ہے۔ ایتا نے باپ کی مجبوری دیکھ کر اقرار کر لیا اور چند دوستوں اور رشتہ داروں نے بہت سادگی کے ساتھ ایتا کا نکاح سرور سے کر دیا۔

آج وہ بہت خوش تھا کہ ایتا کا سارا غرور نکل چکا تھا اور اس کے دل کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی، جیسے ہی وہ حجلہ عروسی میں پہنچا، ایتا نے کہنا شروع کیا کہ تم کامیاب ہو گئے اور میں ہار گئی، لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ تم میرے جسم کا تو استعمال جیسے چاہو کر سکتے ہو لیکن میری محبت حاصل نہیں کر سکو گے۔ سرور یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ اس کی ساری خوشی خاک میں مل چکی تھی۔ اس نے بھی عہد کر لیا کہ جب تک ایتا خود اپنی راضی خوشی سے اس کی

نہیں ہوگی، وہ اس کو چھوئے گا تک نہیں۔ کئی مہینے گزر جاتے ہیں، سرور اس کے کمرے تک میں نہیں جاتا۔ ادھر شہاب الدین کا انتقال ہو جاتا ہے۔ امیتا اپنی تنہائی کے درد کو سہ نہ سکی اور جلدی ہی ٹی بی کی مریض ہوگئی۔ اب اسے شدت کے ساتھ سرور کی یاد ستانے لگی تھی لیکن کرتی بھی تو کیا؟ جب ایک دن وہ بے ہوش ہوگئی تو اس کو ہاسپٹل میں ڈاکٹر ورما نے اس کا معائنہ کیا، تو وہ حیران رہ گیا کہ وہ ٹی بی جیسے مرض میں مبتلا ہو چکی تھی۔ فوراً سرور کو اطلاع دی گئی، اس سے پہلے کہ میں اس ناول کے اختتام تک پہنچوں، یہاں ناول کا ایک اقتباس دیکھئے کہ وہ تنہائی کے دُکھ سہتے سہتے اس حال میں کیوں پہنچی؟

''امیتا اپنی زندگی میں شدید تنہائی محسوس کرنے لگی تھی، تنہائی سے خوف کھانے لگی، تنہائیوں سے دور بھاگ جانے کے لیے بے نام خط لکھتی...... 'کہاں ہو تم؟ میں اکیلی ہوں، تنہا ہوں، میں درد میں مبتلا ہوں، میری جوانی دم توڑ رہی ہے، میں مر جاؤں گی، کیا تم میرے حالات سے واقف ہو جاؤ گے؟ کیا تم مجھ کو ان اندھیروں سے نکال لو گے؟ اُف خدایا! کون اسے بتائے گا؟ یہ کیا، میں اپنے سائے کو پہچان پائی ہوں۔ ہاں یہ وہی سایہ ہے، جس نے میری دنیا میں آگ لگا دی، ڈائن ڈائن! جس نے میری ہر خوشی چھین لی، کہاں ہو تم؟ کیا میری آواز تم تک پہنچ پائے گی؟ کیا تم سن رہے ہو؟ ایسی کیا بے رخی، بتاؤ نا کب آؤ گے؟ کب آؤ گے؟ کب مجھے اندھیروں سے نکالو گے؟ دیر نہ کرنا ورنہ یاد رکھو میں مر جاؤں گی''۔

اس طرح وہ سرور کی یاد میں تڑپتی رہی اور بے نام خط لکھتی رہی۔ جب ڈاکٹر ورما نے بتایا کہ سرور تم ڈاکٹر ہو کر اتنے بے خبر کیسے ہو سکتے ہو کہ تم اس کے ساتھ سوتے رہے

اور تمہیں خبر تک نہ ہوئی کہ وہ ٹی بی کی مریض بن چکی ہے۔ سرور فوراً دوڑا دوڑا ایتا کے پاس پہنچا اور دونوں گلے ملے ایک دوسرے سے معافی مانگی۔ اس طرح وحشی سعید نے اس ناول کو ایک اہم ناول بنا دیا کہ اس کا اختتام بہت زوردار ہے۔ ورنہ ناول پڑھتے پڑھتے اچانک یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ پتہ نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن یہ ناول نگار کا فنی کمال ہے کہ اس نے ناول کو اور کہانی کے اختتام کو المیہ بنا دیا اور بڑی خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچایا۔

وحشی سعید کے اس ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زبان بہت صاف ستھری اور اندازِ بیان بہت اچھا ہے، پڑھتے وقت نہ صرف قاری بوریت سے بچ جاتا ہے بلکہ جب تک ناول ختم نہ کرلے اس کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے۔ یہ ایک اچھے ناول کی بڑی خصوصیت ہوتی ہے، جو قاری کو باندھے رکھے اور وحشی سعید اس میں بہت کامیاب ہیں۔ ''پتھر پتھر آئینہ'' کتاب تو ایک ہے لیکن اس میں ''پتھر پتھر آئینہ'' کے علاوہ ایک اور مختصر ناول ''ایک موسم کا خط'' شامل ہے لیکن میں نے صرف ''پتھر پتھر آئینہ'' پڑھ کر ہی اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔

بلاشبہ وحشی سعید نے اس ناول میں محبت کی ایک انوکھی کہانی کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے، جو ان کے ناول کے فن پر مہارت کا ثبوت ہے۔ اس طرح انھوں نے اُردو ناولوں کی بھیڑ میں ایک اچھے ناول کا اضافہ کیا، جس کے لیے میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔



(۲)

وحشی سعید اپنے افسانوں کی روشنی میں

☆ سیفی سرونجی

وحشی سعید فکشن کا ایک اہم نام ہے جو نام ونمود، شہرت سے بے نیاز صرف اپنے فن پر اعتماد کرتے ہیں۔ ان کی چند کہانیاں میں تحریک ادب میں پڑھی ہیں اور اس وقت میرے سامنے ان کے افسانوں کے تین مجموعے ہیں: ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جا رہی ہے'' اور ''خواب حقیقت''۔ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میں شامل کہانیاں کشکول، آبِ حیات، مٹھی، اڑان، آسمان، آتش بیاں، طلسم کلام، پہچان، خودسری، گمراہی، سکوت درسکوت وغیرہ کہانیاں جب پڑھیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ پر ایک جہاں روشن ہو گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحشی سعید کی کہانیاں ایک نئی ٹیکنک سے آشنا کراتی ہیں۔ ان کے یہاں سیدھے سپاٹ انداز میں کہانیاں نہیں ملتیں بلکہ ان میں نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کا عمل ہے جسے انھوں نے اشاراتی زبان میں بیان کیا ہے اور فلسفیانہ انداز اپنایا ہے۔ افسانہ ہو یا شاعری ہو، قاری اب نیا کچھ چاہتا ہے۔ وہ اس روایتی شاعری یا افسانے سے اوب چکا ہے جن میں ہمارے شاعروں، ادیبوں نے عشق ومحبت کی فرضی کہانیاں سنا سنا کر قاری کو بیزار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت کا تقاضہ بھی ہے۔ اب منشی پریم چند کا زمانہ نہیں ہے کہ جب ایک غریب کسان کو کمبل خریدنے تک کے پیسے نہیں ہوتے تھے، نہ اب لیلیٰ مجنوں جیسا عشق کرتا ہے۔ سائنس اور مشین اس دور میں انسان ذہنی سکون سے محروم ہو گیا ہے ایسے ماحول میں وحشی سعید کی کہانیاں انسانی ذہن کو سکون بھی مہیا کراتی ہیں اور قاری کو غور وفکر کی دعوت بھی دیتی ہیں۔ زندگی کے تمام رنگوں سے سجی یہ کہانیاں ہمارے عہد کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

وحشی سعید نمبر

ان کی سبھی کہانیاں زوال پذیر معاشرے میں انسانی قدروں کو اجاگر کرتی ہیں اور انسانیت، محبت کے پیغام کی اہمیت کو ہر قاری کے ذہن نشین کراتی ہیں۔ بے سکونی، بے اطمینانی اور ذہنی انتشار کی عکاسی کرتی ہیں جنھیں وحشی سعید نے نئے نئے زاویوں سے پیش کیا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ'، 'کشکول' کے علاوہ بہت سی خوبصورت معیاری کہانیاں موجود ہیں لیکن مجھے ان کی دو کہانیاں بے حد پسند آئیں یعنی کشکول اور آبِ حیات۔ ان دونوں کہانیوں میں وحشی سعید کے اندر کا تخلیق کار ابھر کر سامنے آجاتا ہے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وحشی سعید کی کہانیاں علامتی اور اشاراتی زبان میں ہوتی ہیں۔ وہ ہر بات اشاروں، کنایوں میں بیان کرتے ہیں اور تعریف کی بات یہ ہے کہ تجسس برقرار رہتا ہے۔ قاری جلد سے جلد کہانی کے اختتام تک پہنچنا چاہتا ہے۔ یہی ایک اچھی کہانی کی خصوصیت ہوتی ہے اور وحشی سعید کہانی کی اس خصوصیت سے نہ صرف بھرپور واقفیت رکھتے ہیں بلکہ وہ کہانی پر مکمل مہارت رکھتے ہیں۔ آبِ حیات میں تین ایسے دوستوں کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں تینوں دوست آبِ حیات کی تلاش میں جنگل، پہاڑ اور کئی خطرناک مقامات سے گزرتے ہوئے اس جگہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انھوں نے آبِ حیات کے بارے میں پرانی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا۔ بڑی تلاش وجستجو کے بعد آخر انھیں آب حیات مل جاتا ہے۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں کہ ان کی محنت کامیاب ہوئی، کتابوں میں صحیح لکھا تھا کہ آب حیات ہے۔ اب وہ امر ہو گئے، اب انھیں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی مل گئی ہے۔ لیکن اچانک ہی ان کے پاس کوئی اخبار کا ایک پلندہ پھینک کر چلا جاتا ہے۔ اخبار کی سرخیوں میں ان کے مرنے کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ کل رات ریل حادثے میں مارے گئے لوگوں کی فہرست میں ان کا نام سرخیوں میں دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اس کہانی میں ایک بہت گہرا فلسفہ چھپا ہوا ہے یعنی بغیر موت کے حیاتِ جاودانی کا تصور ہی ممکن

نہیں ہے۔ جنت کا تصور صرف موت کے بعد کا ہی ہے، اسے دنیا میں حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے اور آبِ حیات صرف قصے کہانیوں میں ہوتا ہے اس لیے کہ دنیا سکون کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ لیکن انسان کی خواہش اتنی ہیں کہ وہ اپنے ہر خواب کی تعبیر دنیا ہی میں دیکھنا چاہتا ہے جو ممکن نہیں ہے۔ وحشی سعید نے اس کہانی میں اتنا کچھ سمو دیا ہے کہ کہانی ایک شاہکار کہانی بن گئی ہے۔ اس پر ان کا اندازِ بیان، خوبصورت برجستہ جملوں کے استعمال سے کہانی کو دلچسپ بنانے کا ہنر واقعی وحشی سعید کو خوب آتا ہے۔ ان کی کہانی دراصل قاری پر ایک دم نہیں کھلتی بلکہ آہستہ آہستہ قاری کے ذہن کے دریچوں کو کھولتی ہے اور جب قاری کہانی کی تہہ تک پہنچتا ہے تو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسے کوئی نایاب خزانہ مل گیا ہو یا آبِ حیات حاصل ہو گیا ہو۔ وحشی سعید کے یہاں زندگی کی وہ گہرائیاں ہیں جن میں قاری ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ قاری کو ایک گہری سوچ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ان کی کہانیاں سرسری پڑھنے کی چیز نہیں ہیں بلکہ انسانی نفسیات کو سلجھانے پر اکساتی ہیں۔ ایک کہانی کا اقتباس پیش ہے۔ کنوارے الفاظ کا جزیرہ جس پر انھوں نے کتاب کا نام رکھا ہے ظاہر ہے مصنف اس کہانی میں کوئی بڑی خصوصیت ہوگی تبھی تو اس عنوان سے کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔

''یہ جانتے ہوئے کہ شیشے کے محل میں...... میں نے پھر بھی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ اچانک سب ایک خواب کی کیفیت میں تبدیل ہو گیا۔ اب میں رات کے اندھیرے میں اپنے آپ کا تعاقب کرتا رہتا ہوں۔ اس اندھیرے میں بار بار وہ آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ سب ڈھونگ کس لیے؟ کیا مطلب؟ میں بول پڑتا ہوں انجام، زندگی کی جو ساعتیں میں نے سکون کے لیے وقف کی تھیں، اب ان ساعتوں میں بھی میں اپنے آپ کو سوچ وفکر کے زنداں میں قید

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

پاتا ہوں۔ رات کے اندھیرے میں جب جب میری گہری نیند ٹوٹتی ہے، میری بند مٹھی میں ایک جزیرہ پناہ گزیں ہوتا ہے اور میں اس جزیرے پر ان کنوارے الفاظ کی شناخت کی جستجو میں لگ جاتا ہوں، جو مجھ میں جذب ہوکر بھی مجھ سے بہت دور ہے''۔

وحشی سعید کی یہ وہ کہانی ہے جس پر کتاب کا نام ہے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' یعنی آدمی جو کچھ سوچتا ہے وہ ضروری نہیں کہ کر سکے لیکن بقول کسی شاعر کے ؎

میں سوچتا ہوں تو بس سوچتا ہی رہتا ہوں
خیال آتا ہے کیا کیا خیال آتا ہے

یہ کہانی وحشی سعید کی ایک گہری سوچ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ کیا سوچتے ہیں، وہ کہانی کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ کنوارے الفاظ کو جوانھوں نے زندگی دی ہے، وہ بے مثال ہے۔ وحشی سعید کے ایک ساتھ اتنے افسانوی مجموعہ اور ناول آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ انھیں کہانی کے فن اور ناول پر مکمل عبور حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وحشی سعید اردو فکشن کا ایک ایسا نام ہے جس نے اتنے مختصر وقت میں اردو ادب کو اپنے بہترین اور منفرد تحریروں سے آشنا کرایا اور ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جا رہی ہے''، ''خواب حقیقت'' جیسے شاہکار شعری مجموعے اردو ادب میں پیش کئے۔ ان کی ساری کتابیں تحریک ادب کے ایڈیٹر جاوید انور نے بہت خوبصورت اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔ جاوید انور میں ویسے بھی یہ خوبی ہے کہ دنیا کے قابل ترین شاعروں، ادیبوں کو کھوج نکالتے ہیں اور اس ادبی دنیا میں روشناس کراتے ہیں۔

وحشی سعید جیسا اہم افسانہ نگار بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ رہ سکا اور انھوں نے وحشی سعید کے افسانوں کا انتخاب، ناول اس اہتمام کے ساتھ شائع کیا کہ پڑھ کر

وحشی سعید نمبر

حیرانی ہوتی ہے کہ یہ اتنا اہم کہانی کار اب تک کہاں پوشیدہ تھا؟ جس نے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جارہی ہے''، ''خواب حقیقت'' جیسے افسانوی مجموعہ اب تک چھپا رکھے تھے۔ 'سڑک جارہی ہے' میں جو کہانیاں ہیں ان میں سائے کی تلاش، جمود کا جنازہ، جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے، ہنسی کا قتل، ہڑتال، سودا، تلخ یادیں، بھنگی وغیرہ کئی کہانیاں ہیں۔ 'سائے کی تلاش' ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک فنکار اپنے فن پر اپنی تمام تر خوشیاں اور جذبات نچھاور کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک فنکار بڑا فنکار نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے فن میں مکمل نہ ڈوب جائے اور وہ واقعی اتنا ڈوبا کہ اس کی ساری جوانی اپنے فن کو سنوارنے میں گزر گئی اور جب اس نے اپنی محبوبہ کی شاہکار تصویر بنائی تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ نگار دیکھ کر بھی حیران رہ گئی اور جب اس نے نگار سے اپنے دل کی آرزو بیان کی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ کہہ اٹھی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ تو بوڑھے ہو چکے ہیں؟ تب اسے ہوش آیا کہ واقعی وہ اپنے فن میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اسے یہ ہوش نہیں رہا کہ وہ کب بوڑھا ہو گیا۔ اسی طرح وحشی سعید کی ایک کہانی 'ہڑتال' ہے جس میں بمبئی کی فلمی دنیا میں ہونے والی سیاست اور فلمی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جہاں سوائے دولت، شہرت کے ہمدردی، خلوص دور دور تک نظر نہیں آتا اور فلمی دنیا کی چمک دمک اور دکھاوے اور موقع پرستی کے بنا کچھ نہیں ہے۔ وحشی سعید نے ہڑتال کے ذریعے سب کچھ بیان کر دیا ہے۔

'سڑک جارہی ہے' میں اور بھی بہت خوبصورت کہانیاں ہیں جیسے 'سودا'، 'جب بمبئی جھک جائے گی'، 'دل والی'، 'احساس کا گھاؤ'، 'یاد'، 'تلخ یادیں' اچھی کہانیاں ہیں۔ وحشی سعید کی کہانیوں میں سب سے اہم تو ان کا اندازِ بیان ہے وہ کہانی کو کتنی پرانی ہو اسے وہ نئی تکنیک سے بیان کرتے ہیں۔ برجستہ مکالموں سے کہانی میں دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اتنا ہے کہ ایک ایک لفظ سے کہانی کو کہیں سے کہیں

وحشی سعید نمبر

پہنچا دیتے ہیں۔ زندگی سے جڑے معمولی معمولی معاملات کو بھی انھوں نے کہانی کا روپ دے دیا ہے اور پھر اتنے مختصر عرصے میں اتنے افسانوی مجموعے اور ناول لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے لکھتے رہے ہیں اور اچانک ہی انھوں نے اپنے بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ افسانوی مجموعے پیش کر دیئے اور چند ہی دنوں میں وہ اردو فکشن کی دنیا میں ایک نمایاں نام بن کر ابھرے اور ایک بڑے ادبی حلقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں ان کے ڈھیر سارے مجموعوں پر انھیں مبارکباد دیتا ہوں اور اپنی بات عثمان جوہری کی اس رائے پر ختم کرتا ہوں کہ ''وحشی سعید اردو افسانوی ادب پر اس طرح ابھرے اور اس طرح روشن ہوئے کہ جموں کشمیر کا افسانوی ادبی منظر مزید تابناک نظر آنے لگا ہے۔ یہ بات اس لیے اپنا منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس قسم کی زبان کا استعمال انھوں نے اپنے افسانوں میں تحریر کے لیے استعمال کیا ہے وہ خالص فکشن کا اسلوب ہے''۔



وجودیت کی تلاش کا امین......وحشی سعید

☆ جاوید انور

وحشی سعید کے افسانوں میں سادگی سے پیچیدگی کی جانب سفر کرنے کا جو رجحان ملتا ہے، اس میں فطرت کے خود کار عمل جو کہ ارد گرد کے ماحول اور سماجی فضا سے اثر لیتے ہیں، کا بڑا دخل ہے۔ چونکہ ہر ماحول اور سماج اپنے مخصوص رقبی دائرے میں ایک مخصوص اساسی فکر بھی رکھتا ہے، اس لیے اس کے نظریۂ تخلیق میں اس سے منسلک عناصر بھی در آتے ہیں۔

ان فکری خیالات وتصورات کو وجودیت کے فلسفے کی ایک کڑی بھی کہا جا سکتا ہے۔ پونتی نے وجودیت کے فلسفے کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے

> ''ہم جب دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں تو ان پر ہمارا کوئی ایسا فیصلہ ممکن نہیں جو ہمیں ان سے الگ اور آزاد کر دے۔ یہ کہنا کہ سب بیکار ہے یا سب شر ہے یا اسی طرح یہ کہنا کہ سب خیر ہے جسے بمشکل اس شر سے متمائز کیا جا سکتا ہو، فلسفے سے ایسی باتوں کا کوئی علاقہ نہیں''۔
>
> (بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس: از شمیم حنفی، ص:۱۳۵)

تو جب یہ طے کر لیا جائے کہ نہ ہی کسی رائج سماجی حقیقت کو پوری طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے مکمل طور پر انکار ممکن ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وجودی مسائل اور شناخت کا مسئلہ صرف ظاہر کا عطا کردہ نہیں ہے بلکہ باطن بھی اس کا ذمہ دار ہے اور معتبر تخلیق کار ان دونوں متضاد حقیقت وتصور پر گہری نظر رکھتا ہے اور ان کو کھرے کھوٹے کے ساتھ اپنے تخلیقی سانچے میں ڈھالتا ہے۔

وحشی سعید کے افسانوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے

اس نکتۂ نظر کو بڑی باریک بینی سے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کا ایک افسانہ ''پہچان'' ہے جو اس جملے سے شروع ہوتا ہے......

''وہ اپنی انا کے سامنے اپنے مزاج کی خودسری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا''۔

اب کلائمکس کے یہ مکالمے ملاحظہ ہوں......

''آہستہ آہستہ خودسپردگی کا عنصر اس پر قابو پانے لگا۔ وہ جب اپنے
بت کو چھونے لگا، بت نے کہا:
تم کون؟
میں یوسف۔
اس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا......
تم یوسف نہیں ہو''۔

افسانے کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے:

''اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو
گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا''۔

اس طرح اس مختصر افسانے میں ظاہر و باطن اپنے مکمل وجود کے ساتھ سامنے آتے ہیں جس میں باطن کی مجبوری، جدوجہد اور اس کی ناکامی کو نمایاں کیا گیا ہے جو کہ موجودہ زمانے میں قدروں کی پامالی کے سبب رائج حقیقت کی آئینہ داری ہے۔

وحشی سعید کا ایک اور افسانہ ''گمراہی'' ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

''جب اس نے اپنے پاؤں ریشمی دبیز قالینوں پر رکھے تو یوں محسوس
ہوا کہ جنت کا پہلا نشان ملا''۔

اختتام کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''یہ سب حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ اپنی......آنکھوں کو خود ہی بینائی سے محروم کرنا ہوگا۔

لیکن......وہ بے بسی آواز میں بول پڑا......

سوچ ترقی کے لیے مضر ہے۔

وہ شخص کھڑا ہوا اور اپنی آہنی سیف میں اس کی بینائی کو محفوظ رکھ لیا۔

اب وہ اندھا آدمی اپنی گمراہی پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا''۔

یہاں بلراج مینرا کے ''کمپوزیشن سیریز'' کے ایک افسانے کے چند ابتدائی جملے یاد آتے ہیں:

''اس کے لفظ چھین لو اور اسے آزاد کر دو۔

یہ مجھے منظور نہ تھا۔

اچھا! اسے اس کے لفظوں کے ساتھ قید میں ڈال دو۔

یہ ان کی بھول تھی۔ اپنے لفظوں کے ساتھ میں قید میں بھی آزاد تھا''۔

اب ان دونوں انسانوں کے جملوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وجودیت کے متعلق سارتر کے یہ خیالات ملاحظہ ہوں:

''وجودیت کو انجماد کا فلسفہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ انسان کی تعریف عمل کی اصطلاحوں میں کرتا ہے۔ نہ ہی اسے انسان کی قنوطی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ رجائی نظریہ کوئی نہیں، کیونکہ انسان کا مقدر اس میں مضمر ہے، نہ ہی اسے انسان کے عمل کو پست کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ اسے بتاتا ہے کہ امید صرف عمل میں ہے اور یہ کہ عمل ہی وہ تنہا شے ہے جو انسان کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے''۔ (بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص: ۱۴۰)

بلراج مینرا کا افسانہ انا، اصول، انصاف وغیرہ پر پوری شدت کے ساتھ ڈٹے

وحشی سعید نمبر

رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس افسانے کے آگے کے مناظر، مکالمے اور پورا افسانہ ہی اصول، انصاف وغیرہ کی جدو جہد کی جنگ پر ختم ہوتا ہے۔ بلراج مینرا کا یہ افسانہ ۴۰-۴۵ برس یا اس سے بھی پہلے کا ہے۔

وحشی سعید کا تجربہ بلراج مینرا کے عہد کے آگے کا ہے۔ بلراج مینرا کے افسانے کا مرکز جدو جہد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خیر، انصاف، اصول وغیرہ کے فتح یاب ہونے کی پوری امید ہے لیکن وحشی سعید تک آتے آتے منظر بدل جاتا ہے کیونکہ بقول سارتر ''امید عمل میں ہے اور یہ کہ عمل وہ تنہا شے جو انسان کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے''۔ وحشی سعید کے نزدیک عمل کی دونوں قسموں کے رائج معنوں میں بھی پیچیدگی اور بعض اوقات تضاد تک کا رجحان غالب آجاتا ہے۔ یعنی خیر کو شر اور شر کو خیر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں کی بھی بعض اوقات پذیرائی ہونے لگتی ہے۔ جہاں انصاف، اصول، خیر یا کوئی مثبت نظریہ یا جو بھی کہیں دبیز ریشمی قالینوں پر پاؤں رکھنا اور اسے جنت کا پہلا نشان سمجھنا اپنے اعلیٰ مقصد یا نصب العین سے اپنی مرضی اور خوشی سے ہٹنے کا اشارہ دیتا ہے۔ (اسے یوں محسوس ہوا کہ جنت کا پہلا نشان ملا)

جس عمل کی ابتدا یا ابتدا کی بھی پہلی سیڑھی پر جنت نشاں جیسی زندگی یا مادی، جسمانی یا روحانی تسکین حاصل ہو اور جس پر نصف سے زائد آبادی کا اعتقاد ہو، اسے برا یا خراب کیوں کر گردانہ جائے اور جس نظریہ حیات کی عملی حدیں نصف سے بھی زائد سے کم زندگیوں تک محدود ہو، وہ رائج حقیقت و تصورات کی ضمن میں کیوں کر مفید، مثبت اور برحق تسلیم کی جائیں۔ وحشی سعید کے افسانے اس قسم کے متعدد سوالات کو اپنے حصار میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ وحشی سعید نے انفرادی طور پر ان سوالات کو حصار میں لیا ہو اور نہ ہی علامتی اسلوب کے افسانوں تک ہی ان کے فن کا یہ اختصاص موجود ہے بلکہ ان کے

وحشی سعید نمبر

تجربات کے شعوری مدلل جذباتی اضطراب اور ہیجان کی معنویت آج کے سماجی اور تہذیبی ہیجان کی تبدیل ہوتی ہوئی معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ''نامکمل تصویریں'' ہیں۔ یہ پورا افسانہ فن کے تجسسی عناصر کی اعلیٰ قدروں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب نے منظر اور مکالمے کی ہم آہنگی کا وہ اعلیٰ معیار قائم کیا ہے جو ایک بہترین کامیاب افسانے کا ضامن ہوتا ہے۔ اس افسانے کے کلائمکس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''وہ تعاقب کرنے والا کہاں گیا ہوگا''۔

''یہاں تو نہیں آیا''۔

''لیکن کون تھا وہ''۔

''وہ میرا ہونے والا خاوند تھا''۔

میں پردے میں چھپے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کے تاثرات کے درمیان سیاہ موٹا برقعہ حائل تھا۔

میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا:

''یہ جان کر بھی تعاقب کرتا رہا کہ تم اس کی ہونے والی بیوی اور کبھی اس کے پاس تم چاروں پہر ہوگی''۔

''لیکن پوسٹ ماسٹر صاحب وہ ہونے والی بیوی کا تعاقب نہیں کر رہے تھے......''

''تو......''

''وہ میری سہیلی فاطمہ کا تعاقب کر رہے تھے جو ان کی محبوبہ ہے''۔

میری زبان نے کام کرنا بند کر دیا۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

''لیکن یہ سب......''

وحشی سعید نمبر

''یہ سب تو ٹھیک ہے'' راشدہ نے کہا ''یہ ضروری نہیں کہ جو بیوی ہو، وہ محبوبہ ہو اور جو محبوبہ ہو وہ بیوی ہو۔ میں تو خود فاطمہ کے ہونے والے خاوند کی محبوبہ ہوں''۔

ڈفر کا ڈویل اس قسم کی سماجی نظریاتی پیچیدگیوں کی اساس انسان کے ادراک کی ژولیدگی جس میں کہ رائج حقیت کو بھی رکھا جاسکتا ہے کو گردانتا ہے اور اس کی الجھنوں کا سبب بھی اس میں تلاش کرتا ہے۔

''انسان معاشی زندگی کے ارتقا کے تسلسل میں ماحول سے جد و جہد کرتے ہوئے اور عملاً اس کی تعبیر کرتے ہوئے اپنے آپ کو شعوری طور پر ماحول سے الگ کرتا ہے۔ جب انسان بیرونی حقیقت کی نوعیت کو اقتصادی پیداوار کی مسلسل کوششوں کے ذریعہ گرفت میں لے لیتا ہے تو ماحول اور اپنی ذات کا باہمی امتیاز اس کی سمجھ میں آجاتا ہے کیونکہ اب وہ ان کی وحدت کو بھی سمجھتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ انسان اب مشین کی طرح ضرورت کا تابع بھی ہے اور کائنات کے تسلسل میں آزادانہ ارتقا کا تماشہ بھی''۔ (بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص:۱۱۵)

مندرجہ بالا اقتباس میں جس آزادانہ ارتقا کے تماشے کا ذکر ہوا ہے اسے وحشی سعید نے اپنے افسانہ ''نامکمل تصویریں'' میں کھینچا ہے۔ اوپر درج کئے گئے کلائمکس کے چند جملوں کے تسلسل میں افسانہ اس طرح آگے بڑھتا ہے:

''اور اخلاق'' میں چونک پڑا۔

فاطمہ کہہ اٹھی...... ''آپ لوگ دقیانوسی خیالات سے اخلاق کا دائرہ تنگ کرتے ہیں۔ اخلاق کا دائرہ تنگ مت کیجیے''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

میں تقریباً چیخ پڑا۔

''پھراس تعاقب سے گھبرا کیوں گئیں''۔

راشدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا...... کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایک مرد ایک ساتھ ہونے والی بیوی محبوبہ کو دیکھ لے۔ کیونکہ شاید......'' (نامکمل تصویریں)

الفاظ کے انتخاب کے تعلق سے یہاں ذکر کرنا لازم معلوم ہوتا ہے کہ وحشی سعید نے جو ''چاروں پہر'' استعمال کیا ہے۔ (یہ جان کر بھی تاقب کرتا رہا کہ تم اس کی ہونے والی بیوی ہو اور کبھی اس کے پاس تم چاروں پہر رہو گی) پر بھی کچھ عرض کیا جائے۔

زبان میں جو محاورہ رائج ہے وہ ''آٹھوں پہر'' کا ہے، بہ معنی ہر وقت۔ لیکن بیوی اور شوہر کا واقعی رائج حقیقی ساتھ چار پہر یعنی رات میں نمو پاتا ہے۔ باقی چار پہر تو دنیاوی، سماجی اور مادی الجھنیں گھیرے رہتی ہیں، تو اس ایک جملے سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وحشی سعید کو زبان اور الفاظ پر کتنی قدرت حاصل ہے۔

وحشی سعید کے افسانوں کے چھوٹے چھوٹے مکالمے اپنے اندر ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے ایک جہان معنی رکھتے ہیں۔ ان جہان معنی کا انکشاف کسی ایک مضمون میں ناممکن ہے خواہ اسے طویل تر کر دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے مختلف ڈائمنشن کئی ایک علیحدہ مضمون کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے فی الوقت میں اس مضمون کو یہیں ختم کر کے باقی باتیں آئندہ مضامین کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔



وحشی سعید کا افسانہ ''جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے'' کا تجزیہ

☆ شارق عدیل

اردو زبان وادب کے علاقوں میں جہاں قارئین کی تعداد سب سے زیادہ نظر آئے تو سمجھو وہ فکشن کا علاقہ ہے۔ چونکہ اس علاقے میں ہی تمام دنیا کے انسانوں کے احساسات وافکار کی ترجمانی کی جاتی ہے اور مذکورہ علاقے میں ہی زندگی کی مسرتیں، کراہیں اور کائنات کے رموز واسرار کو افسانے کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔

لیکن اس وقت افسانے کا اختصار اس کی تخلیقی منزل کے بہت ہی اہم اور خطرناک موڑ سے گزر رہا ہے۔ اہم اس لیے ہے کہ افسانہ اختصار کے ساتھ بھی اپنی بنیادی روش سے دستبردار نہیں ہوا ہے اور خطرناک اس لیے ہے کہ اسے افسانچے کے علاوہ بھی اور کئی ناموں سے لکھا جا رہا ہے اور بیانیہ جیسی اہم شئے کو متواتر نظر انداز کیا جا رہا ہے، جو اردو افسانہ پڑھنے والوں کے مجموعی مزاج کے نزدیک نہیں ہے۔

افسانچے کی تخلیقی بنیاد کا پہلا پتھر اردو زبان کے لافانی افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے رکھا۔ بس افسانچے کی صنفی زندگی کا اک یہی ثبوت ہے۔ لیکن افسانچہ یا پوپ کہانی کا ڈھول بجانے والوں کو یہ دھیان بھی رکھنا چاہیے کہ منٹوؔ کو موجودہ صدی کا بہترین اور بڑا افسانہ نگار بنانے میں افسانچے کا کوئی کردار نہیں ہے۔ لیکن اس دور میں ایک ایسا افسانہ نگار ضرور موجود ہے جو افسانے کو، ناول کو اختصار کے ساتھ ایسے انداز سے تحریر کرتا ہے کہ بیانیہ کا حسن پوری طرح برقرار رہتا ہے۔ چونکہ وحشی سعید جب کسی خیال کو، کسی قابلِ ذکر حادثے کو، کسی تاریخی منظر کو، کسی غیر معمولی نوعیت کے واقعے کو اپنی حساس سوچوں میں رکھ کر افسانے کے روپ میں ڈھالتے ہیں تو اس کے بیانیہ کی رگ رگ میں تجسس کے لہو کو بھی انڈیل دیتے ہیں، جس کی بنا پر افسانے سے قاری کا تعلق

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ہر گزرتی سطر کے ساتھ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ 'سڑک جارہی ہے' وحشی سعید کا مختصر افسانوں کا قابلِ ذکر مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی تین کتب اور شائع ہو چکی ہیں، ''خواب حقیقت''، ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' اور ''پتھر پتھر آئینہ'' جو اپنے صفحات پر دو مختصر ناولوں کو تخلیقی حسن کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہے۔ اولذکر مجموعے میں تیس افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذکورہ مجموعے کا کوئی بھی افسانہ طویل تخلیقی راہوں کا مسافر نہیں ہے۔ لیکن وحشی سعید کا افسانہ بُننے کا اختصاری ہنر افسانے کو مزید تخلیقیت کے نور سے آباد کر دیتا ہے، جس کے ثبوت میں وحشی سعید کے تمام افسانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں یہاں سبق آموز افسانہ ''جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے'' کا تجزیہ کروں گا جسے وحشی سعید نے صرف تین کرداروں کے ساتھ بنا ہے۔ پہلا کردار رینو کا دیوی کا ہے جس کے مکر کی زمین پر افسانے کی عمارت کو کھڑا کیا گیا ہے۔ دوسرا کردار سدھیر کا ہے جو رینو کا دیوی کا ملازم ہے اور زندگی میں محبت کا طالب ہے۔ تیسرا کردار شالنی کا ہے جو ایک خوبصورت لڑکی ہے اور غربت کے اندھیروں سے نکلنے کی کوشش میں رینو کا دیوی کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتی ہے اور سماج کے بنائے ہوئے قوانین کو توڑنے سے بھی گریز نہیں کرتی ہے۔ مذکورہ افسانے کی ابتدائی ترنگ میں زندگی کے اپھان کو محسوس کریں۔

کچھ چیزیں یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہیں کیونکہ کبھی کبھی وہ انسانی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی لاتی ہیں، ایسی تبدیلی جو زندگی میں نئی قسم کی ہلچل پیدا کر دے۔ مذکورہ دونوں سطریں رینو کا دیوی کے کردار کی اسراری کیفیت کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں اور افسانے کی بُنت میں ایک طرح کے سسپنس کو بھی قائم رکھتی ہیں۔ اقتباس......

''رینو کا دیوی کی شاندار پارٹی سدھیر کبھی نہیں بھول سکتا، جو ایک مالدار بیوہ عورت تھی۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی، جو کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ سدھیر اس کے کارخانے میں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ملازم تھا۔ رینوکا دیوی کا ماضی کچھ روشن نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ آوارہ تھی لیکن اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی، وہ رحم دل بھی تھی۔ سدھیر اس کے بارے میں سوچتا ہے کبھی اس رحم دل عورت نے ایسے دن بھی گزارے ہیں جن کا تصور کر کے انسان کانپ جاتا ہے۔ سدھیر یہ ہی سوچ رہا تھا کہ ایک مدھر آواز نے اس کے خیالات کو منہدم کر دیا۔ یہ دلفریب آواز شالنی کی تھی جس کے سحر میں سدھیر مبتلا ہو چکا تھا، چونکہ شالنی نسوانیت سے مزین حسن کا شاہکار تھی، جسے دیکھتے ہی دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ جاتی تھی۔ سدھیر بھی ایسے ہی تجربات سے دوچار تھا کہ رینوکا دیوی اس سے مخاطب ہوتی ہے تو وہ چونک جاتا ہے اور ایک فطری جھینپ کا نور اس کے چہرے پر نمودار ہو جاتا ہے۔

رینوکا دیوی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھی کہ سدھیر کو شالنی کے نزدیک لانے کی سازش جلد سے جلد کامیاب ہو جائے تا کہ اس کو مزید تاخیر کی اذیت سے نہ گزرنا پڑے، وہ سدھیر کا شالنی سے تعارف کرا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

سدھیر شالنی کی گائی ہوئی غزل اور اس کی تعریف میں محو تھا کہ اسے خیال آتا ہے کہ وہ شالنی کو گھر چھوڑنے کے بہانے سے کچھ اور وقت اس کی قربت میں گزار سکتا ہے اور شالنی نے بھی اس کی پیش کش کو نظر انداز نہیں کیا اور سدھیر کے ہمراہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ شالنی ایک پرانے اور فرسودہ طرز کے مکان میں کرائے پر رہتی تھی اور مکان کے ہر منظر سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ شالنی ایک غریب لڑکی ہے۔

سدھیر، شالنی سے محبت کے اظہار میں عجلت پسندی سے کام لینا نہیں چاہتا تھا، اس لیے وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ شالنی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی ہے، اندر آ جاؤ۔ سدھیر! میں جانتی ہوں، تم میرے اس چھوٹے سے کمرے میں آنا پسند نہیں کرو گے، لیکن اس میں میرے ذوقِ انتخاب کا قصور نہیں، میں ایک غریب اور یتیم لڑکی ہوں، جوتے کی دوکان پر بہت ہی معمولی تنخواہ پر کام کرتی ہوں۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اور افسانہ تیزی سے اپنے مرکز کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتے ہوئے محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جوان جسموں کے تقاضے انگڑائیاں لینے لگتے ہیں اور اس کے بعد کی منزل میں دونوں کے جسم ایک دوسرے سے پوری طرح آشنا ہو جاتے ہیں، لیکن جذبات کے نازک لمحات سے گزرنے کے بعد شالنی کے چہرے پر طمانیت کے بجائے ناگواری کے نقوش ابھرتے ہوئے دیکھ کر سدھیر پریشان ہو جایا کرتا تھا اور وہ سوچنے لگتا تھا کہ شالنی شادی سے قبل جسموں کی صداؤں پر لبیک کہنا پسند نہیں کرتی ہے۔ اس لیے سدھیر اس کے سامنے شادی کا پیغام رکھ دیتا ہے چونکہ وہ سوچتا تھا کہ شالنی، شادی کے بارے میں سن کر پھولے نہیں سمائے گی، لیکن شالنی کے چہرے پر خوشی کی ہلکی نمود بھی نہیں تھی، جس کی وجہ سے سدھیر اداس ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا وہ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی؟ سدھیر ایسے ہی سوالوں سے جوجھتا ہوا دو تین روز کے بعد جب شالنی سے ملنے کے لیے اس کے گھر جاتا ہے تو وہ اپنے گھر پر نہیں ملتی ہے اور پتہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان خالی کر کے جا چکی ہے۔ یہ خبر سدھیر کے کانوں پر تیزاب کی بوندوں کے مانند گرتی ہے۔ لیکن محبت تو دیوانگی کی منزل میں بھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتی ہے۔ سدھیر یہ ثابت کرنے کے لیے شالنی، جس دوکان پر کام کرتی ہے، اس طرف چل پڑتا ہے لیکن شالنی وہاں سے بھی نوکری چھوڑ کر جا چکی ہے اور یہ صورتِ حال سدھیر کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ چونکہ اس کی محبت میں جذبات کے شوخ رنگ زندگی کی صداقتوں کی طرح جھلملایا کرتے تھے۔ اس لیے مسلسل سوچنے پر بھی اسے یقین نہیں آتا تھا کہ شالنی اسے دھوکا دے سکتی ہے اور بظاہر دھوکہ دینے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ایک جاذبِ نظر مرد تھا اور اتنا کما بھی لیتا تھا کہ اپنی شادی شدہ زندگی کو آسانی سے گزار سکے۔ اس لیے اسے ہر وقت یہی سوال پریشان کرتا تھا کہ آخر شالنی کیوں اور کہاں چلی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

گئی؟ ایک دن سدھیر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رینوکا دیوی سے بھی شالنی کے بارے میں بھی ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اسے مایوسی ہی ہاتھ لگتی ہے اور وہ ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے زندگی کے دن پورے کرنے لگتا ہے کہ ایک دن شالنی کا مکان مالک اسے ملتا ہے اور کہتا ہے: تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم اس لڑکی کی جستجو میں ابھی تک بھٹک رہے ہو، میرے خیال میں وہ گلاب باغ کے کسی مکان میں رہتی ہے۔ افسانے کا یہی وہ موڑ ہے جو وحشی سعید کی افسانوی فکر پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چونکہ افسانہ یہیں پر رینوکا دیوی کے مکر آلودہ کردار کو پوری طرح برہنہ کر دیتا ہے اور قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ سدھیر، شالنی کے مکان مالک کی باتوں کو سن کر دوڑتا ہوا ''گلاب باغ'' پہنچ جاتا ہے جو بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے اور شالنی بھی یہاں ایک جدید طرز کے فلیٹ میں رہتی ہے۔

سدھیر، شالنی کو دیکھ کر حیرت و مسرت کے ملے جلے لہجے میں پوچھتا ہے: شالنی! تم ناراض کیوں ہو؟ اور جیسے ہی اس کی نظر شالنی کے ابھرے ہوئے پیٹ پر پڑتی ہے تو وہ جذباتی ہو جاتا ہے اور بدبداتے ہوئے کہتا ہے: تم حاملہ ہو اس لیے مجھ سے چھپتی رہیں، ارے پگلی! یہ ہمارا بچہ ہے۔ شالنی، سدھیر کی جذباتی باتوں سے تلملا جاتی ہے اور جھنجھلائے ہوئے انداز میں گویا ہوتی ہے: یہ ہمارا بچہ نہیں، رینوکا دیوی کا بچہ ہے۔ اور اس جملے کے فضا میں گونجتے ہی افسانہ لالچ اور ضرورت کی معنوی منزل میں قدم رکھ دیتا ہے اور سدھیر کو شالنی کا وہ چہرا یاد آنے لگتا ہے جو جذباتی لمحوں سے گزرتے ہوئے نفرت گزیدہ لکیروں سے آباد ہوا کرتا تھا، لیکن شالنی اپنی ہی دھن میں بہت کچھ کہے جا رہی تھی۔ سدھیر اس کی باتوں کو سن کر سوچتا ہے...... یہ ماں نہیں، دولت کی پرستار، جذبات سے عاری صرف ایک عورت ہے جو دولت کے لیے اپنی اولاد کو بھی فروخت کرنے کے لیے تیار ہے اور اسے شالنی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے بچے کو دیکھنے کی تمنا

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اسپتال لے جاتی ہے جہاں شالنی ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے اور افسانہ ایک عبرتناک انجام کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن میں سینکڑوں سوال چھوڑ جاتا ہے۔

اگر وحشی سعید چاہتے تو افسانے کو اس جملے پر بھی ختم کر سکتے تھے، ''یہ بچہ ہمارا نہیں رینوکا دیوی کا ہے''، چونکہ یہاں اختصار کے حوالے سے افسانے کی معنویت بہت ہی گہری ہو گئی ہے اور چونکاتی بھی ہے۔ لیکن وحشی سعید کا تجسس پسند ذہن قاری کو مزید چونکانے کی غرض سے افسانے کو آگے بڑھاتا ہے اور پوری طرح یہ ثابت کر دیتا ہے کہ انسان اپنی مکر آلودہ فطرت کے سہارے سے سب کچھ حاصل نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے انجام سے فرار حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو رینوکا دیوی اپنے آوارہ گرد ماضی کو دولت کی چادر سے ڈھانک لیتی اور کہیں سے بھی ایک بچہ حاصل کر لیتی لیکن ایسا اس کی بدچلن فطرت نے نہیں ہونے دیا۔ لیکن جب شالنی، مردہ بچے کو پیدا کرتی ہے تو افسانے کی فضا مزید اثر انداز ہو جاتی ہے۔

چونکہ افسانے کے آخری منظر میں صرف دو ضرورت مند عورتوں کے کردار رہ جاتے ہیں، ایک غربت کے حصار سے نکلنے کے لیے ''ماں'' کے جذبات سے بھی دستبردار ہونے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی ہے۔ اور دوسری عورت اپنی دولت کے لیے ایک وارث خریدنا چاہتی ہے۔ اس لیے افسانے میں ایک کردار دولت کا بھی ہے جو قدم قدم اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

اور جب دونوں ضرورت مند عورتوں کی خواہشات ادھوری رہ جاتی ہیں تو افسانہ ایک سبق بن جاتا ہے۔ اور یہ احساس دلاتا ہے کہ دولت اور مکر دونوں مل کر بھی تقدیر پر قابو پانے سے معذور ہیں۔ وحشی سعید کو افسانہ بُننے کا اور قاری کو اختصار کے ساتھ چونکانے کا فن آتا ہے اور ان کے اس ہنر میں ہی ان کی انفرادیت کا راز پوشیدہ ہے۔



وحشی سعید کے افسانوں میں زندگی کی تلاش

☆ سلیم انصاری، جبل پور

میرے نزدیک، تقریباً ایک صدی کے اپنے طویل سفر میں اردو افسانہ ایک نئے تخلیقی پڑاؤ پر نظر آتا ہے۔ روایتی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید جیسے لاحقوں سے آزاد اردو افسانہ قاری اور انسانی زندگی سے مکالمہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ متعدد سماجی، سیاسی، تخلیقی اور ذاتی تجربات سے گزر کر اردو افسانہ نسبتاً ٹھہراؤ کا حامل ہو گیا ہے اور بیانیہ کی طرف واپسی کے سبب قاری سے اپنا رشتہ از سرِ نو قائم کرنے میں کامیاب بھی۔ موضوعات کی سطح پر بھی سیاسی، سماجی، معاشی سروکار اور تہذیبی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والی سیاسی اور دیگر تبدیلیوں کو بھی اپنے موضوعات کا حصہ بنانے میں نیا افسانہ کامیاب رہا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جدیدیت کے نام پر لکھے جانے والے مبہم اور پیچیدہ اور ترسیل کے المیہ کا شکار افسانے بعض ناقدین کی کوششوں کے باوجود افہام و تفہیم سے عاری ہی رہے ہیں۔ مگر بیانیہ کی طرف واپسی کے بعد اُردو افسانہ اور قاری کے درمیان رابطہ بحال کرنے میں کشمیر کے جن افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے ان میں وحشی سعید کا نام بے حد نمایاں ہے۔

وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جا رہی ہے'' کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا ہے کہ ان کے افسانوں میں زیریں لہر کے طور پر ایک طرح کا استعاراتی اور علاماتی نظام کارفرما ہے جو ان کے افسانوں کی معنویت میں اضافہ تو کرتا ہے مگر انھیں ترسیل کے المیے کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ یہ خصوصیت اس لیے بھی اہم ٹھہرتی ہے کہ ان کے یہاں بیانیہ کے نام پر سپاٹ، کھردرے اور اکھرے پن کا

وحشی سعید نمبر

احساس نہیں ہوتا بلکہ ان کے یہاں افسانوں میں کئی سطحوں پر معنویت کا احساس ہوتا ہے جس سے افہام و تفہیم کی نئی پرتیں کھلتی ہیں۔

وحشی سعید کے افسانوی مجموعے ''سڑک جارہی ہے'' میں تیس افسانے شامل ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے بعض افسانے مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنے موضوعات، تکنیک، کرافٹ اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بڑے کینوس پر بنائی ہوئی ایسی پینٹنگ کی طرح ہیں جو عام انسان کی زندگی کے مسائل و مصائب اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کو مصور کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں اور میرے نزدیک یہ افسانے عام قاری سے رشتہ استوار کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور افسانہ نگار کی تخلیقی توانائی اور اسلوب کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔

زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ''سائے کی لاش'' ہے جو زندگی سے بھرپور ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک مصور ہے جو ایک بھرپور زندگی جینے کا خواہشمند ہے اور کینوس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کے ورق پر بھی خوبصورت تصویریں بناتا ہے مگر ایک ایک کر کے یہ ساری زندہ و جاوید تصویریں اس کی زندگی سے بچھڑتی چلی جاتی ہیں۔ اور جب تصویروں کی ایک نمائش میں ایک خوبصورت چہرہ اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور وہ اس کی مکمل اور خوبصورت تصویر بنانے کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے تو نگارا سے احساس دلاتی ہے کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ تب اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ وہ پچاس سال کی عمر پر پہنچ گیا ہے اور اب دوسروں کے لیے اس کی زندگی میں کچھ نہیں بچا ہے۔ اس افسانے میں خوابوں کو مسلسل تعبیر کرنے والے مصور کے یہاں تصویریں زندگی سے محبت کا استعارہ ہیں اور قاری کو آخر تک باندھے رکھتی ہیں اور انتم سانس تک زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا افسانہ ''جمود کا جنازہ'' ہے جو اپنے پلاٹ کے اعتبار سے بیحد

وحشی سعید نمبر

نازک ہے۔ جمود کا جنازہ دراصل ہمارے معاشرے میں انسانی رشتوں کی شکست و ریخت ان کی ارزانی اور تہذیبی قدروں کے زوال کا اعلامیہ ہے۔ یہ افسانہ یوں تو خاصا مختصر ہے مگر قاری کے ذہن و دل پر دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار جمال جس کی زندگی جمود کا شکار ہے، اس کی زندگی میں قریبی رشتوں کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ یتیم ہے اور پھر ایک دن اس کے دل میں یہ جذبہ جنم لیتا ہے کہ کاش اس کی بھی کوئی بہن ہوتی۔ اس کی یہ خواہش پوری بھی ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی میں شبنم داخل ہوتی ہے جو خود اس کی طرح یتیم ہے اور فٹ پاتھ پر ملی تھی اُسے۔ جمال کی زندگی کا خلا پُر ہو جاتا ہے اور وہ بہن جیسے پاکیزہ رشتے کی پرورش اور پرداخت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا اس رشتے کی پاکیزگی اور معصومیت کو قبول نہیں کرتی بلکہ سچائی جانے بغیر اس میں گناہ اور گندگی کا الزام دھرتی ہے۔ جمال ان سب الزامات کی پرواہ کیے بغیر اپنی منھ بولی بہن کے ساتھ مسرور نظر آتا۔

جوان ہوتی اس بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی ہوتی ہے اسے اور جب اپنی بہن کے لیے رشتہ تلاش کر کے وہ ایک دن شبنم سے کہتا ہے کہ اب وہ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں کیونکہ لڑکیاں تو پرائی ہی ہوتی ہیں۔ مگر شبنم کے غیر متوقع جواب اور ردعمل میں اس نے جو سنا اس نے ایک بار پھر جمال کی زندگی پر جمود طاری کر دیا۔ شبنم کا یہ جملہ کہ ''تم ہی میرے جسم و روح کے مالک ہو، میرے خوابوں کے شہزادے ہو...... کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں''۔ یہ سن کر جمال ایک مجسمے کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا اور رشتوں کی بے ثباتی اور بے یقینی کے درمیان اس نے شبنم کو پھر اسی فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا جہاں سے اٹھا کر اس نے شبنم کو ایک سچے رشتے باندھنے کی کوشش کی تھی۔

وحشی سعید کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ ان کے یہاں

وحشی سعید نمبر

موضوعات ہیں جہاں ایک طرف نیا پن اور تنوع ہے وہیں افسانے کے ٹریٹمنٹ اور زبان و بیان پر بھی انھیں دسترس حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے افسانوں کے عنوانات بھی اپنے اندر افسانوں جیسی ہی معنویت کے حامل اور معنی خیز ہیں اور قاری کو غور وفکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔اور یہ ایک ایسی انفرادیت اور تخلیقی ہنرمندی ہے جو انھیں دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے بعض افسانوں کا اختصار ان کے یہاں جملوں کی ساخت اور غیر ضروری لفظوں کے استعمال سے پرہیز کے سبب بھی ہے اور یہ خصوصیت بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

''سودا'' میں وحشی سعید نے ایک بیحد عام سے مسئلے کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے جس میں میجر دُرانی ایک کروڑ روپئے اور پرموشن کا لالچ دے کر اپنے ہی ماتحت ایک سپاہی شوکت کو، اپنی اپاہج اور اندھی بہن سے شادی کا آفر دیتا ہے مگر شوکت کے منع کرنے کے بعد میجر دُرانی اپنی شکست کے احساس سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں خاص بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے انحطاط پذیر قدروں اور زوال آمادہ معاشرے میں بھی ان لوگوں کے یہاں خودداری اور عزتِ نفس کے محفوظ ہونے کا احساس دلایا ہے جو معاشی طور پر کمزور ہیں اور یہ بات واقعتاً سچ بھی ہے۔

''بھنگی'' وحشی سعید کا ایک بیحد اہم اور نازک افسانہ ہے جو نہ صرف اپنے موضوع کے لحاظ سے بلکہ اپنی بنت اور تکنیک کے لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار صمد بھنگی ہے۔ اور بھنگی ایک ایسا لفظ ہے جسے سن کر ہی سماج کے نام نہاد شریف اور ذات پات میں یقین رکھنے والے افراد کے منھ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ صمد بھنگی اگرچہ سڑکوں کو صاف کرنے کا کام کرتا تھا مگر اس کلیے کو بدلنا چاہتا تھا کہ بھنگی کا بیٹا صرف بھنگی ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ ہزار منتوں اور مرادوں کے بعد خدا نے

جب اسے بیٹا عطا کیا تو اس نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھنگی نہیں بنائے گا۔ صمد بھنگی نے اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل کرادیا اور اسے بڑا آدمی بنانے کی ٹھان لی۔ مگر صمد بھنگی کے بیٹے نے نہ معلوم وجوہات کے سبب ایک سال کے بعد اسکول چھوڑ دیا اور آخر کار اپنے والد صمد کے ساتھ ہی بھنگی کے کام پر لگ گیا۔ ایک دن لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے صمد بھنگی کا بیٹا ایک گاڑی کی زد میں آکر دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کا خون سڑک پر پھیل گیا۔ افسانہ نگار نے اس افسانے کا اختتام بہت عمدہ اور مؤثر طریقے سے کیا ہے بالکل نظموں کے کلائمکس کی طرح۔

''میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا اس لیے خدا نے اس کو واپس بلا لیا''۔ دوسرے دن میں نے صمد کو اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا...... کیونکہ...... وہ...... بھنگی تھا''۔ افسانے کا یہ کلائمکس واقعی ضمیر کو جھنجھوڑنے والا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے کہ کیا واقعی ہمارا معاشرتی نظام ایک بھنگی کے بیٹے کو بھنگی ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کتاب کا ایک اور اہم افسانہ ''سڑک جا رہی ہے'' ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے دیگر افسانوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس افسانے میں وحشی سعید نے انسانی رشتوں اور جسمانی ضرورتوں کے درمیان جنم لیتی ہوئی کہانیوں کو نہایت خوبصورتی سے مصور کیا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے انسانی رشتوں کی پاکیزگی کو سماج کی تہذیبی قدروں کی صحت کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔

ایک امیر اور بظاہر باعزت شہری بانکے لال اور ایک طوائف چاند بائی کے درمیان قائم ہوئے ناپاک رشتوں کے نتیجے میں نینا کی گمراہی اور بھٹکاؤ کو وحشی سعید نے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

نینا جو ایک ناجائز رشتے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، جب اسکول میں داخل ہوتی

وحشی سعید نمبر

ہے تو وہاں اس کی دوستی رمیش سے ہوتی ہے اور بعد میں جنسی رشتے کی صورت میں سامنے آتی ہے اور جب اس کی ماں چاند بائی رمیش کو نینا کے منھ کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھ لیتی ہے اور اسے تھپڑ رسید کر کے اس طرح کے رشتے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور گھر میں قید کر دیتی ہے۔ مگر جب بانکے لال کا نوکر موہن نینا سے جنسی رشتے قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بانکے لال بری طرح متاثر ہوتا ہے اور پھر ایک دن وہ موہن کے باپ سورداس سے موہن کا ہاتھ اپنی بیٹی کے لیے مانگتا ہے مگر جب سورداس یہ کہتا ہے کہ ''تم شاید یہ بھول گئے ہو کہ تم اور تمہاری بیوی اپنے ساتھ کوئی ماضی رکھتے ہو''۔ تو بانکے لال بری طرح ٹوٹ جاتا ہے اور اسی صدمے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

آخر کار چاند بائی مجبور ہو کر ایک دن نینا کا ہاتھ ایک بوڑھے آدمی ہری رام کے ہاتھ میں سونپ دیتی ہے، جہاں اس کی جنسی خواہشات کی تسکین نہیں ہوتی ہے۔ اپنی جنسی آسودگی کی خاطر نینا، ہری رام کے نوجوان بیٹوں شیکھر اور برج سے ناجائز رشتے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جب اس حقیقت کا پتہ ہری رام کو ہوتا ہے تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور پھر برج اور نینا ایک دوسرے کے ساتھ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور اسی خونی بنگلے میں منتقل ہو جاتے ہیں جہاں بانکے لال اور چاند بائی کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات پروان چڑھے تھے اور جس کے نتیجے میں نینا پیدا ہوئی تھی۔

''سڑک جا رہی ہے''، وحشی سعید کا قدرے طویل افسانہ ہے مگر اپنے پلاٹ، کرافٹ اور زبان و بیان کی خوبصورتی اور بنت کے سبب یہ افسانہ، زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا بیحد اہم افسانہ قرار پاتا ہے۔

''نیلام'' دو ایسے دوستوں کی کہانی ہے جن کے سفر کا آغاز تو ایمانداری، سچائی اور

وحشی سعید نمبر

اصولوں کے راستے پر ہوتا ہے مگر درمیان سفر ایک دوست فاروق مصلحت اندیشی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کر کے زندگی میں آسودگیاں اور آسائشیں حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ اپنے دوست کے پیار پر بھی قبضہ کر لیتا ہے جبکہ دوسرا دوست اصول اور ایمانداری کے راستے پر چل کر اپنی بے کیف زندگی میں مست رہتا ہے اور جب کافی عرصہ بعد شہر لوٹتا ہے تو حیران ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب اگر وہ اپنی ایمانداری اور سچائی کو نیلام بھی کرے تو کوئی اس کا خریدار بھی نہ ملے گا۔

''خدا کون ہے'' وحشی سعید کا ایک ایسا افسانہ ہے جو غربت، ضرورت اور لالچ کے درمیان انسانی نفسیات کو نہایت خوبصورتی سے پینٹ کرتا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کو ایک دن سڑک پر پڑا ہوا ایک ہزار روپۓ کا نوٹ ملتا ہے اور وہ اسے اٹھا لیتا ہے۔ مگر نوٹ اٹھانے کے بعد اس کے ذہن میں خیالات تیزی سے گردش کرنے لگتے ہیں۔ افسانے کا یہ کردار غریب اور ضرورت مند ہے۔ پانچ ہزار روپۓ کی تنخواہ پانے والا معمولی ملازم جس پر ایک بڑے کنبے کی ذمہ داری ہے اور ضرورت مند بھی۔ نوٹ پا کر وہ اپنے ذہن میں اپنی ضرورتوں کا حساب کرنے لگتا ہے مگر دوسرے ہی پل اس کے ذہن میں یہ خیال بھی سر اٹھانے لگتا ہے کہ ممکن ہے ہزار روپۓ کا یہ نوٹ کسی بچے سے کھو گیا ہو اور وہ اسے تلاش کر رہا ہو اور نہ ملنے کی حالت میں وہ گھر کس طرح جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھر کے باہر سے وہیں لوٹ آتا ہے جہاں سے یہ نوٹ اسے ملا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو کچھ تلاش کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ روپیہ تلاش کر رہا ہے یا کچھ اور۔ اور جب کہانی کا دوسرا کردار اسے بتاتا ہے کہ اس سے ہزار روپۓ کا نوٹ کھو گیا ہے اور وہ ایک غریب آدمی ہے، اس کی بیٹی کی شادی ہے اور وہ یہ نوٹ کسی دوست سے ادھار مانگ کر لایا ہے اور جب وہ اپنے دوست سے روپۓ کھو جانے کی بات کہے گا تو وہ

یقین نہیں کرے گا۔

افسانے کے دوسرے کردار کی پریشانی اور غریبی دیکھ کر وہ ہزار روپئے کا نوٹ واپس کر دیتا ہے۔اس کہانی میں وحشی سعید نے سماج کے ایک ایسے حساس کردار کی تشکیل کی ہے جو غریب اور ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ایمانداری اور شرافت کا راستہ نہیں چھوڑتا۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اب بھی ہمارے معاشرے کے مڈل کلاس طبقے میں تہذیبی وراثتیں اور اقدار باقی ہیں۔وحشی سعید کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں سماجی سروکار اور عام آدمی کے مسائل و مصائب کو نہایت خوبصورتی سے پیش کرنے کی ہنر مندی ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں انسانی دردمندی اور تہذیبی شکست وریخت کو بھی بعض افسانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

''جب ممبئی جھک جائے گی'' ایک تیز رفتار بڑے اور میٹرو شہر کی کہانی ہے جس میں وحشی سعید نے امیری اور غریبی کے درمیان موجود کھائی کو نہایت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔افسانے کا عنوان دراصل اشارہ ہے بھونچال کا جو ممبئی میں تو ذرا سی دیر کو آتا ہے مگر انسانی خودغرضی وخلوص اور امیری وغریبی کے درمیان ایک دیرپا اور واضح خلا چھوڑ جاتا ہے۔اس افسانے کے ذریعہ اس سچائی کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے کہ تیز رفتار شہروں میں تہذیبی قدروں، خلوص اور انسانی ہمدردی کی تلاش اور پیشکش دونوں فضول ہیں، کہ جہاں دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہاں ضمیر سب سے پہلے مر جاتا ہے۔

''یہ تہذیب یافتہ لوگ'' میں بھی وحشی سعید نے انسانوں کے درمیان اونچ نیچ اور رنگ ونسل کو افسانے کا موضوع بنایا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ انسان چاہے جتنا بھی تہذیب یافتہ اور ترقی پسند اور تعلیم یافتہ ہو جائے رنگ ونسل کے فرق اور سماجی

وحشی سعید نمبر

رسم ورواج اور معاشرتی بندھنوں سے رہائی حاصل نہیں کرسکتا۔

''الجھے لمحے'' انسانی جبلت اوراس کی پیچیدہ نفسیات پر مشتمل ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک کردار طاہر اپنے دوست کی بیوی کو برہنہ دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے ہزار ہا بوسے لینا چاہتا ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے ایک ایسے موضوع کو چھونے کی کوشش کی ہے جو سماجی اقدار کے خلاف ہے اور اسے ہمارا معاشرہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، مگر وحشی سعید اپنی تخلیق ہنرمندی کے سہارے اس اچھوت موضوع کو بھی نہایت عمدگی سے پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

وحشی سعید کا افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' کے افسانوں کا غیر جانبدار مطالعہ کریں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پلاٹ اور موضوعات کا قحط نہیں ہے۔ ان کی سوچ کا کینوس وسیع ہے اور وہ اپنے مطمعِ نظر کو کاغذ پر منعکس کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔ اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات و واقعات کو مشاہدات اور تجربات کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے، افسانوں کے مروجہ اسلوب سے ہٹ کر کہانی کہنے کا نیا انداز اختیار کرتے ہیں جو یقینی طور پر موجودہ عہد میں مضمحل اور غبار آلودہ ادبی فضا میں ایک طرح کی تازگی کا احساس کراتے ہیں، ان کے یہاں بھلے ہی منظر نگاری اور کردار نگاری کا فقدان ہو، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے عام موضوعات کو بھی اپنے پاورفل ڈکشن اور زبان و بیان کی انفرادیت سے متاثر کن افسانوں کا پیرہن عطا کیا ہے جس کے سبب وہ یقینی طور پر اپنے ہم عصروں میں الگ پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

وحشی سعید کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت جو مجھے نظر آئی وہ ان کے جملوں کی ساخت اور معنی خیزی ہے۔ ان کے یہاں افسانوں کا اختصار، موضوع کے عدم پھیلاؤ کے سبب نہیں بلکہ جملوں کے کساؤ، استعاروں کے استعمال اور کرداروں کے درمیان

مکالموں سے کسی حد تک پرہیز کی وجہ سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی خوبی ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ وحشی سعید کے یہاں افسانوں میں بعض جملے بیحد معنی خیز ہوتے ہیں۔ چند مثالیں اپنے اس خیال کی تائید میں پیش کرتا ہوں۔

''فرشتے بے حس ہوتے ہیں، عمل کے دائرے میں قید، حکم کے غلام''۔

(افسانہ الجھے لمحے)

''کیا یہ پتھر کی مورتی صدیوں اسی طرح کھڑی رہے گی''۔

(افسانہ دل والی)

اس طرح کے اور بہت سارے جملے پیش کیے جا سکتے ہیں مگر طوالت کے سبب گریز کرتا ہوں۔ وحشی سعید کے افسانوی سفر کا یہ مختصر سا جائزہ اس امید اور یقین کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے کہ چونکہ ان کا تخلیقی سفر جاری ہے لہٰذا وہ ان افسانوں کے آگے کا سفر اختیار کریں گے، موضوعات کی سطح پر بھی اور اسلوب اور ڈکشن کی سطح پر بھی۔



نئے امکانات اور نئی راہوں کے مسافر......وحشی سعید

☆ عرفان عارف (پونچھ)

وحشی سعید ہمارے دور کے ایسے فکشن نگار ہیں جن کے یہاں افسانہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ افسانہ، اثباتِ حیات کا سب سے موثر لسانی وسیلہ ہے...... زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک افسانے کا ہی فاصلہ ہے۔ آپ افسانہ سناتے رہیے، آپ زندہ رہیں گے......افسانہ ختم تو یقین جانئے زندگی ختم۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے ہر انسان کا افسانہ سننا اور سنانا ہر دل عزیز مشغلہ رہا ہے اور یہ صورتِ حال اب بھی قائم ہے۔ اب بھی ہمارے بہترین تخلیقی ذہن زندگی کی افسانوی تعبیر کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح، ترتیب اور تنظیم میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ فرد کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ ظلم و جبر کو، خواہ وہ کسی بھی شکل وصورت میں ہو، بہر حال رد کرتے ہیں...... وحشی سعید ایسے ہی افسانہ نگار ہیں جو صرف کہانی لکھتے ہی نہیں، لکھنے کا شعور بھی رکھتے ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' میں لکھتے ہیں کہ کہانی مشاہدے اور تخیل کے باہمی عقد سے جنم لیتی ہے۔ وحشی سعید نے زندگی کو، زمانے کو، دنیا کو ایک وحدت کے طور پر دیکھا اور اپنے مشاہدے اور تخیل کے باہمی اشتراک سے افسانے کو جو روپ دیا، ان پر کسی عنوان کی تختی لگائے بغیر کبھی انھیں اپنی فطری سادہ لوحی کے باعث سرخ وسفید روپ میں دیکھا، کبھی ان کے اندرونی اسرار و رموز اور پیچیدگیوں پر نظر ڈالی، کبھی اپنی تخلیقی تلاش میں منہمک رہے تو کبھی نظریاتی اور اصولی بحثیں کیں۔ جس کے نتیجہ میں وحشی سعید کی تحریریں کبھی بیانیہ، کبھی علامتی اور استعاراتی اسلوب میں ڈھلتی چلی گئیں۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

عہدِ حاضر میں سادہ بیانیہ سے اوپر اٹھ کر حسبِ ضرورت جو پیکر تراشی، علامتی اور استعاراتی اسلوب وضع کیا گیا اسے حد درجہ مقبولیت بھی ملی۔ وحشی سعید نے بھی اس اسلوب کے زیر اثر اپنی پہچان بنائی۔ وحشی سعید نے ذہنی طور پر پسماندہ قاری اور بودے نقادوں کی آہ اور واہ سے بے نیاز ہو کر فکشن کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ وحشی سعید نے کھوکھلی اشتہاریت، رومانی رویوں اور فارمولا زدہ کہانی سے دور کا وابستہ بھی نہیں رکھا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض فنکاروں کے یہاں علامتی افسانہ انتہائی ذاتی اور کسی حد تک فیشن کا حصہ بن کر رہ گیا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارتضیٰ کریم نے ''اردو فکشن کی تنقید'' میں لکھا ہے کہ......

> ''نئے افسانہ نگاروں میں کچھ نے علامتی، تجریدی، استعاراتی کہانیوں کو ہی ''متاعِ کل'' سمجھا ہے، کچھ کے نزدیک یہ فیشن ساز تنقید atch words سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے''۔ (اُردو فکشن کی تنقید، ص:۴۴۷)

وحشی سعید کا شمار موجودہ عہد کے قد آور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر باریک ہے۔ مشرقی اور مغربی ادب پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وحشی سعید روشن دماغ، کھلے ذہن اور آزاد خیال افسانہ نگار ہیں۔ ان کی اب تک تصانیف میں ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جا رہی ہے''، ''خواب حقیقت'' اور دو ناولٹ ''پتھر پتھر آئینہ'' اور ''ایک موسم کا خط'' شامل ہیں۔ ان تمام تخلیقات میں وحشی سعید کی بصیرت کا کھلا ثبوت ملتا ہے۔

وحشی سعید کے تینوں افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں کی مجموعی تعداد ۷۷ رہے جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے......

پہلا مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میں: کشکول، آب حیات، مٹھی اڑان آسمان، آتش بیان، طلسم کلام، پہچان، خودسری، گمراہی، سکوت در سکوت، نیا حکمران، نفی کا

وحشی سعید نمبر

قاعدہ، اندراج، ارتقا کا سانحہ، آدھے ادھورے، کرچیوں کا سفر، اندھا کنواں، کہانی کا آسیب، بت پرست، بڑا دروازہ، سوگئے داستاں کہتے کہتے اور کنوارے الفاظ کا جزیرہ۔
دوسرا مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' میں: سڑک جارہی ہے، موتی اور کرن، پتھر کا زخم، خدا کون، زنجیر، جب لوگ بولتے ہیں، عورت اور مچھلی، ترک، جوا، وہ ہار گیا، احساس کی بجلی، نجلی، وارث کی تلاش، نیلام، گناہوں کا پجاری، یادوں کی دلہن، یاد، احساس کا گھاؤ، بھنگی، دل والی، الجھے لمحے، جب ممبئی جھک جائے گی، تلخ یادیں، سودا، یہ تہذیب یافتہ لوگ، ہڑتال، ہنسی کا قتل، جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے، جمود جا جنازہ، سائے کی لاش۔
اور تیسرا مجموعہ ''خواب حقیقت'' میں: کب آئے گا وہ سقراط، میرا قاتل میرا مسیحا، نجات دہندہ، اپنا عکس اپنا آئینہ، میٹھا چشمہ اور میں، عجب پریم کہانی، لمبا آدمی چھوٹا قد، وہ صبح کب آئے گی، سرخ چادر، تصویر، آشوب آگہی، جدا جدا راستے، طوفان، گھاس کا تنکا، گھر سے کالج تک، یہ دوڑ، سگریٹ، وعدہ، تقدیر، وقت اور رنگ، آغوش، نامکمل تصویریں، مالک مکان کے نام، پردہ، زلیخا، خواب حقیقت جیسے افسانے شامل ہیں۔
لیکن میرا یہ مضمون صرف 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ' پر محیط ہے۔

وحشی سعید نے افسانے کو متنوع موضوعات اور اسالیب سے آشنا کیا ہے اور عہدِ حاضر کے افسانوی فن، تکنیک اور اسلوب کی جانب خاص توجہ دی ہے۔ انسانی زندگی اور اس کی شکست و ریخت ان کے افسانوں میں مختلف صورتوں میں اجاگر ہوئی ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ تخلیق کار کو محض حسین چیزوں کو موضوعِ سخن بنانا چاہیے جب کہ ارسطو کے نزدیک بدہیئت چیزوں میں بھی ایک مخصوص حسن ہوتا ہے اور وحشی سعید نے حسین اور بدہیئت دونوں متضاد مناظر و موضوعات کو تمام کمال و جمال کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

بیشک آج کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور پرفارمنس کا دور ہے، آج افسانہ کا مقابلہ براہِ راست

وحشی سعید نمبر

ٹی.وی سے ہے۔ یعنی آج افسانہ پڑھنے کے بجائے اسکرین پر دیکھنے کی چیز ہو گئی ہے۔ لیکن وحشی سعید الفاظ کو چراغوں کی مانند سمجھتے ہیں جو ہمارے ذہن میں تصورات کی دنیا روشن کرتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ میڈیا کتنے ہی بڑے اور دوررس نتائج کا حامل ہو جائے، لفظ کی حرمت اور اس کی عظمت پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ وحشی سعید کے چھوٹے چھوٹے عمدہ افسانے بھی بڑے بڑے معجزنما جزیرے معلوم ہوتے ہیں، جن سے تخلیقی بشارتیں اور فنی و تعمیری دستکیں ملتی ہیں۔

''رات کے اندھیرے میں جب جب میری گہری نیند ٹوٹتی ہے میری بند مٹھی میں ایک جزیرہ پناہ گزیں ہوتا ہے''۔ (افسانہ: 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ)

وحشی سعید نے ادب کو حقیقت اور زندگی سے قریب تر کرنے کا کام انجام دیا ہے، جس طرح منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں گائے، بیل، کسان اور مزدور کو ہیرو بنایا اور ادب کو زندگی کے آنگن میں لا کھڑا کیا، ٹھیک اسی طرح وحشی سعید نے اپنے افسانوں کے کرداروں کے ذریعے ادب کو حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

وحشی سعید کے افسانے واقعہ کی نقل محض نہیں بلکہ خود تشکیل واقعہ کا ہنر بن جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی یہ ایک خوبی انھیں واقعہ نویسی کے صف میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

وحشی سعید اردو کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی طرح اپنے زمانے کے فکری و فنی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ جس طرح انتظار حسین، اسد محمد خان، اقبال مجید، بلراج مینرا، نیر مسعود، سریندر پرکاش، سلام بن رزاق، محمد منشا یاد، سید محمد اشرف وغیرہ نے افسانے کے فن میں نئی نئی اور مختلف جہت کا اضافہ کیا ہے ویسے ہی جموں کشمیر

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

میں وحشی سعید افسانوی صداقت کی نئی تشکیل میں مصروف ہیں۔ وحشی سعید کے افسانے خارج کے ساتھ ساتھ باطن کی غواصی بھی کرتے ہیں۔ کشمیری معاشرہ سیاسی، سماجی دونوں حوالوں سے الجھنوں کا معاشرہ رہا ہے۔ یہاں کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو ظلم، ہجرت، قتل و غارت سے ظاہری اور باطنی چمک ماند پڑ چکی ہے۔ لیکن فنی طور پر کسی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا البتہ موضوعاتی سطح پر فسادات کا المیہ، گلابوں کے ٹوٹنے کا المیہ سب سے اہم موضوع بن کر آفاقی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ وحشی سعید کے ہاں یہ بات اس طرح آئی ہے......

''جب اندیشے باہر سے ہوں تو ذہن پریشانیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے...... خوف و اندیشے ہماری صدیوں کی غلامی کی دین ہیں''۔
(افسانہ آتش بیاں)

یا پھر ہمارے اجتماعی لاشعور میں انسانی تاریخ کی المناکی کی داستان، مرگِ انبوکا تجزیہ اور ہند و پاک کے مابین نقلِ مکانی اور ہجرت پر کشمیر کے تناظر میں اس اقتباس کو ملاحظہ فرمائیں:

''بابا......! وہ دس تھے اور میں اکیلا تھا۔ نو میرے نشانے سے بچ نہ پائے، لیکن دسویں نے مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنایا...... وہاں بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین سے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''۔ (افسانہ: منفی کا قاعدہ)

وحشی سعید کے افسانوں میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور اقتصادی پس منظر کا عمل دخل بھی نظر آتا ہے۔ وحشی سعید ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی ڈھانچے کو بنتے، سنورتے اور بکھرتے دیکھا ہے۔ ان تمام چیزوں کے اتھل پتھل سے معاشرے میں جو انتشار پھیلا اس کا اثر وحشی سعید کے افسانوں میں بخوبی

دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی ایک بڑے افسانہ نگار کی بڑی خوبی ہے جس کی طرف انتظار حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ......

"گم شدہ تجربوں کو یاد کرنا، اپنے وجود کے کھوئے ہوئے حصوں کو ازسرنو یکجا کرنے کے برابر ہے"۔ (شاعری کی تنقید از ابوالکلام قاسمی، ص: ۳۰۵)

افسانہ اندراج میں کلیسا کے پیشوا نے جب لڑکی کو نیلام کیا تو سوداگر اسے روٹی، کپڑا اور مکان کا لالچ دے کر اپنے ساتھ یہ کہتے ہوئے لے جاتا ہے کہ "میرے پاس رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا گھر ہے...... پیٹ کے لیے دو وقت کی روٹی ہے، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ہے"۔

وحشی سعید نے اپنے افسانوں میں جن علامتوں اور تشبیہوں کا استعمال کیا ہے ان میں سے کچھ پرانی ہیں لیکن وحشی سعید کے یہاں ان علامتوں کا مفہوم روایتی نہیں بلکہ عصری ہے۔ مثلاً انھوں نے ......وہ، آئینہ، ڈر، خوف، ہیبت، سبز، سرخ، زرد، کالے شخص، قد آور شخص، یوسف، پتھر، خواب، جزیرہ، پانی، قوس قزح، دشت وصحرا، وادی، در، دروازہ، مکان، شہر، گاؤں، کنواں، اندھا، مالک، مزدور وغیرہ جیسی علامتوں کو استعمال کر کے ان میں نئے مفاہیم ومطالب پیدا کیے ہیں۔ زبان اور لہجہ کے اعتبار سے بھی وحشی سعید نے اپنے افسانوں میں نئے نئے الفاظ اور استعارے استعمال کیے ہیں:

"اس شہر کا چوک......! کبھی سبز، کبھی زرد، اب سرخ کہلاتا ہے"۔ بڑا بننے کے لیے راستے کے بڑے پتھر کو ہٹانا ہوگا"۔ (افسانہ: منفی کا قاعدہ)

وحشی سعید کے افسانوں کا بنیادی عنصر وجودی ہے۔ وحشی سعید کے افسانے اپنے رنگ وبو سے ذہنِ انسانی کو مہکاتے اور نکھارتے ہیں۔ ان کا فنی ارتقائی سفر انتہائی طویل ہے۔ ان کے افسانوں میں ابتدا اور انتہا کے درمیان تجسس برقرار رہتا ہے۔ وحشی سعید نے اپنے احساسات وجذبات میں اپنی فکری رنگ آمیزی سے افسانوں کو

جنم دیا ہے۔ مشاہدات اور تجربات ان کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور پھر اپنے سماجی ارتقا کے سفر میں نئے نئے افسانے تخلیق کرتے ہیں۔ افہام و تفہیم کے یہی اشارے علامتوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

''رات کے اندھیرے میں قبرستان کے کنارے ایک تنہا جھونپڑی سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر زندگی کی واحد علامت تھی''۔
(افسانہ: سو گئے داستاں کہتے کہتے)

وحشی سعید ہر پل ہر آن نئے امکانات اور نئی راہوں کے متلاشی ہیں ان کے افسانوں میں علامتی عمل کے کئی اسلوب، کئی سلسلے موجود ہیں۔ ان کے کئی افسانوں میں صرف بعض اجزا علامتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں...... بعض افسانوں میں کوئی ایک ہی شے یا امیج ابتدا سے آخر تک بے حد معنی خیز علامتی رول ادا کرتے ہیں اور کسی افسانے کا صرف عنوان ہی افسانہ کو گہری معنویت عطا کرتا ہے۔

''سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ جو شخص شہر کے چوراہے میں شیشے کا چراغ ہاتھ میں لیے پھر رہا ہے، اس کو سنگار کیا جائے کیونکہ سورج اب تک سر پر ہے''۔ (افسانہ: کرچیوں کا سفر)

وحشی سعید کے افسانے بیشک وقت کی آواز ہیں اور اپنے عہد کی پیچیدگیوں کا ساتھ بھی دے رہے ہیں۔ لیکن اچھا اور معیاری افسانہ لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کے افسانے زندگی کی ہمہ پہلو ترجمانی پر اصرار کرتے ہیں اور ساتھ ہی ادبی اقدار کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں انسانی اقدار کا زوال، عالمی طاقتوں کی جنگی مہم، پسماندگی، افلاس، جہالت اور بے روزگاری جیسے بھیانک مسائل کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

''تمہیں اپنے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بدلنا ہوگا، ضمیر کو کچل کے رکھنا

ہوگا، زندگی کو گناہوں کا غلام بنانا ہوگا۔ ایمان کے ٹکڑے کرنے ہوں گے۔ سچائی کو دیکھ کر منھ موڑنا ہوگا، تمہیں اپنی زندگی بدلنی ہوگی"۔

(افسانہ: گناہوں کا پجاری)

۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں ایک تغیر اور انقلاب آیا۔ وحشی سعید نے بھی اس تحریک سے متاثر ہوکر زندگی کی بڑی تلخ اور برہنہ سچائیوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ وحشی سعید زندگی کے انہی حقائق کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں جن سے ان کا قریبی تعلق ہے اور جن کا مشاہدہ انھوں نے قریب سے کیا ہے کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ بے مقصد افسانہ، نہ ادب کی خدمت کرتا ہے اور نہ زندگی کی۔ وحشی سعید کی حقیقت نگاری، نفسیاتی موشگافیاں، دوررس نگاہ، جرأت آمیزی، بیباکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر تلخ مصلحانہ نظر، ان کے فن کی مجموعی وضاحت کرتے ہیں۔

"ہم تو غلام ہیں روایات کے، روایت کو توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ وقتوں سے چلا آرہا ہے...... خاندان کا تصور! اس تصور سے فرار ناممکن ہے...... مفکر اب بھی بستی بستی، گاؤں گاؤں، شہر شہر اس فرد کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے سر پر تاج رکھا جائے"۔

(افسانہ: ارتقا کا سانحہ)

وحشی سعید ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے روایتی اسلوب سے جدید تر اسلوب تک سفر کرتے ہوئے اپنے مزاج اور مٹی کی خوشبو کو افسانہ سے نکلنے نہیں دیا۔ بیشک آج کے اس تیز رفتار مشینی دور میں انسان صبح کے غم شام ہوتے ہی پرانے محسوس کرتا ہے لیکن وہ اپنی پہچان کو برقرار رکھنے کے لیے جس جدو جہد کا شکار ہے اسے وحشی سعید اپنے افسانے میں اس طرح پیش کیا ہے......

لمحے

وحشی سعید نمبر

''کیا میں مشین کا پرزہ ہی ہوں، جو گھس جائے تو پھینک دیا جائیگا......
کیا میرا کردار ہی میرا المیہ ہے؟...... میری پہچان کیوں نہیں''۔
(افسانہ: کہانی کا آسیب)

وحشی سعید نے جذبات، نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انھیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنے افسانوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں میں وسعت بھی ہے، گہرائی بھی، فکر بھی ہے اور نظر بھی ہے۔ ان کا فن زندگی اور اس کی تہہ داری کا فن ہے۔ ان کے پاس غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر غمِ ذات کا نقش ثبت کرنے کا فن ہے۔ ان کے سب افسانوں پر گفتگو ناممکن ہے کہ ''سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے''

المختصر یہ کہ...... دنیا کی تہذیب کے اہم ادوار ادب کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں۔ شیکسپیئر کا دور، ٹالسٹائی کا دور، غالب کا دور، ٹیگور کا دور، کبیر کا دور، فیض کا دور، پریم چند کا دور، ترقی پسندی کا دور، مابعد جدید دور...... اب اس بات کو دوہرانے کی ضرورت نہیں کہ اردو افسانوی ادب کی تعمیر و ترقی میں وحشی سعید کی جو خدمات اور اس صنفِ ادب میں ان کے جو کارنامے اور جو سرمایۂ فکر و فن ہے اس کے وزن و وسعت کو دیکھتے ہوئے ایک وقت وحشی سعید کا دور بھی کہلائے گا......۔



وحشی سعید کے تجریدی افسانوں میں علامت نگاری

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کے آئینے میں

☆ علی منیر، ہزاری باغ (جھارکھنڈ)

کہانی انسان کی فطرت میں شامل ہے اور جب انسان نے بولنا سیکھا تو کہانی بھی وجود میں آئی۔ دنیا کی پہلی کہانی کیا تھی؟ یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تخلیق ہی دراصل پہلی کہانی ہو سکتی ہے جس کے مرکزی کردار آدم اور حوا تھے۔ پھر ازل سے کہانی کہنے اور سننے کی پسندیدگی نے اردو زبان و ادب کو داستان سے افسانے تک کی منزلیں طے کرنے پر مجبور کیا لیکن اس سفر کے ہر ایک دور میں کہانی یا پلاٹ کی مرکزیت برقرار رہی۔ داستان سے افسانے تک اور افسانے کے بدلتے ہوئے مزاج پر سیر حاصل بحث کرنا ممکن نہیں لیکن افسانوں کے بدلتے ہوئے مزاج پر تھوڑی روشنی ڈالنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وحشی سعید صاحب کے افسانوی مجموعوں پر تنقیدی نظر ڈالنا ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہوگا۔

گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی سے روایتی افسانوں کے بعد ترقی پسند تحریک کا زوال شروع ہوا اور جدیدیت کے لیبل کے ساتھ اُفق ادب پر ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ افسانہ نگار اس رجحان کے تحت زندگی کی معنویت کی تلاش میں نکل پڑے اور اس کا ردِ عمل خالص فن اور رومانیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جہاں تک افسانوں میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا سوال ہے تو عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کا تعلق خالص زمانے سے ہے اور اس کی اصطلاح ہر دور میں بدل جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں ''جدیدیت ایک اضافی اصطلاح ہے جس کے معنی ہر نسل کے ساتھ ہر دور میں بدل

جاتے ہیں''۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جدیدیت کے ہر نئے دور کو مابعد جدیدیت بھی کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اردو افسانہ مغربی ادب سے مستعار ہے، اس لیے اس کے بدلتے مزاج پر بھی مغرب کا گہرا اثر ہے۔ کرافٹ اسٹوری اور ایبسٹر یکٹ اسٹوری بھی انگریزی زبان و ادب کی ہی مرہون منت ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے افسانے کی قدیم روایت (Craft Story) سے بغاوت کر کے اس کی ہیئت اور اسلوب میں تبدیلی کر دی تو روایتی افسانے کے ردعمل میں ایک نئی تحریک وجود میں آئی جسے اینٹی اسٹوری (Anti Story) کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے جدیدیت کو باقاعدہ تحریک نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس سے مراد نئی زندگی اور اقدار کی نئی معنویت کی تلاش ہے جو ہر دور میں جاری ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق ''آج کا ادیب کسی نظریئے کی غلامی کو قبول نہیں کرنا چاہتا''۔ آل احمد سرور کے خیال میں ''جدید دور کے تمام رجحانات اس دور کے دائرے میں آتے ہیں جو گزشتہ تیس برسوں سے ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں''۔

جہاں تک افسانوں میں علامت نگاری کا سوال ہے تو یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے جسے صرف جدیدیت سے منسلک کیا جائے۔ جدیدیت کے رجحان سے قبل ترقی پسند ادبی تحریک کے دور میں بھی علامتی افسانے لکھے گئے۔ احمد علی اور کرشن چندر اس کی مثال ہیں۔ لیکن علامتی افسانہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑے مشاہدے اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ داستانوں، اساطیری کہانیوں، کلاسیکی ادب، مختلف قوموں کی تاریخ اور تہذیب سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر علامتی افسانہ لکھنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن فیشن کے طور پر اسے اپنانے والوں نے اس صنف کو حد سے زیادہ بدنام بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر علامتوں کی کئی قسمیں ہیں جن کے طے شدہ معانی ہوتے ہیں جیسے شیشہ، پتھر، لوہا، سفید، سیاہ اور سرخ رنگ، آئینہ، کلیسا، داستانوں سے مستعار مختلف مافوق الفطرت انسانی کردار، صلیب، ہلال اور تارہ

وغیرہ۔اسی طرح فرشتہ اور شیطان کے کرداروں کا استعمال علامت کے طور پر کیا جاتا ہے۔انگریزی ادب میں دانتے نے اپنی لافانی کتاب ''ڈیوائن کامیڈی'' میں اس کا کامیاب استعمال کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ہومر کی ''اوڈیسی'' اور ملٹن کا ''پیراڈائز لوسٹ'' اور ''پیراڈائز رگینڈ'' بھی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ علامتی افسانوں میں اشاریت اور علامیت کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے برتا جارہا ہے،لیکن کیا اردو افسانوں میں ایسا ہورہا ہے؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی منٹو کو پہلا جدید افسانہ نگار مانتے ہیں۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں:
''منٹو حیرت انگیز طور پر اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں فن اور فکر کی سطح پر پختہ ذہن کا مالک نظر آتا ہے۔آج جو اردو افسانے میں نئی تکنیک ابھرتی جارہی ہے ان کا رشتہ اگر 'پھندنے' سے جوڑا جاتا ہے تو یہ غلط نہیں ہے''۔(علامت اور منٹو کا افسانہ پھندنے)

اردو افسانے کی عمر سو سال سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔اس طویل عرصے میں روایتی افسانوں کی فہرست میں شامل افسانہ نگاروں کے نام کو شامل کرنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ آج تک اردو ادب میں سب سے زیادہ جس صنف پر لکھا گیا ہے وہ افسانے کی صنف ہے۔چنانچہ وحشی سعید کے افسانوی مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کے تجریدی افسانوں پر لکھنے سے پہلے یہ ضرور چاہوں گا کہ ان افسانوں کے پس منظر میں یہ جاننے کی کوشش کروں کہ آخر تجریدیت کیا ہے؟ دراصل روایت سے بغاوت کی ایک کڑی تجریدیت بھی ہے۔روایتی افسانوں سے ہٹ کر مغربی افسانوں کی تقلید میں افسانہ نگاروں نے جدید، جدیدتر اور تجریدیت کی نئی راہ نکالی جس کی انتہا پلاٹ لیس (Plotless) کہانی اور اینٹی اسٹوری (Anti Story) تھی یعنی ایسی کہانیاں جن کا کوئی سر پیر نہ ہو اور جن میں ایک چیستانی کیفیت ہو۔

مگر ان کا لکھا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

تجریدی افسانوں کے بارے میں مختلف رائے قائم کی ہے۔ اقبال متین کا خیال ہے کہ نئی کہانی تجریدی کہانی کا روپ دھار کر علامتوں کے استعمال کا ایک پیرایۂ اظہار بن گئی ہے۔ اگر نئی کہانی یہی ہے تو یہ نئی علامتی شاعری سے کچھ کم گنجلک نہیں ہے۔ جوگندر پال کہتے ہیں کہ حیات کے بدلتے ہوئے معنی کی بہتر ادائیگی کے لیے نئی اور بہتر تکنیک ایک ناگزیر ادبی ضرورت ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان نئی تکنیکوں پر شعبدہ بازی کا گمان نہ ہو۔ مشتاق قمر کا خیال ہے کہ افسانہ تجریدی ہو یا روایتی، اس میں ایک کہانی کی فضا کا پایا جانا ضروری ہے۔ درج بالا اسکیل پر ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کے افسانوں کا تجزیہ کریں تو وحشی سعید اپنے تجریدی افسانوں کی تشکیل میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ کشکول، آبِ حیات، نیا حکمراں اور دیگر کہانیاں ظاہر ہیں تفنن طبع کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ ان تجریدی کہانیوں میں علامتوں کا خوبصورت اظہار قابل فہم انداز میں کیا گیا ہے جس سے کہانی کے معنی کی بہتر ادائیگی ہو سکے اور کہانی کی فضا قائم رہ سکے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں......

''آبِ حیات'' میں نواب غیاث الدین بیگ اور ان کے دوست حیات جاوداں کی تلاش میں بحری سفر پر نکل پڑتے ہیں لیکن حیاتِ جاوداں کی شکل میں انھیں ایک آبی پرندہ کے ذریعہ ایک اخبار ملتا ہے جس میں ایک ٹرین حادثے میں مرنے والوں کی فہرست میں تینوں کا نام شامل ہے۔ افسانہ داستانی انداز میں لکھا گیا ہے، علامتوں کا خوبصورت استعمال ہے، کہیں کوئی گنجلک نہیں ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار نواب غیاث الدین اور ان کے دو دوستوں کے ذریعہ حیاتِ دوام کی تلاش ان کو اپنی موت کی خبر تک پہنچا دیتی ہے گر چہ یہ تینوں ابھی زندہ ہیں۔

''منفی کا قاعدہ'' کسی شہر کے سبز، زرد اور سرخ چوک کی ایک تجریدی کہانی ہے جس میں علامتوں کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کہانی شاید کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی

ہے۔ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی، برف سے ڈھکی پہاڑیاں، فوجیوں کے جوتوں کی آواز، بندوق اور گولیاں، چوک پر کھڑا ہوا نوجوان، ہاتھ میں بندوق، وادی کی ایک جھونپڑی میں بیٹا اپنے باپ کے حقہ کی چلم میں تمباکو رکھ رہا ہے۔ بوڑھے نے نوجوان سے کہا: ''اب نشانہ کے لیے تیار رہو''۔ ''بابا کیا کھیتوں میں کوئی خونخوار جانور گھس آیا ہے''۔ ''بیٹے......انسان اور جانور میں بہت کم فرق ہے''۔

اور پھر اس افسانے کے اختتام پر غور کریں۔

نوجوان نے اپنے باپ کے بازوؤں میں دم توڑ دیا۔ وہاں اب بھی اس کے جوان بیٹے کی بندوق زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین سے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''۔ ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

یہ کہانی کا اختتام بھی ہے اور آغاز بھی۔ یہی وہ فنکارانہ چابک دستی ہے جو وحشی سعید کے تجریدی افسانوں کو ایک نئی پہچان عطا کرتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے افسانے مکمل طور پر علامتی ہونے کے باوجود اپنے اسلوب کی وجہ سے عام قاری کو متاثر کرتے ہیں۔

ایسی ہی ایک کہانی ''کشکول'' ہے جو مجموعے میں شامل ہے اور جو وحشی سعید کے افکار کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کہانی میں تین کردار تین علامتوں کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ایک قوس قزح ہے جو شادی کا لیبل لگا کر پتھروں کی دنیا میں کھوگئی ہے۔ دوسرا سبیل ہے جو ترتیب کو زندگی سمجھتا ہے۔ تیسرا کردار خود افسانہ نگار ہے۔ سبیل قوس قزح کا شوہر ہے جو پتھروں کی اس دنیا میں اسے ساتھ لے کر چلا گیا ہے، جہاں دل بھی پتھر کے ہیں اور پھول بھی پتھر کے اور یہی قوس قزح کی بھی دنیا ہے، جہاں وہ اپنی خوشبو کھو رہی ہے۔ اس کے علاوہ سبیل کی تین بہنیں ہیں جن میں سے کسی ایک کا دامن افسانہ نگار کو تھام

وحشی سعید نمبر

لینا ہے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ قوس قزح تو اس کے دل وجگر میں اتر چکی ہے۔ سبیل پتھر کی اس دنیا میں خود بھی پتھر بن چکا ہے۔ افسانہ نگار پتھروں کی اس دنیا میں قوس قزح کا منتظر ہے لیکن ایک دن وہ وحشت زدہ آواز میں اچانک بول اٹھی: ''چلے جاؤ...... پتھر کی اس دنیا سے چلے جاؤ۔ میں پتھر رہنا چاہتی ہوں صرف پتھر رہنا چاہتی ہوں......''۔

پتھروں کی دنیا سے ضرور واپس آیا لیکن پتھر نہ بن سکا دل کا درد روگ بن گیا۔

واقعات اور کردار کے علامتی ہونے کے باوجود افسانے میں بھر پور کہانی کا عنصر موجود ہے اور قاری کو اس کے پلاٹ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔

مضمون کی طوالت کے پیش نظر وحشی سعید کے چند ہی افسانوں یا افسانچوں پر تنقیدی نظر ڈالنا چاہوں گا، یہ افسانے ہیں: پہچان، خودسری، گمراہی، کنوارے الفاظ کا جزیرہ۔ جن میں گہرے علامتی رنگ کی جھلک ہے۔ ان سارے افسانوں میں بڑی پیچیدگی اور ابہام ہے۔ صرف ایک صفحہ پر پھیلی ہوئی ان کہانیوں میں بظاہر نہ سمجھ میں آنے والی باتیں روایتی علامتوں کی قسمیں ہیں جن کے لیے طے شدہ معانی ہوتے ہیں مثلاً خودسری، شاہکار، معمار، جنت، سنگ مرمر، عالیشان محل، آہنی سیف اور اس میں رکھی ہوئی بینائی وغیرہ۔

ان مختصر افسانوں میں ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' جو اس افسانوی مجموعے کا نام ہے اور آخری افسانہ بھی ہے، ظاہر ہے افسانہ نگار نے کسی خاص بنیاد پر ہی اسے آخر میں رکھا ہے۔ یہ مختصر افسانہ تمثیل نگاری کا شاہکار ہے۔ دولت اور اس سے حاصل ہونے والی پریشانیوں کو لے کر اس افسانے میں افسانہ نگار نے ذاتی طور پر کچھ علامتیں گڑھی ہیں جو ان کے ذاتی تجربات پر مبنی ہیں جیسے بند مٹھی، کنوارے الفاظ کا جزیرہ۔ چند سطور ملاحظہ کریں......

یہ جانتے ہوئے کہ شیشے کے محل میں رہنا خود اپنے آپ کو تیر ونشتر کا نشانہ بنانا ہوگا، میں نے پھر بھی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ اور پھر آ گئے......

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

سوچ......!انجام......!

زندگی کی جو ساعتیں میں نے سکون کے لیے وقف کی تھیں اب ان ساعتوں میں بھی اپنے آپ کو سوچ وفکر کے زنداں میں قید پاتا ہوں۔ کیا یہ دولت کی ہوس اور اس ہوس کا انجام نہیں ہے؟ بند مٹھی، کنوارے الفاظ اور ایک جزیرہ یہ علامتیں افسانہ نگار نے ذاتی طور پر گڑھی ہیں جو میرے لیے ابھی تک عقدۂ لاینحل ہیں۔

اب اس سے پہلے کہ وحشی سعید کے چند تجریدی افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے میں چاہوں گا کہ چند مشہور ناقد اور افسانہ نگار حضرات کے اقوال پر نظر ڈال لی جائے تا کہ مقررہ کسوٹی پر ان افسانوں کو پرکھا جا سکے۔ مشہور ناقد اور افسانہ نگار سلیم اختر فرماتے ہیں ''اب تک افسانوں میں وحدت تاثر پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن تجریدی افسانہ نگاروں کو پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے ارتقا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ زندگی کی وہ بھی ترجمانی کرتا ہے لیکن زندگی وہ جس طرح بے ہنگم اور منتشر پاتا ہے، اسی روپ میں پیش کر دیتا ہے۔ پہلے افسانہ نگار زندگی کے بے ربط واقعات کو ایک مربوط سلسلہ میں پرو کر ایک خاص تاثر ابھارتے تھے لیکن تجریدی افسانہ نگار ایسا کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ تلازم خیال اور شعور کی رو تجریدی افسانوں کے اہم ترین اوزاروں میں سے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا افسانہ ماضی یا حال کے خانوں میں مقید ہونے کے بجائے زمانی لحاظ سے ماورائی ہو گیا''۔ اس کے ساتھ ہی تجریدی افسانوں میں ایک مخصوص زبان کا استعمال بھی ہونے لگا۔ شہزاد منظر کہتے ہیں ''تجریدیت کے حامیوں نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ تجریدی ادب کے ساتھ ایک نئی زبان بھی معروض وجود میں آ گئی ہے جسے غیر روایتی اور غیر رسمی زبان کہنا موزوں رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ تجریدی ادب کی یہ مخصوص زبان کس کی اختراع ہے؟ یہ زبان صرف مصنف کی تخلیق ہے یا قاری بھی اس سے واقف ہے؟ اس بارے میں یہ لوگ خاموش ہیں۔ تجریدی

وحشی سعید نمبر

افسانوں کی خصوصیت یہ تصور کی جاتی ہے کہ اس کا ابلاغ نامکمل ہو چنانچہ تجریدی افسانوں کے نام پر رسائل میں ایسی تحریریں شائع ہوتی ہیں جن کا ابلاغ ذہین سے ذہین قاری کے لیے بھی ممکن نہیں ہے''۔

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تجریدی افسانوں میں افسانہ نگار، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے ارتقا سے کوئی دلچسپی نہیں دکھاتا بلکہ زندگی کو جس طرح منتشر اور بے ہنگم پاتا ہے اسی روپ میں پیش کرتا ہے۔ ایسا افسانہ ماضی اور حال کے خانوں میں مقید ہونے کے بجائے زمانی لحاظ سے ماورائی ہو جاتا ہے۔ وحشی سعید کے افسانوں سے چند مثالیں پیش کرر ہا ہوں......

''کلام اور میں دونوں بہت رات تک جاگتے رہے...... پھر میری آنکھ کب لگ گئی کہ طلسم ہوش ربا کے سارے کے سارے اوراق میرے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ لیکن طلسم کی کلام ٹوٹ گئی تھی''۔ (افسانہ: طلسم کلام)

''یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ زندہ زندہ ہے اور مردہ مردہ ہے...... دن کی روشنی روشنی ہوتی ہے اور کالی رات...... زندہ لاش کے اس شہر میں ایک نوجوان کو خبطی کہا گیا...... گالیوں سے نوازا گیا...... جوتوں کی بارش کی گئی...... پتھروں سے خوش آمدید کہا گیا، جس مکان میں اس نے پناہ لی اس کو جلا دیا گیا...... جس راستہ پر وہ چلا...... اسے کاٹ کر پھینکا گیا لیکن زندہ دل نوجوان کے لیے یہی باتیں مقبولیت کا ہتھیار بن گئیں۔ وہ اپنے مقصد پر ڈٹا رہا۔ بالآخر اس نوجوان کو صلیب پر لٹکایا گیا...... گدھ اس کا انتظار ہی کرر ہے تھے لیکن اس بار وہ لاش کا گوشت نہ کھا سکے''۔ (افسانہ نیا حکمراں)

''پھر ایک دن ایسا ہوا کہ الف لیلیٰ سے ایک شہزادی چوری چھپے بھاگ کر اس کے گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی۔ پھر وقت کا سوداگر اس نازنین کو نیلام کرتا رہا۔ نازنین کو دیکھ کر اس نے کہا...... میرے پاس دینے کے لیے ایک چھوٹا سا گھر ہے، پیٹ

وحشی سعید نمبر

کے لیے دو وقت کی روٹی ہے، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ہے''۔ (افسانہ اندراج)

''بارہ سفید گھوڑے اس بگھی کو چلا رہے تھے۔ اطلس و کمخواب میں ملبوس وہ لڑکی بگھی سے اتری...... جس کے سر پر شیر دل ملکہ کا تاج سجنے والا تھا۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم پراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا، جیسے سب کے لب سی دیئے گئے ہوں۔ اس پراسرار ماحول میں صرف لڑکی کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی''۔ (افسانہ ارتقا کا سانحہ)

''اور جب اس شخص کو شہر کے چوراہے میں سولی پر لٹکایا جائے گا تو شیشے کا چراغ ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور ہم اپنی شخصیت کو ہر لمحے نت نئے روپ عطا کریں گے''۔
(افسانہ: کرچیوں کا سفر)

''الہ دین کے چراغ سے ایک خط برآمد ہوا، لکھا تھا: دوسروں کے مرنے پر افسوس وہ کرے جس کو خود مرنا نہ ہو اور جو خود پل پل مرے اور پل پل مرنے کے بعد زندہ ہو اور اپنی زندگی میں اپنی پچھلی موت پر افسوس کرے، وہ فریب آگہی میں مبتلا ہے''۔
(افسانہ کہانی کا آسیب)

''میرے ہاتھوں میں پہلی بار رعشہ طاری ہوا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں صندل کا عصا تھما دیا۔ وہ فریب جس کو منوں مٹی کے نیچے دبا آیا تھا...... میرے کانوں میں آ کر کہنے لگی: رضو! ذرا بازار سے کچے آم لا......!'' (افسانہ بت پرست)

محولہ بالا افسانے یا اسی قبیل کے دوسرے افسانے وحشی سعید کے افسانوں میں علامت نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ یوں تو علامت نگاری کو اردو ادب میں انگریزی ادب کے ''سمبالزم'' سے مستعار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے جدید ادب کی ایک شاخ تصور کیا جائے تو ہم قدیم اردو ادب میں تمثیل نگاری کو کیا کہیں گے جس کی مثال ملا وجہی کی ''سب رس'' ہے۔ کیا اسے ہم علامت نگاری یا سمبالزم کے زمرے میں نہیں لا سکتے؟ بہرحال تجریدی افسانوں میں بہت ساری علامتیں متعین ہوتی ہیں جن کو آسانی

سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ کس کی نشاندہی کر رہی ہیں۔لیکن نامانوس علامتیں کہانی میں گنجلک پیدا کر دیتی ہیں۔وحشی سعید کے افسانوں میں جو علامتیں استعمال کی گئی ہیں وہ مبہم نہیں ہیں اور علامتوں کے معنی متعین ہونے کی وجہ سے بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں اور یہی ان کے تجریدی افسانوں کا کمال ہے جسے حاصل کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

پتھر،شیشہ،آئینہ،سیاہ ناگ، کھلی اور بند مٹھی،سفید پرندہ،لال پیلا اور ہرا رنگ،قوس قزح،مختلف مذہبی سمبول جیسے گرجا کا دروازہ،گدھ،عصا،کنوارے الفاظ وغیرہ وغیرہ۔

تجریدی افسانوں پر نقادوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان میں ماجرا یا پلاٹ کا فقدان ہوتا ہے اور اپنے ابہام کی بنا پر شاذ و نادر ہی افسانوں کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور بایں وجہ اس قبیل کے افسانے اپنے ابہام کی بنا پر اُفق سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔لیکن وحشی سعید کے افسانوی مجموعے کی تقریباً ہر ایک کہانی میں ماجرا یا پلاٹ موجود ہے۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ افسانوں میں زیریں لہروں کی طرح رواں دواں ہیں جنھیں اوپری سطح سے تلاش کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ زمان ومکاں سے ماورا ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں داستانوں کے کرداروں کا نیا روپ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کہانیوں میں الف لیلیٰ کی رومانیت اور طلسم ہوشربا کی فینٹاسی کے ساتھ ساتھ آج کے مختلف مسائل پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔اس لیے یہ فہم سے بالاتر نہیں ہیں۔ یہ سارے افسانے محض فیشن کی بنا پر نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں جو قاری کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ایسے تجریدی افسانوں کا پڑھنے والا اس کی دل سے قدر کرتا ہے اور استقبال کرتا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا بیان ایسے افسانہ نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتا ہے۔''اردو افسانوں میں اس وقت زیادہ تعداد ایسے لکھنے والوں کی

ہے جن کے فکر و احساس میں چونکہ تازگی کی آگ نہیں، اس لیے ان کے پاس نئے تجربوں کے فنی ادراک پر قادر تازہ کار نظر بھی نہیں۔ استعاراتی اور علامتی اظہار، لفظوں، علامتوں یا تجربات کا ڈھیر لگانے کا نام نہیں، نہ ہی یہ صنعت اہمال میں لفظوں کے بے ہنگم استعمال کا نام ہے۔ ایسی تحریروں کو نہ افسانہ کہا جا سکتا ہے، نہ انشائیہ اور نہ کچھ اور......"۔ اسی طرح وارث علوی کا ایسے افسانوں کے بارے میں کہنا ہے "بچوں کی طرح ہر تین منٹ پر ایک افسانہ ملک کے کسی نہ کسی گوشے میں جنم لیتا ہے"۔

غرض چیستانی کہانیاں اور گنجلک اندازِ بیان کی بنیاد پر ایسی جدید تر کہانیوں پر زوال کا سایہ منڈلانے لگا کیونکہ جدیدیت کے سب سے بڑے علمبردار ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کے رسالہ "شب خون" نے بھی اس کی وکالت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور اس قبیل کے اوٹ پٹانگ افسانوں کی اشاعت ہی تقریباً بند ہو چکی ہے۔

ایسے ناسازگار ماحول میں بھی چند ایسے افسانہ نگار جدید تر تجریدی افسانے لکھتے رہے جن کے قلم میں دم تھا۔ ان گنے چنے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام وحشی سعید کا ہے جن کے قلم کی جولانیاں آج بھی شباب پر ہیں۔

لہٰذا وحشی سعید کے افسانوں کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں مثبت علامتی روایت قائم اور دائم ہے جس کی وجہ سے اس دور میں بھی اس کی ادبی حیثیت پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ جدید عہد میں صف اول کے محقق اور نقاد ڈاکٹر ہمایوں اشرف فرماتے ہیں: "میں ادب کو بنیادی طور پر مثبت انسانی اقدار کا ترجمان سمجھتا ہوں اور ہر وہ نظریہ جو ادب اور ادب پارے کی تفہیم میں معاون ہو (خواہ کسی بھی پہلو سے) اسے قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا"۔ اور میں بھی وحشی سعید کے افسانوں کو فنی حیثیت سے قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔



وحشی سعید کی تخلیقی بصیرت

☆ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں وحشی سعید ایک ایسا معتبر و موقر نام ہے جو چند ادبی خصوصیات کی بنیاد پر انفرادیت اور مقبولیت کا حامل ہے۔ اُردو ادب میں وحشی سعید کی حیثیت ایک ناول نویس اور افسانہ نگار کی ہے۔ فنی وفکری آہنگ، چست و دُرست مکالمے، زبان و بیان کا خالص افسانوی انداز، مانوس علامتوں، استعاروں اور رمز و اشاروں کا برمحل استعمال کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ باتوں کا فنکارانہ اظہار اور سب سے بڑی خوبی افسانے میں افسانویت کو اختصار کے ساتھ انجام تک پہنچانے اور اُسے برقرار رکھنے کی توفیق وحشی سعید کو حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ تمام اختصاصی پہلو اُن کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دراصل تخلیق اور تخلیق کاری ایک نازک اور ذمہ دارانہ عمل ہے۔ تخلیقی عمل کے دوران تخلیق کار اپنے قاری کی ذہنی، نفسیاتی اور جمالیاتی کیفیتوں کو خاص طور پر دھیان میں رکھتا ہے اور اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق سے قاری کو نہ صرف ادبی لطف اندوزی فراہم کرے بلکہ اُسے دُور اور دیر تک ایسی ادبی بصیرت بھی عطا کرے جو اُس کے اصلاحِ نفس اور روحانی تربیت کا باعث بنے۔ اس اعتبار سے جب میں نے وحشی سعید کے افسانوں کا مطالعہ کیا تو میں نے یہ پایا کہ اُن کا سماجیاتی مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ حالات وواقعات اور حادثات وسانحات کو جانچنے پرکھنے والی اُن کی آنکھوں نے جدید کیمرے کا کام کیا ہے۔ اپنے ذہن کے کینوس پر جہاں اُنھوں نے زندگی کے حسین خواب سجائے ہیں تو وہیں اُنھوں نے سماج و معاشرے میں پنپ رہی اُن تمام برائیوں اور لعنتوں کو بھی موضوع بنایا ہے جن کے باعث ہمارا پورا معاشرتی نظام مفلوج ہو کے رہ گیا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے دورِ حاضر

وحشی سعید نمبر

تک ریاست جموں وکشمیر کے پُر آشوب حالات وواقعات اور یہاں کے سیاسی وسماجی مسائل اور بالخصوص یہاں کے عوام کے ذہنی خلفشار کی موثر عکاسی وحشی سعید کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے اور زندگی کے گوناگوں مسائل سے جھوجھتے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن میں زندگی کی حرارت بھی ہے اور مچلتے ارمانوں کی یخ بستگی کا احساس بھی۔ کچھ کردار اپنی انا کے قیدی معلوم ہوتے ہیں اور کچھ وقت اور حالات کے جبر کا شکار۔ غرضیکہ وحشی سعید کے افسانوں میں جتنے بھی کردار ہیں وہ اپنی حرکات وسکنات اور قول وفعل کے لحاظ سے نہایت فعال اور اثر انگیز ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کے بلند پایہ اور کہنہ مشق افسانہ نگار نور شاہ جنھیں میں آبروئے اُردو افسانہ کہتا ہوں، اُنھوں نے وحشی سعید کے افسانوں کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ مصدقہ ہے بقول نور شاہ:

> ''وحشی سعید کے افسانے پڑھ کر فوراً ہی احساس ہوتا ہے کہ اُنھیں زبان و بیان پر ایک اچھی قدرت ہے۔ اُن کے افسانوں میں گہرے مشاہدات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے کردار روزمرہ زندگی کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اُن کے کئی افسانوں میں جنس کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ (نور شاہ: 'جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگار' میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر کشمیر ۲۰۱۱ء، ص: ۱۴ تا ۱۵)۔

وحشی سعید کے تین افسانوں کے مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' (نیا ایڈیشن ۲۰۱۳ء)، ''خواب حقیقت'' (جون ۲۰۱۴ء)، ''سڑک جا رہی ہے'' (۲۰۱۴ء) اور ایک ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' (مارچ ۲۰۱۴ء) میرے مطالعے میں رہے۔ مذکورہ افسانوں کے مجموعے اور ناول تحریک ادب وارانسی (یوپی) کے زیرِ اہتمام زیورِ طباعت سے سج سنور کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ جاوید انور جو اُردو شعروادب کے فروغ اور اس کی بقا کے

لیے نہ صرف ایک فعال رُکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں بلکہ اپنی بصیرت افروز تخلیقات و نگارشات سے بھی اُردو زبان و ادب کی آبیاری میں منہمک ہیں۔ اُنھوں نے وحشی سعید کے متذکرہ افسانوں کے مجموعوں اور ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' کو نہایت خوبصورت کتابی صورت میں شائع کروایا ہے۔ میرے لیے یہاں لازم ہو جاتا ہے کہ میں وحشی سعید کے تینوں افسانوں کے مجموعوں اور اُن کے ایک ناول کا مجموعی جائزہ پیش کروں۔ میری یہاں یہ کوشش رہے گی کہ وحشی سعید کی تخلیقی بصیرت کی نشاندہی اُن کی مذکورہ تخلیقات کے حوالے سے کروں۔ یوں بھی میں تخلیق، تنقید اور تحقیق کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم خیال کرتا ہوں۔ جب بھی کوئی تخلیقی فن پارہ عالم وجود میں آتا ہے تو ایک محقق و نقاد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ غیر جانبداری سے فن پارے کے معائب و محاسن کی کھوج میں لگ جائے اور اُس کا ادبی مقام و مرتبہ متعین کرے۔

''پتھر پتھر آئینہ'' وحشی سعید کا ایک ایسا ناول ہے جو اپنے عنوان ہی کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ یعنی ہر پتھر نے اگر آئینے کی صورت اختیار کی ہے تو ظاہر ہے وہ شہر اور اُس کے مکین قابل دید ہوں گے۔ زیرِ نظر ناول دو حصوں پہ مشتمل ہے۔ پہلے حصے کو ''پتھر پتھر آئینہ'' اور دوسرے حصے کو ''ایک موسم کا خط'' کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مذکورہ ناول کا موضوع وقت اور حالات کی ستم ظریفی کے آگے انسان کی بے بسی کا اظہار ہے۔ سرور احمد، وکی، ایتا، ممتاز احمد بیگ، شہاب الدین بھٹ، رشید الدین اور شنبھو جیسے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ یہ تمام کردار اپنے قول و فعل اور ذہنی و نفسیاتی اُلجھنوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ سرور احمد اور ایتا جیسا نسوانی کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جو ناول کے آغاز سے انجام تک اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس ناول میں باقی کرداروں کی حیثیت ضمنی ہے۔ اٹھارہ ابواب پہ ناول کی کہانی کو منقسم کیا

گیا ہے۔ ڈاکٹر سرور اور وکی گہرے دوست ہیں۔ ایتا شہاب الدین کی بیٹی ہے جو انتہائی حسین مگر غرور و نخوت کے نشے میں مبتلا ہے۔ وہ ڈاکٹر سرور کو اہمیت نہیں دیتی ہے جبکہ ڈاکٹر سرور نہایت سنجیدہ ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا مصور بھی ہے۔ ایتا کا رشتہ امتیاز بیگ جیسے امیر باپ کے بیٹے ممتاز بیگ سے طے ہو جاتا ہے لیکن ممتاز بیگ اس شک میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ایتا سرور احمد کو چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ ایتا سے رشتہ توڑ دیتا ہے اور اُس کے باپ کو بابو الیکٹرک کمپنی خریدنے پر مجبور کرتا ہے گویا وہ ایک طرح سے ایتا سے انتقام لیتا ہے۔ شہاب الدین کا کاروبار گھاٹے اور خسارے میں پڑ جاتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے کنگال ہو جاتے ہیں۔ اسی غم میں وہ بیمار پڑ جاتے ہیں اور اُن کے علاج و معالے میں ڈاکٹر سرور احمد کوئی بھی کسر اُٹھائے نہیں رکھتا۔ وہ اپنے فرض کو عبادت سمجھ کر نبھاتا ہے، اپنے حسنِ سلوک اور بلند کردار سے شہاب الدین اور اُس کی بیٹی ایتا کا دل جیت لیتا ہے چنانچہ شہاب الدین اپنی بیٹی ایتا کی شادی ڈاکٹر سرور سے کروانے میں کامیاب ہو جانے کے بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' میں ناول نگار نے دہلی اور ناول کے دوسرے حصے ''ایک موسم کا خط'' میں ممبئی جیسے مہانگر کی بھاگ دوڑ اور وہاں کی غنڈہ گردی والا ماحول دکھایا ہے۔ ناول نگار کے تجربے اور مشاہدے میں جو کچھ آیا ہے اُسے اُنھوں نے تخلیقی جامہ پہنا کر بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور تجسس کی کارفرمائی یہ تمام عناصر ترکیبی کہ جن کے بغیر ایک اچھا ناول عالمِ وجود میں نہیں آتا ہے۔ وحشی سعید نے ان تمام فنی لوازمات کو بحسن وخوبی ناول کے آغاز سے انجام تک پہنچایا ہے۔ کس کردار سے کیا کہلوانا ہے، کب کہلوانا ہے اور کیسے کہلوانا ہے یا ضرورت کے مطابق منظر نگاری کو کس طرح دلچسپ اور پُرکشش بنانا ہے، ان باتوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مذکورہ ناول کی کہانی میں جھول نظر نہیں آتا

ہے۔ایک تخلیق کار کے پاس اگر بہترین تخلیقی بصیرت کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ بصیرت بھی ہوتو سونے پہ سہاگہ کہی جاسکتی ہے۔وحشی سعید کے فلسفیانہ جملے میرے اس بیان پہ دلالت کرتے ہیں۔آیئے نمونے کے طور پر کچھ اقتباسات ملاحظہ کریں:

''کالج کی زندگی خوشیوں کا گہوارہ ہوتی ہے۔یہ زندگی کا وہ مقام ہے جہاں پہلی بار احساسِ جوانی اور لطافتِ حسن کا سنگم ہوتا ہے۔زندگی بہاروں سے ہمکنار ہوتی ہے۔مزاج میں رُومانیت پیدا ہوتی ہے''۔
(''پتھر پتھر آئینہ''،ص:۷)

''احساس کی شدت کڑوے زہر کی طرح جب آدمی کے بدن میں سرایت کر جاتی ہے تب وہ اپنے اندر احساسِ ندامت پاتا ہے اور یہی احساس اُسے سر جھکانے کے لیے مجبور کر دیتا ہے...... یہ حقیقت ہے کہ زندگی ایک پگھلتی ہوئی شمع ہے جس کے سامنے سخت سے سخت آدمی پگھل کے رہ جاتا ہے''۔(''پتھر پتھر آئینہ''،ص:٦٢)

''آدمی کی فطرت ایک پہیلی ہے جسے آدمی بھی بذاتِ خود سمجھ نہیں پاتا۔یہ معمہ ہے جس میں آدمی کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔وہی آدمی جو اپنے آپ کو پہلے معصوم بےقصور سمجھتا ہے،خود کو قصوروار پاتا ہے اور ایک عجیب سا دردا ُس کے وجود کو اپنے شکنجے میں لے لیتا ہے''۔
(''پتھر پتھر آئینہ''،ص:٦٦)

مندرجہ بالا اقتباسات پہ دھیان دیجئے تو معلوم ہوگا کہ وحشی سعید نے زندگی کی بوقلمونیوں اور انسانی نفسیات کی تہہ در تہہ حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' کے مختلف ابواب میں وحشی سعید نے بہت سے مقامات پہ نہایت معلوماتی اور سبق آموز باتوں کا اظہار کیا

وحشی سعید نمبر

ہے۔قاری کوایک جہاں دیدہ قلم کار کے قلم کی جولانیوں سے ذہنی تربیت حاصل کرتا چلتا ہے۔ میں اس بات کا معترف ہوں کہ اگر ادب، سماج میں رُونما ہونے والے حالات و واقعات اور طرح طرح کے لوگوں کے جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ ادیب کے افکار ونظریات کس نوعیت کے ہیں یا اُس کے شعور و تحت الشعور میں کس حد تک حیات وکائنات سے متعلق منفی ومثبت رویئے پوشیدہ ہیں اس کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ وحشی سعید کی تخلیقات میں مجھے ایک شریف النفس، دُور اندیش اور وسیع النظری کے حامل انسان کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔

ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' کے دوسرے حصے ''ایک موسم کا خط'' کی کہانی پہلے حصے ہی کی زائدہ معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس میں پیش کیے گئے کردار، واقعات اور ماحول کسی حد تک جداگانہ ہے۔ ممبئی کے لوگوں کی کاروباری زندگی، دھن دولت کے رسیا لوگوں کی سازی ذہنیت اور پھر غندوں کی ٹولیاں، معصوم خواہشوں کی بےبسی کا عالم یہ اور اس طرح کی بہت سی باتوں کا ذکر ناول نگار نے بڑی فنی چابک دستی سے کیا ہے۔ ناول کے اس دوسرے حصے میں انل ورما اور کومل مرکزی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انل دہلی سے ممبئی کا سفر کرتا ہے اپنے بل بوتے پہ بلندیوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ ممبئی میں اُس کی ملاقات رحمت کے نام کے شخص سے ہوتی ہے۔ رحمت، انل کو کومل نام کی ایک آزاد، انانیت پسند، متکبر اور بدمزاج لڑکی کا ڈرائیور بنا دیتا ہے۔ کومل کے گھر میں بطور ڈرائیور انل کچھ عرصے تک رہتا ہے لیکن اُس کے چڑ چڑے پن سے تنگ آکر بالآخر وہ راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ کومل کے بوائے فرینڈ کی کومل سے نازیبا حرکت کو برداشت نہ کرتے ہوئے اُس سے لڑ پڑتا ہے جس کی وجہ سے کومل اُسے ڈرائیوری کے پیشے سے خارج کر دیتی ہے۔ کومل کیمیکل انڈسٹری کی مالکہ ہے۔ اپنے کاروبار کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کرتی ہے۔ انل

کے بُک اسٹال کو غنڈوں سے نذرِ آتش کروائی ہے جس پہ انل کا گہرا دوست رحمت اُس پہ برہم ہو جاتا ہے اور کومل کو دھمکی دیتا ہے۔ اِدھر کومل کا مینیجر بھی اُس کی کیمیکل انڈسٹری سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے جس کی وجہ سے دھیرے دھیرے انڈسٹری نقصان میں چلی جاتی ہے اور کومل کے دل و دماغ میں انل ورما سے متعلق شک کی سوئی گھومنے لگتی ہے کہ وہ اُس سے انتقام لینے کے لیے اُس کے کاروبار کا غارت کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ ناول میں ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے کہ جب انل کی قسمت جاگ جاتی ہے اور وہ ہرنام انٹر پرائزز اور ہرنام فلم کارپوریشن کا مالک بن جاتا ہے۔ انل ورما کی بڑھتی شہرت اور رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ دیکھ کے کومل اُسے دل ہی دل میں چاہنے لگتی ہے اور پھر وہ بالآخر اُس کی دھرم پتنی بن جاتی ہے۔ ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وقت اور حالات کس طرح نفرت کو محبت اور دوریوں کو قربتوں میں بدل دیتے ہیں جو بات پہلے بالکل ناممکن معلوم ہو رہی تھی وہی بعد میں ممکن ثابت ہوئی۔ ناول کے اس حصے میں کومل کا بوڑھا نوکر شنبھو، سادھورام، انڈسٹری کا مینیجر، رحمت اور کلاوتی جیسی عورت کا سردار بڑے موثر انداز میں اپنا اپنا رول نبھاتے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان و بیان کے صحیح برتاؤ کا وحشی سعید نے خاص خیال رکھا ہے۔ کون سا لفظ مناسب ہے اور کون سا غیر مناسب، اس کا بہتر شعور اُنھیں حاصل ہے۔ ممبئی شہر کی کاروباری زندگی کو اُنھوں نے انل ورما کے حوالے سے ایک جگہ جن الفاظ میں بیان کیا ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منظر نگاری میں بھی اُنھیں خاصی مہارت حاصل ہے:......

''انل ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ممبئی کی زندگی کا مطالعہ کرنے لگا۔ بھاگ دوڑ کی زندگی اب بھی یہاں کا خاصہ ہے۔ ہر موڑ پہ بھیک مانگنے والوں کی ٹولی اب بھی موجود ہے۔ جانے یہ لوگ بھی کب اور کیسے یہاں آئے؟ کیا ان کے پاس کوئی مقصد رہا ہوگا؟ وہ سوچتا رہا اور ممبئی کے بازاروں کی رنگینیوں میں کھو جانے لگا۔ ٹیکسی فارس روڈ سے گزر

رہی تھی جہاں کے پنجروں کے پیچھے مختلف نسلوں کی عورتیں اپنے سڑے ہوئے جسموں کا سودا اپنے گاہکوں سے طے کر رہی تھیں۔ ممبئی کی رنگینیوں میں جب کوئی بدنما پہلو اُبھرتا ہے تو فارس روڈ پہ بکنے والی ان عورتوں کے سڑے ہوئے جسم زندہ رہنے کے لیے اپنا حق مانگتے نظر آتے ہیں۔ جانے حساس آدمی اس بازار سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو کیوں بند رکھتا ہے۔ شاید وہ اس حقیقت کو ایک فریب دینا چاہتا ہے اور وہ خود سے کہتا رہتا ہے، واہمہ ہے، دھوکہ ہے''۔ (''پتھر پتھر آئینہ''، ص:۷۶)

ظاہر ہے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر وحشی سعید نے اپنے ناول کے مرکزی کردار کے حوالے سے ممبئی جیسے بڑے شہر کی جس سماجی لعنت کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروائی ہے وہ اُس سوسائٹی کی خلاقی و رُوحانی قدریں دم توڑ چکی ہیں۔ غنڈہ گردی، مافیا گروپ، بداخلاقی، بدمزاجی اور رحم وانصاف سے عاری قلب ونظر رُوحانی واخلاقی قدروں کے فقدان ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کومل اپنے حریف انل ورما سے انتقام لینے کے لیے راکیش جیسے غنڈے کو فون پہ اپنے پاس بلا کر انل ورما کو دس ہزار روپئے میں قتل کروانا چاہتی ہے۔ راکیش دس ہزار روپئے کے لالچ میں انل ورما کا قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن بعد میں وہ اُسے قتل نہیں کر پاتا ہے۔ کومل اور راکیش جیسے ممبئی کے غنڈے کے درمیان ایک مذموم ارادے کو وحشی سعید نے مکالماتی طور پر ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے......

''کومل نے تنہائی بھی حالات کا جائزہ لیا اور سوچ میں پڑ گئی کہ ہرنام کیمیکل انڈسٹری کے عروج میں بوڑھے منیجر کا ہاتھ اور بوڑھے منیجر نے کمپنی کیوں چھوڑی......صرف انل کے معاملے کی وجہ سے......۔''انل......انل......!'' وہ چیخ پڑی......میری تباہی کا باعث انل بنتا جا رہا ہے......اور میں انل کی زندگی کو ختم کر دوں گی'' اُس نے ٹیلیفون ریسیور ہاتھ میں اُٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔ ''راکیش بول رہے ہو......فوراً چلے آؤ!''

تھوڑے وقفے کے بعد ایک کالے رنگ کا آدمی کومل کے سامنے کھڑا تھا......کومل نے کہا...... ''راکیش! تمہیں وہ کتاب والا انل یاد ہوگا''۔ ''جی ہاں جس کی کتابوں کی دکان میں نے جلوادی تھی''۔ ''ہاں......کومل نے کہا'' اُس کو قتل کردو''۔ ''میڈم......'' وہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ ''دس ہزار روپئے ملیں گے''۔ ''کیوں......لیکن کیوں......؟'' ''کیوں نہیں پوچھا جائے گا، دس ہزار روپئے ملیں گے'' کومل نے کہا۔ ''اوکے! کام ہو جائے گا''۔ ''یہ لو دو ہزار روپئے ایڈوانس''۔ راکیش نے دو ہزار روپئے جیب میں ٹھونس لیے......اور کومل کو سلام کر کے چلا گیا......! کومل نے خود کو ہلکا محسوس کیا، جیسے انل کی موت ہی اُس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوگی''۔ (''پتھر پتھر آئینہ'' ص:۱۶۶)

بہر حال وحشی سعید نے ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' میں ایک مخصوص سماج و معاشرے کے تصادم کو فنی جامہ پہنا کر اپنے قارئین کے لیے غور و فکر کے باب کھولے ہیں۔ سماج میں کس طرح کے افراد کن کن مسائل میں اُلجھتے ہیں، اُن کی خواہشوں اور اُمنگوں کا بہتر اظہار مذکورہ ناول میں موجود ہے۔

جیسا کہ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ وحشی سعید کے پاس فکشن کی زبان کا وافر ذخیرہ اور اُس کو بہتر طور پر اپنی تخلیقات میں برتنے کا سلیقہ موجود ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ لکھنا انسان کا ایک فطری عمل ہے اور یہ قدرت کی ایک ایسی نعمت عظمیٰ ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتی ہے۔ البتہ کثیر مطالعے سے انسان کا تخلیقی شعور وجدان اور ذوق و شوق نکھرتا سنورتا ضرور ہے۔ وحشی سعید کے افسانوں کا متن اور اُن کا طرز اظہار اس بات کا غماز ہے کہ انھوں نے فکشن کے اہم اور بلند پایہ ادیبوں کے فن پاروں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ مجھے تو اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی مقامات پہ یہ احساس ہوا کہ اُنھوں نے افسانے اور شاعری کے درمیان خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً اُن کے تمام افسانے صیغۂ واحد متکلم سے

شروع ہوتے ہیں اور وہ قاری کو دروں بینی و جہاں بینی یا داخلیت و خارجیت میں وقوع پذیر حالات و واقعات اور احساسات و محسوسات سے نہ صرف آشنا کراتے ہیں بلکہ اُسے اس مستحسن بات پہ بھی آمادہ کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے منفی و مثبت رویوں میں بذاتِ خود خطِ امتیاز قائم کرے۔

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' وحشی سعید کا دوسرا افسانوں کا مجموعہ ہے جو ستمبر ۲۰۱۳ء میں زیرِ اہتمام تحریک ادب اشاعت پذیر ہوا ہے۔ زیرِ نظر افسانوں کا مجموعے کا عنوان ہی قاری کے ذہن میں پہلی فرصت میں حیرت و استعجاب کی اک ترنگ سی پیدا کردیتا ہے۔ وحشی سعید کی یہ ترکیب و ترتیب الفاظ معنوی حسن کے ساتھ ساتھ معنیاتی جہتوں کی حامل ہے۔ کنوارے الفاظ کی دوشیزگی اور جزیرہ اُس دوشیزگی کو تحفظ فراہم کرنے والا وہ مقام خاص ہے جہاں تک ایک عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر افسانہ نگار نے گویا ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جنھیں پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا ہے۔ درجن کے معانی و مفاہیم کی تفہیم کے لیے اعلیٰ و ارفع ذہانت کا ہونا لازمی ہے۔ مذکورہ انسانوں کے مجموعے میں شامل بیشتر افسانے علامتی نوعیت کے ہیں۔

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میں ۲۱/افسانے شامل ہیں، جن کے عنوانات کی ترتیب اس طرح سے ہے: 'کشکول'، 'آبِ حیات'، 'مٹھی اُڑان آسمان'، 'آتشِ بیاں'، 'طلسمِ کلام'، 'پہچان'، 'خودسری'، 'گمراہی'، 'سکوت در سکوت'، 'نیا حکمراں'، 'منفی کا قاعدہ'، 'اندراج'، 'ارتقا کا سانحہ'، 'آدھے ادھورے'، 'کرچیوں کا سفر'، 'اندھا کنواں'، 'کہانی کا آسیب'، 'بت پرست'، 'بڑا دروازہ'، 'سو گئے داستاں کہتے کہتے' اور 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ'۔ وحشی سعید کے کچھ افسانوں میں انتظار حسین کی طرح داستانوی اور اساطیری انداز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے مذکورہ افسانے آدمی اور انسان میں فرق، جدید معاشرے میں شرافت کے فقدان، غلط رسمیں، فرسودہ اور بے بنیاد

وحشی سعید نمبر

رواج اور عقیدے، مشینی کلچر میں صالح انسانی اقدار کا زوال، ظالموں کی ظالمیت، مظلوموں کی آہ و بکاہ، منافقوں کی منافقت، بے غیرتوں کی بے غیرتی کے علاوہ جنسی برانگیختگی کا عفریت کہ جس نے بالخصوص جدید معاشرے کے نوجوانوں اور ادھیڑ عمر کے مرد و زن کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے ایسے موضوعات ہیں جو بہت حد تک روایتی موضوعات سے جداگانہ ہیں۔ یہاں ہر ایک افسانے کا جائزہ لینا ناممکن ہے البتہ بطور مثال ایک افسانہ ''نیا حکمران'' کے حوالے سے چند اہم اور بنیادی باتوں کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔

''نیا حکمران'' وحشی سعید کے دیگر افسانوں کی طرح علامتی نوعیت کا افسانہ ہے جس کا موضوع ایک مردہ ضمیر قوم کی بے حسی ہے۔ زیر تجزیہ افسانے میں یہ یقین دہانی کروائی گئی ہے کہ انسان کو اللہ نے دوسروں کی خدمت اور غمگساری کے لیے پیدا کیا ہے لیکن جب اُس میں یہ جذبہ نہ رہے تو پھر اُس میں اور مردے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ افسانے کا آغاز آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے ہاتھوں ایک قدیم مسودے کی حصولیابی سے کیا گیا ہے اور اُس مسودے میں ایک ایسی رسم کا ذکر ہے جو پڑھنے والے کا دل دہلا دینے والی ہے کہ پرانے زمانے میں کسی ملک میں یہ رسم قائم تھی کہ جو آدمی اپنی زندگی میں نیک نامی کے ساتھ صحبت نہ رکھتا اُس کے مرنے کے بعد اُس کا جسد خاکی شہر کے چوراہے پر گدھوں کی شکم پروری کے لیے رکھا جاتا۔ افسانے کے وسطی حصے میں ہڈیوں کے پنجر میں از سرِ نو جان پڑنا اگر چہ غیر یقینی معلوم ہوتا ہے مگر کہانی کار کی مراد یہ ہے کہ ایسے عبرت آمیز واقعے کو دیکھ کر زندہ لوگوں نے اپنے برے اعمال سے توبہ کی اور ایک انقلابی جوش ولولے سے نئے صبح و شام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ افسانے کے اختتامی حصے میں افسانہ نگار کا مافی الضمیر بالکل واضح الفاظ میں سامنے نہیں آتا البتہ قاری چند علامتی جملوں کی قرأت سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ کسی قوم

کی بے حسی اور غفلت شعاری کے خاتمے کے لیے ایک ایسے حکمران کی ضرورت ہے جو انقلابی جوش و جذبے کا حامل ہو۔ مثلاً مذکورہ افسانے سے ماخوذ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ زندہ، زندہ ہے اور مردہ، مردہ ہے...... دن کی روشنی روشنی ہوتی ہے اور کالی رات...... کالی رات'' زندہ لاش کے اس شہر میں ایک نوجوان کو خبطی کہا گیا...... گالیوں سے نوازا گیا...... جوتوں کی بارش کی گئی...... پتھروں سے خوش آمدید کہا گیا جس مکان میں اُس نے پناہ لی اُس کو جلایا گیا جس راستہ پر وہ چلا...... اُس راستے کو کاٹ کر پھینکا گیا لیکن زندہ دل نوجوان کے لیے یہی باتیں مقبولیت کا ہتھیار بن گئیں وہ اپنے مقصد پر ڈٹا رہا بالآخر اُس نوجوان کو صلیب پر لٹکایا گیا...... گدھ اُس کا انتظار ہی کر رہے تھے...... لیکن اس بار وہ لاش کا گوشت نہ کھا سکے''۔ (''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ص: ۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس میں افسانہ نگار نے حق و باطل میں امتیاز کرنا ایک فرد، قوم اور ملک کے حکمران کے لیے فرض اولین قرار دیا ہے۔ دراصل جب کسی قوم میں برائی کا گراف بڑھ جاتا ہے تو اُس قوم کی زندگی کے تمام شعبوں میں انتشار اور بدنظمی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ تمام علوم و فنون، فلسفے، اصول و ضابطے اور دھرم و مذاہب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آدمی کو انسان بنایا جائے۔ اُس میں انسانی جواہر پیدا کیے جائیں، وہ نیکی کے کام کرے، بدی سے بچے، لیکن جب نیکی اور بدی میں انسانی جواہر پیدا کیے جائیں، وہ نیکی کے کام کرے، بدی سے بچے، لیکن جب نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کا جذبہ آدمی کے ذہن و دل سے نکل جاتا ہے تو پھر اُس کی ذات ذہنی خباثتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر میں حق پرستوں کے بدلے باطل پرستوں کی تعداد زیادہ ہے۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''خواب حقیقت'' میں وحشی سعید کے ۲۷/افسانے شامل ہیں۔ اُن کا یہ تازہ علامتی افسانوں کا مجموعہ ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا ہے جو صوری و معنوی حسن سے مزین ہے۔ زیر نظر افسانوں کو جن عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے وہ قاری میں قرأت کے جذبے کو بیدار کرتے ہیں۔ ''خواب حقیقت'' میں شامل افسانوں کے عنوانات پر ایک نظر ڈالتے چلیں: 'کب آئے گا وہ سقراط'، 'میرا قاتل میرا مسیحا'، 'نجات دہندہ'، 'اپنا عکس اپنا آئینہ'، 'میٹھا چشمہ اور میں'، 'عجب پریم کہانی'، 'لمبا آدمی چھوٹا قد'، 'وہ صبح کب آئے گی'، 'سرخ چادر'، 'تصویر'، 'آشوبِ آگہی'، 'جدا جدا راستے'، 'طوفان'، 'گھاس کا تنکا'، 'گھر سے کالج تک'، 'یہ دوڑ'، 'سگریٹ'، 'وعدہ'، 'تقدیر'، 'وقت اور رنگ'، 'آغوش'، 'نامکمل تصویریں'، 'مالک مکان کے نام'، 'پردہ'، 'قربان گاہ'، 'وہ زلیخا' اور 'خواب حقیقت' یہ تمام افسانے علامتی و استعاراتی انداز میں قاری کو زندگی کے نگار خانے کی سیر کرواتے ہیں۔ اُسے غور و تدبر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان تمام مذکورہ علامتی افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پہ تنوع ملتا ہے تو وہیں فنی ارتکاز کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کسی واقعے، جذبے، خیال، فکر و احساس کو کہانی بنانے کا ہُنر وحشی سعید کو آتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں اختصار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ غیر ضروری طوالت سے اُنھوں نے احتراز برتا ہے جو بڑی بات ہے۔ لفظ و معنی کی حرمت کا انھیں خاص خیال رہتا ہے۔ کسی مقام، واقعے اور ماحول کی منظر نگاری میں بھی اُنھیں اچھی مہارت حاصل ہے مثلاً اُن کے ایک دلچسپ افسانے ''میرا قاتل میرا مسیحا'' کی ابتدائی سطور میں وہ ایک جگہ اس طرح کا منظر پیش کرتے ہیں:......

> ''کمرے کے دائیں کونے میں ایک شیشے کی الماری میں کچھ عربی، کچھ فارسی اور کچھ اُردو کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی چھت کے بیچوں بیچ ایک پرانے زمانے کا فانوس لٹک رہا تھا۔ فرش پر ایرانی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

قالین تھا، دائیں دیوار کے ساتھ قدیم زمانے کا ایک صوفہ سلیقے سے سجا تھا، چاندی جڑی ہوئی میز پر چاندی کی تھال میں مختلف اقسام کے پھل رکھے ہوئے تھے۔ بائیں دیوار پر قدیم زمانے کا عالیشان گھڑیال لٹک رہا تھا جو ہر گھنٹے بعد بجتا اور وقت کا احساس کراتا ہے۔ صوفے کے سامنے والی دیوار پر خوبصورت فریم میں قدِ نما آئینہ لگا''۔

(''خواب حقیقت''، ص:۱۰)

افسانہ ''میرا قاتل میرا مسیحا'' کا موضوع گردشِ ایام میں ڈوبتے اُبھرتے انسانی وجود کا المیہ ہے۔ کہانی کار نے اپنی ذات کے حوالے سے یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ یہ وقت ہی ہے جو انسان کو بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی جانب بڑی سرعت سے دھکیلتا ہے اور پھر اُسے بالآخر موت کی آغوش میں سُلا دیتا ہے۔ پورے افسانے کا مجموعی تاثر کربِ وجود اور ایک طرح کی مخصوص آشفتہ نوائی سے تعلق رکھتا ہے۔

جون ۲۰۱۴ء میں وحشی سعید کا ایک اور افسانوں کا مجموعہ ''سڑک جا رہی ہے'' کے نام سے تحریکِ ادب (وارنسی) کے زیرِ اہتمام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں ۳۰ر افسانے شامل کیے گئے ہیں:...... 'سائے کی لاش'، 'جمود کا جنازہ'، 'جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے'، 'ہنسی کا قتل'، 'ہڑتال'، 'یہ تہذیب یافتہ لوگ'، 'سودا'، 'تلخ یادیں'، 'جب ممبئی جھک جائے گی'، 'اُلجھے لمحے'، 'دل والی'، 'بھنگی'، 'احساس کا گھاؤ'، 'یاد'، 'یادوں کی دلہن'، 'گناہوں کا پجاری'، 'نیلام'، 'وارث کی تلاش'، 'نجلی'، 'احساس کی بجلی'، 'وہ ہار گیا'، 'جوا'، 'ترک'، 'عورت اور مچھلی'، 'جب لوگ بولتے ہیں'، 'زنجیر'، 'خدا کون ہے؟'، 'پتھر کا زخم'، 'موتی اور کرن'، 'سڑک جا رہی ہے' ایسے افسانے ہیں جنھیں زندگی کے افسانے کہا جا سکتا ہے۔ چھوٹے بڑے حادثات و واقعات کو فنی لوازمات کے ساتھ

وحشی سعید نمبر

افسانہ بنانے کی وحشی سعید نے بھر پور کوشش کی ہے۔ متذکرہ بالا افسانوں میں بہت سے افسانوں کا براہِ راست تعلق جنسی مسائل اور اُلجھنوں سے ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک ادب میں جنس اور جنسی مسائل کا تذکرہ معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں جنسی مسائل کا ذکر اُس وقت مخربِ اخلاق کا باعث بنتا ہے، جب ادیب ذہنی عیاشی سے کام لیتا ہے۔ مہذب طریقے سے جنس اور جنسیات کا ذکر کسی حد تک معیوب نہیں ہے۔ وحشی سعید نے جنسی مسائل کے بیان میں متانت اور شائستگی سے کام لیا ہے۔ اس حوالے سے اُن کا افسانہ ''سڑک جا رہی ہے'' کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ افسانے کا موضوع بے جوڑ شادی کے سبب انسانی رشتوں کی پامالی ہے۔ وحشی سعید کا یہ افسانہ فنی اور موضوعاتی اعتبار سے بہترین افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ مذکورہ افسانے میں اُن کی تخلیقی بصیرت معراجِ کمال کو پہنچ چکی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ زیر نظر افسانے کے ابتدائی حصے میں مغل بادشاہوں کی کشمیر میں آمد اُن کے بعد انگریزوں کا عمل دخل اور جاگیرداری نظام سے متعلق کچھ اہم باتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بانکے لال اور چاند بائی کے ازدواجی رشتے کا ذکر افسانہ نگار نے نہایت دلچسپ الفاظ میں کیا ہے۔ بانکے لال کسی زمانے میں بہت دولت مند تھا اور چاند بائی اپنے زمانے کی مشہور ومعروف اور بدنام زمانہ طوائف، جب اُس کی جوانی ڈھلنے لگتی ہے تو وہ بانکے لال کو اپنا شوہر بنانے کی فکر میں رہتی ہے اور پھر وہ دونوں ایک دن خاوند اور بیوی بن جاتے ہیں۔ چاند بائی کے بطن سے ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے جس کا نام نینا رکھا جاتا ہے۔ جوانی کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی نینا کے قدم بہک جاتے ہیں وہ رمیش نام کے لڑکے سے عشق کرنے لگتی ہے۔ والدین کو جب نینا کے معاشقے کا پتہ چلتا ہے تو وہ اُس پہ پہرے بٹھا دیتے ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ عشق پہ زور نہیں چلتا۔ نینا کچھ عرصے کے بعد ایک اور

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

لڑکے موہن کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ بانکے لال اپنی بیٹی کی اس بے راہ روی پر کافی دُکھی ہو جاتا ہے اور وہ موہن کے باپ سُورداس کے پاس جا کر اُسے موہن کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے کی بات کرتا ہے لیکن سُورداس اس بات پہ راضی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے بانکے لال انتہائی رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے غلط رویئے کے باعث بیمار پڑ جاتا ہے اور پھر ایک دن اس جہانِ فانی سے ملکِ عدم کی طرف کوچ کر جاتا ہے۔ چاند بائی ایک شخص کے جھانسے میں آ کر اپنی خوبصورت بیٹی نینا کا رشتہ ہری لال جیسے عمر رسیدہ آدمی کے ساتھ دو لاکھ روپئے کے عوض میں کر دیتی ہے۔ مگر سہاگ رات ہی کو نینا جنسی تسکین کے لیے تڑپتی ہے اور اپنی قسمت کو کوستی ہے کیونکہ ہری لال کے بوڑھے وجود میں جنسی جرثومے اور ترنگِ مجامعت نام کی کوئی بھی چیز باقی نہیں ہوتی ہے۔ ہری لال کا جوان اور شادی شدہ بیٹا شیکھر اپنی بیوی رادھا کے ہمراہ کلکتہ میں رہتا ہے۔ وہ وہاں وکالت کے پیشے سے جڑا ہوتا ہے کچھ دن کے لیے وہ اپنی بیوی رادھا کے ساتھ گھر آتا ہے، نینا اُسے دیکھ کر دل ہی دل میں چاہنے لگتی ہے مگر زبان سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتی ہے۔ کچھ دن کے بعد وہ واپس کلکتہ چلا جاتا ہے۔ ہری لال کا چھوٹا بیٹا برج یونیورسٹی میں فرسٹ آتا ہے۔ ہری لال کی زبانی یہ خوشخبری سن کر نینا بہت خوش ہو جاتی ہے۔ پھر مذکورہ افسانے میں ایک حیران کن موڑ ایسا بھی آتا ہے کہ برج اپنی سوتیلی ماں نینا کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ ہری لال کو جب اس معاملے کا پتا چل جاتا ہے تو وہ اُن دونوں پہ لعنت بھیجتا ہے اور دُکھی ہو کر اپنا گھر بار چھوڑ کر خونی بنگلہ نام کی ایک پرانی تاریخی عمارت کے سامنے بھکاری کا روپ دھارن کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ برج اور نینا جب ہری لال کے گھر سے بھاگ کر خونی بنگلہ میں رہنے لگتے ہیں تو وہاں ایک بھکاری کو دیکھتے ہیں، اُس کے ہاتھ پہ بیس روپئے رکھتے ہیں۔ ہری لال اُنھیں دعا دیتا ہے کہ تمہاری جوڑی سلامت رہے، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اُن

دونوں کو پہچان لیتا ہے اور شدتِ حیرت وغم کی تاب نہ لاتے ہوئے وہیں دم توڑ دیتا ہے۔

وحشی سعید کا افسانہ ''سڑک جارہی ہے'' اپنے آپ میں ایک مکمل اور جاندار افسانہ ہے۔اُنھوں نے اس افسانے کے حوالے سے چند اہم باتوں کا ذکر کیا ہے۔پہلی بات یہ کہ 'وقت' سب سے عظیم طاقت ہے جو ہر چیز کو ختم کر دیتی ہے، جس طرح بانکے لال کے پاس دولت اور شہرت نہیں رہتی ہے اُسی طرح چاند بائی جیسی طوائف کا حسن و شباب اور اُس کے پازیب کی جھنکار بھی ختم ہوگئی۔ دوسری بات یہ کہ مجبوری انسان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے کہ انسان لاکھ کوشش کے باوجود کچھ نہیں کر پاتا ہے۔ تیسری اہم بات یہ کہ جنسی ہوس میں مقدس رشتے تک پامال ہو جاتے ہیں۔آیئے یہاں نمونے کے طور پر مذکورہ افسانے سے ماخوذ ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس سے نہ صرف وحشی سعید کے اُسلوبِ بیان اور زبان کا صحیح اندازہ ہوگا بلکہ جنس زدہ کرداروں کی نفسیات کا بھی پتا چلے گا:......

''نینا نے اعصاب پہ قابو پاتے ہوئے کہا ''میں...... میں تمہاری ہوں'' پھر اُس رات کالے بادل اور نہ ہی بجلیاں اُن کے ارادوں میں حائل ہوئے۔ نینا عورت بن گئی۔اُس کے ارمانوں میں بہار آ گئی، وہ خود کو ہوا میں چلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی اُس نے برج سے کہا، ''آؤ برج! کہیں بھاگ جائیں'' برج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا'' ہم بھاگ سکتے ہیں، مگر نہیں بھاگیں گے''۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی قربت کے بغیر پیاسا محسوس کرتے۔ رشتوں نے ضمیر کو بہت عرصے تک جھانسے میں رکھا۔ ہری لال اپنے باغوں اور کھیتوں میں مصروف تھا۔ پیچھے کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے، وہ نہیں جانتا تھا۔ پھر اچانک اُس کی بوڑھی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ناک نے کچھ سونگھنا شروع کیا۔ ایک دوپہر ہری لال چپکے سے برج کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں نینا اور برج کو محوِ بوسہ پایا۔ بوڑھا ٹوٹ گیا، اُس نے کہا ''برج''۔ برج اور نینا کو ہوش آیا۔ اچانک وہ چیخ پڑا ''لعنت ہو تم پر، تم میرے بیٹے ہو......نہیں......نہیں۔ تمہاری رگوں میں میرا خون نہیں، تم کمینے ہو، تم ذلیل ہو''۔ برج تھوڑی دیر تک کے لیے خاموش رہا پھر سنجیدہ آواز میں بولا ''پتا جی کون ذلیل ہے؟ کون کمینہ ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا، تم نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کی، میں نے اُسے خوشی دی، زندگی دی''۔ ''تم نے ماں کے رشتے پر حملہ کیا''۔ ''پتا جی! رشتے ہم خود ترتیب دیتے ہیں''۔

(''سڑک جارہی ہے''، ص: ۱۶۷)

محولہ اقتباس کے تناظر میں یہ کہنا موزوں معلوم ہوتا ہے کہ بے جوڑ شادیاں ہمارے سماج میں حرام کاری کا باعث بنتی ہیں۔ بعض اوقات یہ بے میل ازدواجی رشتے طلاق کی صورت اختیار کرتے ہیں یا پھر پس پردہ ناجائز تعلقات قائم کیے جاتے ہیں۔ وحشی سعید نے مذکورہ افسانے میں ایک اہم مسئلے کو چھیڑا ہے۔

وحشی سعید کے ناول اور اُن کے افسانوں کے مجموعوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ اُن کے افسانے بصیرت افروز ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں اُن کے افسانے ایک الگ سا ذہنی حظ فراہم کرتے ہیں۔ پلاٹ، کردار، ماحول وفضا، مکالمہ، وحدتِ تاثر اور تجسس فنی ترتیب میں ڈھل کر قاری کو قصہ پن کی چاشنی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ وحشی سعید نہ صرف کشمیر اور کشمیری ماحول و مناظر کے افسانہ نگار ہیں بلکہ بیرونِ ریاست کے بڑے شہروں خاص کر ممبئی اور دہلی کی تیز رفتار زندگی اور وہاں کے ماحول و معاشرے کو بھی اپنے ناول اور افسانوں

میں پیش کر چکے ہیں۔

ہم قلمکار دراصل تجربات ومشاہدات اور جذبات واحساسات کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ادیب رُلاتا بھی ہے ہنساتا بھی۔وہ اپنے افکارونظریات اور تجربات ومشاہدات سے علم وآگہی کے نئے باب کھولتا ہے۔جذبات واحساسات کے اس کھیل میں جو کھلاڑی زیادہ اچھا کھیلتا ہے اُتنا ہی وہ عوام میں مشہور ومقبول ہوتا ہے۔پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، قرأۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، جوگندر پال، رام لعل اور بہت سے نامور ادیبوں نے انسانی جذبات واحساسات کے عمدہ کھیل کھیلے ہیں۔شاعری میں بھی میر تقی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ، چکبستؔ اور کئی اہم شاعروں نے اپنے اپنے طور پر نہایت متاثر کن کھیل کھیلا ہے۔میں اپنی بات جاوید انور کی اُس رائے پہ ختم کرتا ہوں جو اُنھوں نے وحشی سعید کے بارے میں قائم کی ہے۔جاوید انور ایک جگہ لکھتے ہیں:......

> ''وحشی سعید جموں وکشمیر کے وہ نمائندہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بہت کم وقت میں اُردو افسانہ افسانوی ادب میں اپنے مستحکم نقش ثبت کیے ہیں۔ بیانیہ کی واپسی کے بعد عہد حاضر میں اُن کے افسانوں کا اُسلوب افسانے میں قصہ پن کے بہترین استعمال کی عمدہ مثال ہے''۔



وحشی سعید......اپنے افسانوں کی کہکشاں میں

☆ احمد عثمانی (مالیگاؤں)

اس جگمگاتی اردو دنیا میں افسانہ نگاروں کی طویل قطار ہے۔ اس طویل قطار میں کبھی نگاہ دوڑتی ہے تو وہ وحشی سعید پر جا کر رک جاتی ہے۔ طویل قطار میں کھڑے ہوئے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز۔

وحشی سعید نے اردو دنیا کو اچھے افسانے دیئے۔ وہ علامت کے جنگل سے سلامت روی سے گزرے۔ کہانی کو زمین پر لے آئے پھر کہانی نے آسمان میری مٹھی میں لے لیا۔

''آسمان میری مٹھی میں'' صبح کی پہلی کرن کی طرح اور شام کے ڈوبتے سورج کو شفق کے ہالے میں دیکھنے کے قابل۔ سیدھا سادھا زمینی افسانہ ہے جو دل کے تارون کو وائلین کے تاروں کی طرح چھیڑتا ہے اور دل بجنے لگتا ہے۔ وحشی سعید نے خوبصورت موڑ دے کر اس زمینی حقیقت کو کئی زاویئے دیئے ہیں۔ ایک انسان کی وحشت، انسان کی خودغرضی، انسان کی دل شکنی، آدمی بن گیا انسان، پھر اسی افسانے کو دوسرا موڑ دیا۔ قدرت کا جہاں انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں وہ تنکا ہے، سیلاب میں بہہ جانے والا۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ فانی نہیں بلکہ قائمی ہیں وہ اپنے آپ کو بہت ہی اونچا سمجھتے ہیں اور اونچا بننے کے لیے اپنوں کو چھوڑ دیتے ہیں، وہ آخر کار مٹی کا ٹیلا ثابت ہوتے ہیں۔

اس افسانے میں زندگی کی سچائیوں کو وحشی سعید نے بڑی چابک دستی سے اجاگر کیا ہے اور آدمی کی خباثت کو بھی۔

وحشی سعید نمبر

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' وحشی سعید کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اکیس افسانے ہیں۔ مجھے وحشی سعید کی یہ ادا بہت بھائی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ کسی کا سہارا نہیں لیا۔ کسی بڑے آدمی یا کسی اونچے فنکار یا افسانہ نگار کی سیڑھی انھوں نے اپنے افسانوں کے لیے نہیں لگائی۔ جو کچھ لکھا اسے بڑے اعتماد کے ساتھ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' میں سجا دیا۔ یہ سچے اور اچھے فنکار کی نشانی ہے۔ وحشی سعید اس لیے بھی ممتاز ہیں کہ انھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے ثقیل اور ناسمجھ میں آنے والی اصطلاحوں کو بہت پیچھے ڈل جھیل میں ڈبو دیا اور زمینی سچائیوں کا ایک جزیرہ اصطلاحوں کے سمندر سے ابھار کر زمینی سچائیوں کا نخلستان بنا دیا۔ اس خوبصورت نخلستان کی سیر کرنے پر بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ وحشی سعید افسانے کی باریکیوں کو نہیں جانتے۔ وہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو بہت قریب سے جانتے ہیں، علامتوں سے بھی انھیں انسیت ہے لیکن علامتوں کے بے سمت جنگل میں وہ بھٹکے نہیں۔ ترقی پسندی کی خودرو پگڈنڈیوں پر بھی وہ چلے ہیں لیکن انھوں نے ایک حد تک ہی اس سے نبھایا ہے۔ جدیدیت کے دور میں آئے تو اس سے بھی ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر تک ساتھ نبھایا لیکن ہمیشہ کے لیے گلے نہیں لگایا۔ مابعد جدیدیت کیا ہے؟ یہ تو ہماری سمجھ سے بالا ہی بالا ہے۔ ہم صرف اتنا سمجھ سکے کہ کوئی بھی فنکار کسی بھی ''پسندی'' کو ساتھ لے کر نہیں چلتا۔ وہ تخلیق کرتا ہے اور تخلیق کسی ازم کی اسیر نہیں ہوتی۔ فنکاری آزاد ہوتی ہے، ہوا کی طرح خوشبو کی طرح، بہتی ندی کے پانی کی طرح، کھلے آسمان کی طرح، چمکتے چاند کی طرح، چاند کے قریب رہتی چکور کی طرح، روشن کہکشاں کی طرح قوس قزاح کے ہفت رنگ کی طرح۔

وحشی سعید کے افسانوں میں سب کچھ ہے، بس ضرورت ہے انھیں پڑھنے کی اور

محسوس کرنے کی۔

ویسے تو وحشی سعید کے تمام افسانے قابل مطالعہ ہیں۔ اگر میں تمام افسانوں کی خوبیاں اور خامیاں لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب ہو جائے گی۔ اس لیے میں صرف ان کے افسانہ آب حیات کے بارے میں بتاؤں گا کہ یہ افسانہ انھوں نے کتنی خوبصورتی سے لکھا ہے اوران کے خلاق ذہن نے جو کچھ افسانے میں ہم کو دیا ہے وہ بڑا ابلیغ پیغام ہے۔ یہ پیغام تو بہت پہلے سے ہمیں دیا گیا ہے لیکن وحشی سعید نے اس پیغام کو کتنی خوبصورتی سے ہم تک پہنچایا ہے، یہ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

انسان جو طویل زندگی کی آرزو کرتا ہے اس کے لیے وہ بہت کچھ جتن کرتا ہے۔ پھر بھی وہ فانی ہے۔ اس کے فنا ہونے میں دو کلام نہیں۔

اس خیال کو وحشی سعید نے ''آب حیات'' پلائی ہے۔ خیال زندہ رہتا ہے، آدمی زندہ رہتا ہے۔ اسی خیال کو واضح کرنے کے لیے وحشی سعید نے ''آب حیات'' کا کمال دکھایا ہے۔ یہ انھیں کا وصف ہے کہ اتنے نازک خیال کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا۔

مجھے وحشی سعید کا ایک اور چھوٹا سا افسانہ ''آتشِ بیاں'' بہت ہی پیارا لگا۔ اس افسانے میں آتش تو نہیں ہے، نہ شعلہ بیانی ہے، پھر بھی یہ آتش بیاں ہے۔

''کیا اور کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟'' اسی آتش میں انسان ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔ اس افسانے کا ہر جملہ تخت طاؤس پر براجمان دکھائی دیتا ہے۔

دیکھئے......

''سالہا سال سے یہ کیا ہمارے ذہنوں کو ہیبت کے بوجھ تلے دبا رہا ہے''۔

''جب اندیشے باہر سے ہوں تو ذہنی پریشانیوں کی آماجگاہ بن جاتے ہیں''۔

خوف اور اندیشے ہماری صدیوں کی غلامی کی دین ہیں۔ جب تک ہم خود اعتمادی

سے اپنے آپ کو دور رکھیں گے، تب تک یہ خوف اور اندیشے ہم پر حاوی رہیں گے۔

لیکن سوچوں نے پھر ہمیں ''کیا'' کے حوالے کر دیا۔ وحشی سعید کا یہ افسانہ اردو ادب میں ڈل جھیل میں تیرتے ہوئے خوبصورت شکارے کی طرح دکھائی دینے والا ہے۔ وحشی سعید نے ایک باریک نہ دکھائی دینے والے لاسلکی کو کتنے خوبصورت موڑ دیئے ہیں۔ یہ کیا انسان سے اوجھل رہ کر بھی شیطان کی طرح ہمارے ذہنوں میں بس جاتا ہے اور اس کیا کے اندیشے میں انسان مرنے تک الجھا رہتا ہے اور اس الجھن سے اس زمین پر باغ بھی کھلتے ہیں۔ اس کیا سے زمین پرورش بھی پھیلتی ہے اور جب آدمی اس کیا کے نرغے میں بری طرح آجاتا ہے تو دہشت کا دہانہ بھی کھل کر انسانوں کے لیے مصیبت کے پہاڑ بھی کھڑے کر دیتا ہے۔ آج کچھ لوگ دنیا میں کیا کے نرغے میں پھنس کر انسانیت کے دشمن بن گئے ہیں۔ پھول جیسے معصوم بچے بھی انھیں نظر نہیں آتے ہیں۔

وحشی سعید کی تحریر میں ڈل جھیل کی طرح ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ کسی پہاڑی ندی نالے کی طرح روانی ہے۔ اس روانی کی وجہ سے ان کے افسانوں میں کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وحشی سعید نے بڑی مشقت اور کسب سے اپنی تحریر میں روانی لانے کی کوشش کی ہے۔ مشقت اور کسب سے شعر گھڑا جائے یا افسانہ، دونوں ہی اپنا حسن کھو دیتے ہیں۔ وحشی سعید کی تحریر میں جو حسن ہے وہ فطری ہے۔ میک اپ سے نہیں ہے جو کہ کئی افسانہ نگاروں کے یہاں ہوتا ہے اور ان کی تحریریں کہیں نا کہیں کرشن چندر سے جا ٹکراتی ہیں یا پھر مشتاق احمد یوسفی کے آب گم میں گُم ہو جاتی ہیں لیکن وحشی سعید کی تحریر میں روانی اور شعریت خود رو ہے، مصنوعی نہیں ہے، دیکھیے: ''وہ خوشبو کھو رہی تھی، وہ جانتی تھی اور یہی احساس جان لیا تھا۔ کاش احساس بھی مردہ ہو جاتا''۔ (کشکول، ص:۵)

''اور مرنے والوں کی فہرست میں اُن تینوں کے نام بھی تھے، خبر پڑھ کر تینوں

حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے''۔(آب حیات، ص:۱۴)

''نقصان کا فائدہ ہمیشہ بھاری لگتا ہے''۔(مٹھی، اڑان، آسمان، ص:۱۱)

''ابھی وحدت کا لفظ ملا......ورنہ آئینہ کب کا ٹوٹ گیا ہوتا''۔(آتشِ بیاں، ص:۱۸)

''آدمیوں کے قافلے میں ...... میں کیا صرف اکیلا انسان تھا؛ کوئی اور بھی تھا''۔

(بڑا دروازہ، ص:۱۱)

''...... پھر میری گہری نیند ٹوٹتی ہے، میری بند مٹھی میں ایک جزیرہ پناہ گزیں ہوتا ہے''۔(کنوارے الفاظ کا جزیرہ، ص:۱۱)

اگر ہم وحشی سعید کے افسانے پڑھنے لگیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنا طرزِ تحریر خود ہی اپنایا ہے۔ان کی تحریر دوسرے افسانہ نگاروں سے انھیں جدا کر کے ممتاز بنا دیتی ہے۔



وحشی سعید......''خواب حقیقت''

☆ محمد قسیم اختر

بظاہر افسانہ نگاری ایک آسان فن نظر آتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک آدمی اپنے دماغ میں کوئی کہانی بنے اور پھر اسے لفظوں کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر اتار دے، لیکن جب افسانے میں فن کی بات ہوتی ہے تو یہ صنف پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تمام افسانہ نگار ایسے افسانے لکھتے ہیں جو فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں یا کوئی ایسا بڑا فنکار بھی نہیں جس کے سبھی افسانوں میں فن کی بالیدگی ہو۔ خصوصاً اس عہد میں جب افسانے کا براہِ راست انسلاک علامت سے ہو۔ جدید دور میں افسانہ نگاری اسی راستے ہو ہو کر گزرتی ہے لیکن یہ راستہ اتنا پر پیچ ہے کہ بہت سے فنکار بھٹک گئے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ وحشی سعید اس راہ سے صحیح سلامت گزرے ہیں۔ یہ محض دعویٰ نہیں، ان کے افسانوں کو پڑھنے سے صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اپنے افسانوں میں انھوں نے علامت سے براہِ راست واسطہ تو رکھا مگر ان میں ایسی علامتیں نہیں ہیں کہ افسانہ چیستاں بن جائے اور قاری کی سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی علامت میں رمزیت و ایمائیت ہے، اشارے اور کنائے ہیں جن کے ذریعے قاری افسانے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر ان کا افسانہ ''خواب حقیقت'' جو ٹائٹل کہانی ہے کو دیکھا جاسکتا ہے یا اسی مجموعے میں شامل ''زلیخا'' بھی قابل توجہ ہے۔ یہ ڈیمائی سائز پر مشتمل ڈیڑھ دو صفحے پر پھیلے ہوئے افسانے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وحشی سعید نے قدرے طویل افسانے کم ہی لکھے ہیں۔ زیادہ تر افسانے مذکورہ صفحات تک ہی محدود ہیں۔ بہرحال ان چھوٹے چھوٹے افسانوں میں بھی وہ اپنے مطلب اور کام کی بات بڑی آسانی اور

وحشی سعید نمبر

چابک دستی سے کہہ جاتے ہیں۔ قاری کو کہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، یہ ان کی فنکاری ہے۔ ان کی اس فنکاری کو "خواب حقیقت" کو سمجھتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ ایک مصور اور ایک حسینہ کے گرد گھومتا ہے۔ مصور جب کورے کاغذ پر رنگوں کی بوچھار کرتا ہے تو حسینہ ان بکھرے ہوئے رنگوں کو دیکھ کر کسی خوبصورت تصویر کی تخلیق کا تصور کرتی ہے اور یہ بھی کہتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ چوم لوں۔ مصور اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیتا ہے۔ کہانی میں اس مقام پر ایک گیپ ہے۔ پیرا تبدیل ہوتا ہے اور افسانہ نگار دکھاتا ہے کہ وقت نے رفتار پکڑی اور کورے کاغذ پر ایک دلہن کی تصویر ابھر آئی۔ لیکن وہ اسے رنگوں سے سجا نہیں پاتا۔ یہاں پر علامتی انداز بیان اختیار کرتے ہوئے افسانہ نگار اس کی وجہ بیان کرتا ہے کہ مرد تھرکنے لگے، عورتیں ناچنے لگیں، گانے بجانے، بینڈ باجا سب آ گیا۔ دلہن کے خوبصورت ہاتھوں میں مہندی لگی۔ اسے پالکی میں سوار کیا گیا اور جاتے جاتے دلہن نے اس کے ماتھے کو چوم لیا۔ اور اس لمحے میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ یعنی اس نے جو ایک خواب دیکھا تھا وہ ٹوٹ گیا اور رات کے اندھیرے میں اس کا سب کچھ ڈوب گیا۔ اور وہ قبرستان کی جانب دوڑ پڑا۔ یہاں وحشی سعید قاری کے ذہن کو ایک اور جانب منتقل کرتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں وہ اس لیے گیا کہ وہاں اس نے اپنی ماں سے بھی عزیز گڑیا کو سپردِ خاک کیا تھا۔ پھر وقت نے ایک اور کروٹ لی اور اس کے ہاتھوں میں کھردرے پتھر آ گئے۔ ان پتھروں سے شاہکار نکل کر کلیساؤں میں سجنے لگے یعنی اب وہ ایک مصور سے سنگ تراش بن گیا۔ افسانہ نگار یہاں ہمیں پھر پیچھے کی طرف لے جاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کا برش کبھی رادھا، کبھی میرا کو کینوس پر ابھارتا، لیکن اس کے خوابوں اور اس کی آنکھوں میں سجی ہوئی حسینہ ابھی تک کورے کاغذ پر نہ اتر سکی تھی۔ اس سے ہم یہ مراد لے سکتے ہیں کہ اس کا خواب اس منزل پر آ کر بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو

وحشی سعید نمبر

جاتی۔اس کی کوشش جاری رہتی ہےاور وہ لمحہ آتا ہے کہ حسینہ کاعکس وہ کینوس پر اتارنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔اور وہ دنیا سے بے نیاز ہوکر اسے دیکھنے لگتا ہے۔اسی کیفیت میں کئی دن گزرنے کے بعدایک دن وہ محسوس کرتا ہے،اس عکس کو گویائی عطا ہوگئی ہے، وہ چونکتا ہے کہ کیاعکس بھی بولتے ہیں؟ وہ حیران ہے کہ یہ کب اور کیسے ہوا؟ اتنے میں عکس بول پڑا......

''فریب اور حقیقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے''۔

پھر وہ الماس، نیلم اور زمرد جیسے پتھر چنتا ہے اور حسینہ کو ان پتھروں سے سجانے لگتا ہے۔لیکن افسانہ نگار کواحساس ہے کہ یہ خواب کی سی کیفیت بہر حال خواب ہی ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کہتا ہے''حسینہ جوکل تک حقیقت تھی آج پھر خواب ہوگئی''،ایک بار پھر وہ رو پڑا اور تصویر کو نذرِ آتش کر دیا۔اور پھر اپنی دنیا میں کھو گیا۔وہ اپنے معمول کی زندگی جینے لگا یعنی تصویریں بناتا رہا اور فروخت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ زندگی کے اس پڑاؤ پر پہنچ گیا جہاں آنکھوں کی بینائی جواب دینے لگتی ہے۔اس پڑاؤ پر اس کا خواب یعنی حسینہ ایک بار پھر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔مصور سوال کرتا ہے کون ہوتم ؟اس کا مختصر جواب ہوتا ہے''حسینہ''، پھر مصور پوچھتا ہے''فریب یا حقیقت''،حسینہ آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے''بزرگ میرے ہاتھ میں ہاتھ دو''۔افسانہ نگار لکھتا ہے......

اس کی آنکھوں کے آنسو شل ہوگئے۔

''کیا حقیقت اتنی تلخ ہوتی ہے''۔

پھر اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں بند کرلیں، کسی نئے خواب حقیقت کے لیے۔

کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے اور اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ جاتی ہے۔قاری کو

وحشی سعید نمبر

سوچنے اور سمجھنے کے لیے اور مختلف معنی و مطالب اخذ کرنے کے لیے۔ یہاں مجھے تحریک ادب کے مدیر جاوید انور کی یاد آتی ہے جو اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامتوں کی اس نوعیت کے ساتھ اگر پورے افسانے کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بہترین علامتی افسانوں کی فہرست میں اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ یا بہت کچھ کہہ دینے کا فن یقیناً بڑی عرق ریزی اور ذہانت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس افسانے میں کرداروں کے مکالمے کے ذریعہ سے جن حالات کا وحشی سعید نے نقشہ کھینچا ہے اس میں بیانیہ کے دوسرے عناصر مثلاً پلاٹ، قصہ پن، واقعات کے حوالے سے حالات کی منظر کشی، ان میں شعوری یا لاشعوری طور پر غضب کا توازن ہے''۔

(اسرارِ خواب حقیقت، جاوید انور، تحریک ادب، شمارہ نمبر: ۱۹)

میں سمجھتا ہوں اس اقتباس کے بعد اس افسانے کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک چھوٹے سے افسانے میں ایک تلخ حقیقت کو وحشی سعید نے بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

میں نے قبل کی سطور میں ان کے ایک افسانہ ''وہ زلیخا'' کا بھی نام لیا تھا۔ اس میں بھی زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو بیان کیا گیا ہے مگر یہاں علامتی پیرایۂ اظہار ''خواب حقیقت'' کے مقابلے میں کمتر درجے کا ہے۔ یہاں قاری کا ذہن مزید وسعتوں کا متلاشی ہوتا ہے مگر زندگی کی سچائی اس کے روبرو کھڑی نظر آتی ہے۔

ان کی افسانہ نگاری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں کہانی پن کے ساتھ روایتی انداز کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو ان کے افسانوں کو جدید دور

کے افسانہ نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ ان کا افسانہ ''نجات دہندہ'' اساطیری رنگ رکھتا ہے۔ حالانکہ اس افسانے میں موجودہ عہد کی سیاسی چالبازیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی ہندو دیومالائی طرز کی ہے جس میں ناگ راج، مہارانی اور ساتھ ہی ارسطو نام کا بھی ایک کردار ہے۔ ایسے ہی ''کب آئے گا سقراط'' میں بھی سیاست کی بازیگری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے ایک اہم کردار چانکیہ کو سیاسی رہنما اور شیخ چلی کو عوام تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ شیخ چلی اس سقراط کا منتظر ہے جس کی آمد سے صبح طلوع ہوگئی اور کوہ ماران سونے کا بن جائے گا۔ لیکن اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ خود بے عملی کا شکار ہے۔ رات کو کوہ ماران پہنچ جاتا ہے کہ پہاڑ سونے کا ہوگا لیکن وہاں جا کر سو جاتا ہے اور اس وقت اس کی آنکھ کھلتی ہے جب سورج سر پر چڑھ آتا ہے۔ اس افسانے میں عوام کی بے بسی کے ساتھ اس کی اپنی کوتاہیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

وحشی سعید کے بعض افسانوں میں روایتوں اور پرانی قدروں کی پاسداری بھی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں افسانہ ''میرا قاتل میرا مسیحا'' کو سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس کا رنگ بھی علامتی ہے لیکن افسانہ نگار جس مقصد کو پیش کرنا چاہتا ہے وہ ہے اس کی اپنی تہذیب اس کی روایت اور پرانی قدریں ہیں جو جدید تہذیب کی پاسداری اور جدید طرزِ حیات کو اپنانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہیں۔ کہانی ایک ڈرائنگ روم میں شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا مرکزی کردار ''میں'' جبکہ دوسرا جو مخاطب ہے وہ کوئی نامعلوم شخصیت ہے۔ ''میں'' کھڑکی کے پاس کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہا ہے اسی درمیان قد نما آئینہ سے وہ شخصیت نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے مجھے پہچانو؟ ''میں'' اسے پہچان نہیں پاتا لیکن وہ اپنی شناخت بتانے کے بجائے مختلف بہانوں سے اسے

پہچاننے کی تلقین کرتی ہے۔ اس نے کئی چیزوں کے نام لیے اور کہا کہ اس میں دیکھو میں ہوں۔ اور آخر میں وہ شخصیت قہقہہ لگاتی ہے کہ ''تم میری مٹھی میں ہو''۔ ''میں'' چیخ پڑتا ہے لیکن وہ نامعلوم شخصیت کہتی ہے چیخنے سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت سے کب تک بھاگو گے، اور اس پر بھی ''میں'' اسے نہیں پہچان پاتا اور ضد کرتا ہے تو وہ بس اتنا جواب دیتا ہے کہ...... ''میں ہی تمہارا قاتل ہوں، میں ہی تمہارا مسیحا ہوں''۔

وحشی سعید کے ان افسانوں کے مطالعے سے یہ بات ذہن میں پختگی کے ساتھ ابھرتی ہے کہ وہ ایک علامتی اندازِ بیان رکھنے والے کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ جب بھی افسانے میں علامت کی بات ہوگی انھیں فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ اس بات کا اعتراف مجھے ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں ان کے افسانے پڑھنے والے ہر قاری کو ہوگا۔ میکش امروہوی لکھتے ہیں:

> ''اردو فکشن کی جو ایک علامتی روایت رہی ہے اور جس نے ناول اور ناولٹ کو تو بہت کم متاثر کیا لیکن افسانے بالخصوص مختصر افسانے اس روایت کے وسیع تر ترجمان ثابت ہوئے ہیں۔ وحشی سعید کے افسانے عہد حاضر میں علامتی روایت کے مستحکم ترجمان نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جس افسانوی اسلوب میں اپنے اردگرد کے حالات نیز ملکی، قومی اور بین الاقوامی حالات کی آئینہ داری کی ہے، کم از کم جموں وکشمیر کی افسانوی روایت میں یہ اسلوب پہلے میری نظر سے نہیں گزرا''۔
>
> (فلیپ پر، افسانوی مجموعہ خواب حقیقت، میکش امروہوی، جنرل سکریٹری انڈین کلچرل سوسائٹی، نئی دہلی)

اسی طرح ڈاکٹر بختیار نواز کے چند مبالغہ آمیز الفاظ کو نظر انداز کر دیں تو یہ اقتباس بھی وحشی سعید کو سمجھنے میں معاون ہے......

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''وحشی سعید کے وہ افسانے جو تحریک ادب کے حالیہ شماروں میں شائع ہوئے ہیں، ان کے مطالعے سے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس طرز کے افسانہ نگار اردو ادب میں بہت کم ہوئے ہیں اور آج کل تو شاذ و نادر ہی ہیں۔ افسانوں میں تجسس کا یہ برتاؤ جو افسانوں کے معیار کو بلند سے بلند تر کردے، میں سمجھتا ہوں دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں ان کے جیسے بہت کم فنکاروں کے بس کی بات ہے''۔

(فلیپ پر، افسانوی مجموعہ 'کنوارے الفاظ کا جزیرہ': ڈاکٹر بختیار نواز، نائب صدر ہندوستانی کلچر، وارانسی)

لیکن ہمیں یہ بھی کہنے دیجئے کہ وحشی سعید کے تمام افسانے ایسے نہیں ہیں۔ کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جو الگ نوعیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں علامتی پیرایۂ اظہار بھی نہیں ہے اور اندازِ بیان افسانوی نہ ہو کر انشائیہ کا ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں افسانہ ''تقدیر'' کا نام سرِ فہرست لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''دوڑ'' علامتی انداز بیان سے خالی ہے۔ لیکن بہرحال ہمیں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ افسانہ نگار کی سماج کے حالات اور بدلتی ہوئی تہذیب پر گہری نظر ہے۔ ایک اور افسانے کا نام لے لوں جو نئی تہذیب اور روش کے دلدادہ نوجوانوں کی کہانی ہے۔ یہ نوجوان کالج کے طلبا ہیں۔ اس افسانے کے آخری حصے میں افسانہ نگار نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے ہم اس کہانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ افسانے کا عنوان ہے ''گھر سے کالج تک'' اور اس کے آخری حصے کا منظر یہ ہے کہ چند طلبا خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ ان کا موضوع وہی عمومی موضوع یعنی لڑکی ہے۔ اتنے میں ایک لڑکا سائیکل سے آکر بتاتا ہے کہ ہسٹری کا گھنٹہ شروع ہو گیا ہے اور پھر وہ بھاگ کر کلاس روم میں جاتے ہیں لیکن ان کی کیفیت وہی رہتی ہے جو باہر تھی۔ پروفیسر بورڈ پر کیا لکھ رہا ہے اور کیا بتا رہا ہے، اس سے بے نیاز

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

سریتا کی بڑی بڑی آنکھیں، زبیدہ کا سبز رنگ کا دوپٹہ اور کرسچین لڑکی کی سفید بانہیں ان کے ذہن کے پردے پر رقص کر رہی ہیں۔

وحشی سعید کے تین افسانوی مجموعے ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جا رہی ہے'' اور ''خواب حقیقت'' میری نظر سے گزرے۔ ان مجموعے میں ایک ۲۰۱۳ء کی اشاعت ہے جبکہ باقی دو ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وحشی سعید نے چھپنے چھپانے کی طرف کم ہی توجہ دی ہے۔ ایک انٹرویو میں وحشی سعید نے یہ اعتراف کیا ہے کہ تقریباً پچیس سال پہلے دیگر مصروفیات کے سبب تخلیقی عمل سے ان کا واسطہ برائے نام رہ گیا۔ اس درمیان وہ کچھ لکھتے بھی رہے تو اشاعت کی جانب بالکل توجہ نہیں دی۔ یہ باتیں بھی اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ حقیقی اور جینوئین فنکار خود کو پروجیکٹ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا واحد مقصد ادب اور فن کی تخلیق کرنا ہوتا ہے اور وہ بے لوث ہو کر یہ خدمت انجام دیتا رہتا ہے۔ لیکن حقیقت خود کو منوا کر رہتی ہے۔ کوئی ایسا ہاتھ ضرور آگے آتا ہے جو اسے کھینچ کر اس کے حقیقی مقام تک پہنچانا چاہتا ہے اور میں یہ کہنے میں شاید غلط نہیں ہو سکتا کہ ''تحریک ادب'' آج وہی فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مذکورہ تینوں مجموعوں کی اشاعت میں ''تحریک ادب'' کے مدیر جاوید انور کی کاوشیں بھی شامل رہی ہیں۔ جاوید انور نے وحشی سعید کو صحیح طور پر پہچانا ہے اور اس کا اعتراف ''سڑک جا رہی ہے'' کے بیک کور پر وہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''وحشی سعید جموں و کشمیر کے وہ نمائندہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بہت کم وقت میں اردو افسانوی ادب میں اپنے مستحکم نقش ثبت کیے ہیں۔ بیانیہ کے بعد عہد حاضر میں ان کے افسانوں کا اسلوب افسانے میں قصہ پن کے بہترین استعمال کی عمدہ مثال ہے۔ عہد حاضر میں فکشن کی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

شعریات کے غالب عناصر کو افسانوں میں دیکھا جائے تو مکالمے، مناظر، کردار نگاری کے انسلاک کے عمدہ توازن اور موضوع کے انتخاب بیحد اہمیت کے حامل ہو گئے ہیں۔ کوئی اچھوتا مضمون اگر افسانے میں بیان کیا جا رہا ہے تو فکشن کی شعریات کے دوسرے لوازمات کا اس اعتبار سے افسانے میں موجود ہونا اور اس کا پر تجسس اور پر اثر ہونا لازمی شرط ہے۔ اختصار بھی انھیں خصوصیات کی ایک کڑی ہے جس سے قاری پوری دلچسپی کے ساتھ افسانے سے اپنا رشتہ استوار رکھے۔ وحشی سعید کے تقریباً تمام ہی افسانوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(جاوید انور، بیک کور 'سڑک جا رہی ہے')

اس مختصر سے مقالے میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ وحشی سعید کے اس مجموعے میں شامل تمام فن پاروں کا جائزہ پیش کیا جائے اور نہ ہی اس بات کی وقت اجازت دے گا کہ مزید تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ اب تک ان کے افسانوں میں موضوع اور علامت وغیرہ کی ہی باتیں ہوئیں۔ ان کے اسلوب اور زبان و بیان پر گفتگو ایک الگ موضوع کا متقاضی ہے۔ لیکن عثمان جوہری کے یہ چند جملے تو پیش کئے ہی جا سکتے ہیں جو ان کے اسلوب اور فکشن کی زبان ہونے پر دلالت کرتے ہیں:

''وحشی سعید اردو افسانوی ادب پر اس طرح ابھرے اور اس طرح روشن ہوئے کہ جموں و کشمیر کا افسانوی ادبی منظر نامہ مزید تابناک نظر آنے لگا ہے۔ یہ تابنا کی اس لیے اپنا منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس قسم کی زبان کا استعمال انھوں نے اپنے افسانوں کی تحریر کے لیے استعمال کیا ہے وہ خالص فکشن کا اسلوب ہے اور مختصر افسانوں کے لیے بہت

موزوں ہے۔ آج کل اردو رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے جموں و کشمیر کے دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ افسانے وحشی سعید کے افسانوں کی وسعت کے مقابلے میں محدود دائرے میں سفر کرتے ہیں۔ یہ وسعت فکری اور فنی دونوں اعتبار سے ہے۔ مکالمہ، منظر، کردار، واقعہ ہر جگہ وحشی سعید نے اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، جو ان کے افسانوں کی کامیابی کی بہت بڑی اور اہم خصوصیت ہے''۔

(فلیپ پر: افسانوی مجموعہ 'سڑک جا رہی ہے' - عثمان جوہری فاؤنڈیشن، جلگاؤں مہاراشٹر)



نئے فسانوں کا فسوں گر......وحشی سعید

☆ اصغر ویلوری (چینئی)

اُردو کے معروف افسانہ نگار جناب وحشی سعید صاحب جدید افسانوی ادب کے مایہ ناز تخلیق کار ہیں۔ وادیٔ کشمیر نے ان کے فکر وفن کو زندگی کی واردات اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب نے ان کے جذبات کو جلا بخشی ہے۔

تحریک ادب وارناسی کے زیر اہتمام وحشی سعید کی چار کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، ان میں سے ایک کتاب میں دو مختصر ناول اور تین کتابیں افسانوی مجموعے ہیں۔

میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے ان چاروں شہکار تخلیقات کو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل کی۔ جاوید انور صاحب نے نہایت انہماک سے ان تصانیف کو خوشگوار گیٹ اپ میں 'تحریک ادب' کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔

ان مایہ ناز کتابوں پر الگ الگ سیر حاصل تاثرات پیش نہ کر سکنے پر اس لیے مجبور ہوں کہ جو وقت مجھے دیا گیا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سرسری تاثرات ہی پیش کر سکوں۔

''پتھر پتھر آئینہ'' کے عنوان سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں ایک اور ناول ''ایک موسم کا خط'' بھی شامل ہے۔ یہ دونوں ناول اپنے عنوانات کے اعتبار سے بھی اور مواد کی جاذبیت کے اعتبار سے بھی کافی دلچسپ اور پر کشش ہیں۔ وحشی سعید نے اپنی طرز تحریر سے ان مختصر ناولوں کے پلاٹ کو تخلیقی وقار اور سوچ کی وسعت عطا کی ہے۔

''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' وحشی سعید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ پھر دو اور افسانوی مجموعے بھی وحشی سعید نے دیئے ہیں جن کے عنوان ہیں: ''خواب حقیقت''،

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''سڑک جارہی ہے''۔ان کے ناول ہوں یا افسانے ،اپنے عنوانات ہی سے اچھوتے اور جدید لگتے ہیں۔پڑھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔قاری کو اپنی طرف پہلی نظر میں متوجہ کرنے میں ان کے افسانوں کے عنوانات کامیاب ہیں تو کہانی بیان کرنے کا انداز قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لینے میں کامراں ہے۔

کہانی پن اور تخلیقی نثر وحشی سعید کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔زبان و بیان پر بلا کی دسترس حاصل ہے۔کہانی کے پلاٹ کو اس طرح کسا ہوا بناتے ہیں کہ قاری کی توجہ ادھر ادھر ہٹ ہی نہیں سکتی۔

اختصار اور انہماک ان کے افسانوں کی دوسری اہم خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے تجسس اور تسلسل برابر قائم رہتا ہے اور تشنگی باقی ہی رہتی ہے کہ فسانہ اختتام کو پہنچ کر قاری کو چونکا دیتا ہے۔

جناب وحشی سعید کا مشاہدہ وسیع اور تجربات زندگی نہایت عمیق و دلچسپ ہیں۔زندگی کے گوناگوں تجربات و مشاہدات کو فلسفیانہ انداز میں افسانوی رنگ دینے میں انھیں کمال حاصل ہے۔انسانی نفسیات سے کماحقہ واقفیت کی غمازی ان کے افسانوں میں جگہ جگہ چھلک پڑتی ہے۔

ناول ہو یہ افسانہ، وحشی سعید اس فن کو بخوبی جانتے ہیں کہ کیا بات کتنی بیان کرنی ہے اور کب کس گتھی کو سلجھانا ہے۔نہ وہ زیادہ کہتے ہیں نہ ایک لفظ بھی کم، یہی ان کے فن کا کمال ہے۔

جناب وحشی سعید ایک ذمہ دار اور کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال افسانہ نویس اور عاشق اردو بھی ہیں۔یہ بات لائق صد تحسین ہے۔اہل کشمیر کو ان پر جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔ان بیش بہا کتابوں کے اجراء پر میں وحشی سعید صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

وحشی سعید نمبر

ان کی تخلیقات یقیناً دلچسپی سے پڑھی جائیں گی اور خوب پذیرائی ہوگی۔ نئی نسل وحشی سعید سے پوری طرح مستفید ہوگی اور اردو کے افسانوی ادب میں ایک مستقل مقام آپ کو ضرور حاصل ہوگا۔

طوالت سے گریز کرتے ہوئے بحیثیت شاعر اپنے جذبات و تاثرات کو شاعرانہ رنگ دینے کی کوشش کرتا ہوں، امید کہ اہل محفل اور ہمارے آج کے ہیرو، مایہ ناز و قابل قدر افسانہ نگار جناب وحشی سعید صاحب ضرور ان دو قطعات سے محظوظ ہوں گے:

داستاں در داستاں وحشی سعید
فکر و فن کی کہکشاں وحشی سعید
جن سے ہے شاداب اردو کی زمیں
ہیں اسی کے آسماں وحشی سعید



گونجتا ہے نعرۂ خوش آمدید
کیا فسانہ گر ہے کیا طرزِ جدید
لفظ ہر ایک بولتا ہے آپ کا
آفریں صد آفریں وحشی سعید



کنوارے الفاظ کی شرارت

☆ نٹ کھٹ عظیم آبادی

وحشی سعید کے تین افسانوی مجموعوں ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، ''سڑک جا رہی ہے'' اور ''خواب حقیقت'' کے افسانوں کے عنوانات (واوین کے درمیان) کو جوڑ کر یہ کہانی تیار کی گئی ہے۔ امید ہے میری یہ کوشش آپ کو پسند آئے گی۔ (نٹ کھٹ عظیم آبادی)

یہ وحشی سعید کی محبت اور ان کا ''آتش بیاں'' ہی ہے کہ ان کے بلاوے پر میں ''کرچیوں کا سفر'' کرنے کو تیار ہو گیا اور یہی سوچا کہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' کی سیر کر لی جائے۔ میں اپنے ''آدھے ادھورے'' سامان کے ساتھ اپنا ''کشکول'' لے کر روانگی کے لیے تیار ہو گیا کہ شاید اس بہانے مجھے ''آب حیات'' میسر ہو جائے۔ اب اسے میری ''خودسری'' کہیں یا کچھ اور میرے لیے یہ سفر ایک ''مٹھی اڑان آسمان'' سے کم نہیں تھا۔ جب کہ اس جزیرے پر میری کسی سے کوئی ''پہچان'' ہی نہیں تھی۔ مجھے کیا معلوم کہ وہاں کا ''نیا حکمراں''، ''بت پرست'' اور ''گناہوں کا پجاری'' ہے اور میرے لیے اجنبی بھی۔ یہ سفر میرے لیے ایک ''اندھا کنواں'' جیسا ہی تھا جہاں ہو سکتا ہے کہ ''کہانی کا آسیب'' میرا پیچھا کرے اور ہر طرف ''سکوت در سکوت'' ہی چھایا ہوا ملے۔ مجھے لوگوں نے روکا کہ تم ''گمراہی'' کی طرف جا رہے ہو۔ وہاں تمہارے ''سائے کی لاش'' بھی کسی کو نہ ملے گی۔ وہاں بس ''منفی کا قاعدہ'' استعمال ہوتا ہے۔ لیکن میں کہاں رکنے کو تیار تھا چاہے اس کے لیے مجھے ''پتھر کا زخم'' ہی کیوں نہ ملے، میری ''ہنسی کا قتل'' ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مجھے ''قربان گاہ'' کی بھینٹ کیوں نہ چڑھا دیا جائے۔ بس مجھے اپنی ''تقدیر'' پر بھروسہ تھا کہ کوئی نہ کوئی ''نجات دہندہ'' وہاں ضرور مل جائے گا۔ مجھے کوئی نہ کوئی ''دل والی'' ایک ''نجلی'' ضرور مل جائے گی۔ پھر ایک ''عجیب پریم کہانی'' کی شروعات ہو جائے گی۔ اس

وحشی سعید نمبر

لیے میں نے اپنے سامان کا ''اندراج'' کیا، ''مالک مکان کے نام'' ایک خط لکھا اور سفر پر نکل پڑا۔ لیکن گھر سے نکلتے ہی ایک ''بھنگی'' پر نظر پڑ گئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے وجود پر ''احساس کی بجلی'' گر پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے ''پردہ'' سا چھا گیا اور یوں لگا کہ میرے پاؤں میں ''زنجیر'' پڑ گئی ہو۔ میں نے اس ''طوفان'' سے پیچھا چھڑانے کے لیے ''سگریٹ'' جلا لیا اور کسی طرح ''گھر سے کالج تک'' پہنچا۔ سامنے ''بڑا دروازہ'' نظر آ رہا تھا۔ آگے بڑھا اور ہاسپٹل کے نزدیک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں ڈاکٹروں نے ''ہڑتال'' کر رکھی ہے۔ سبھی جونیر ڈاکٹر ہاسپٹل کے برآمدے میں ''سرخ چادر'' بچھا کر بیٹھے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ یہ تعلیم یافتہ اور ''یہ تہذیب یافتہ لوگ'' جو کہ اپنے پیر گاڑی سے نیچے نہیں اتارتے ہیں آج زمین پر بیٹھ کر ''جوا'' کھیل رہے تھے۔ بیچ بیچ میں ان کے منہ سے ''وہ ہار گیا'' کی آواز بھی آ رہی تھی اور مریض ادھر ادھر بھٹک رہے تھے، اسی لیے ''جب لوگ بولتے ہیں'' تو سچ ہی بولتے ہیں کہ ''میرا قاتل مسیحا'' بن گیا ہے۔ نہ جانے ''وہ صبح کب آئے گی'' اور ''کب آئے گا وہ سقراط'' ''جب ممبئی چمک جائے گی'' اور میرے ''احساس کا گھاؤ'' بھر جائے گا۔ یہ ''الجھے لمحے'' ''آشوب آگہی'' کی ''آغوش'' میں گم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صرف اچھے دن کے ''وقت اور رنگ کی'' کی ''نامکمل تصویریں'' ہیں جو میرے ذہن میں گردش کر رہی ہیں۔ میں آگے بڑھتا ہوں، مجھے آج ''وہ زلیخا'' ''یاد'' آ رہی ہے۔ جس کی ''تصویر'' ''یاد کی دلہن'' کی مانند میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔ کیا بتاؤں کہ ''جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے'' تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میں سدھ بدھ کھونے لگتا ہوں۔ بس ذہن و دل پر اس کے نغموں کا ''میٹھا چشمہ اور میں'' ہی رہ جاتا ہوں۔ لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو میرا وجود ''گھاس کا تنکا'' بن کر اڑ جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں ''عورت اور مچھلی'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں کو جتنا ہاتھ سے پکڑو وہ اتنا ہی پھسل جاتی ہیں۔ میں ادھر چل پڑتا ہوں جدھر یہ ''سڑک جا رہی ہے''۔ میں جانتا ہوں کہ ہم ''جدا جدا

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

راستے'' پر چل رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ ''تلخ یادیں'' پیچھا کہاں چھوڑنے والی ہیں، نہ جانے کب وہ ''جمود کا جنازہ'' دفن ہوگا، ''یہ دوڑ'' کب ختم ہوگی، اس کا ''وعدہ'' کب وفا ہوگا، کب ''خواب حقیقت'' میں بدلیں گے۔ ''اپنا عکس اپنا آئینہ'' ہوگا۔ محبت کا ''سودا'' نہیں ہوگا، وہ ''نیلام'' نہ ہوگی۔ ''لمبا آدمی چھوٹا قد'' والا نہ بنے گا۔ کوئی ''ارتقا کا سانحہ'' دل پر چوٹ نہیں پہنچائے گا۔ ''موتی اور کرن'' دونوں ہاتھوں میں ہوں گے۔ اب کوئی داستاں سنانے والا یہ نہیں کہے گا کہ ''سو گئے داستاں کہتے کہتے''۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' پر جا کر ہی میرا یہ ''وارث کی تلاش'' کا سفر ختم ہوگا۔ لگتا ہے کہ آپ میرے ''طلسم کلام'' میں کھو گئے ہیں تب ہی اپنے دانتوں سے اپنا ناخن چبا رہے ہیں اور مجھے گناہگار کر رہے ہیں۔ ارے بھئی اس کا علاج میرے پاس نہیں ہے، وحشی سعید صاحب کے پاس ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعوں ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' ''سڑک جا رہی ہے'' اور ''خواب حقیقت'' کی تحریروں میں بند ہے۔ آپ ان کا مطالعہ کریں تو آپ کے بھی خواب حقیقت میں بدل جائیں گے۔ آپ ان کی تحریریں پڑھ کر کِھل کِھل جائیں گے اور انھیں دعائیں دیں گے۔ میں تو اپنے رستے چلا، آپ بھی اپنے رستے جائیں اور برائے مہربانی یہ نہ پوچھیں کہ ''خدا کون ہے؟'' کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں میں ہے۔ ہماری رگ رگ میں ہے۔ یہ الگ الگ بات ہے کہ ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہم اگر اس کے احکام پر چلیں اور ایک دوسرے سے محبت کریں، نفرت کے پودے کو دلوں سے اکھاڑ پھینکیں تو اسے ضرور پالیں گے...... اسے ضرور پالیں گے۔ مجھے چونکہ لمبے سفر پر جانا ہے اس لیے بس یہ کہتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی



باشعور ادیب وحشی سعید

☆ ڈاکٹر مجیب شہزر

وحشی سعید کا خمیر جنت نظیر، خطہ کشمیر کی مردم خیز مٹی سے اُٹھا ہے۔ موصوف گورے چٹے، خوبرو، خوش مزاج، خوش اطوار، خوش گفتار، خوش رفتار، روادار، غمگسار، غم خوار، طرح دار، وضع دار، امن و آشتی کے پرستار، یکجہتی اور انسان دوستی کے طلبگار نہایت ہی پُرکشش اور قابل قدر شخصیت واقع ہوئے ہیں۔

چونکہ وحشی سعید کو علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھنے کا موقع نصیب ہوا، اس لیے ادب میں ان کی دلچسپی ایک قدرتی بات ہے۔ ادب میں بھی ان کا طبعی میلان اور جھکاؤ فکشن یعنی ناول، افسانوں کی طرف زیادہ رہا، یہی وجہ ہے ناول افسانوں کا مطالعہ کرتے کرتے جب انھیں لگا کہ یہ کام تو وہ خود بھی بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں تو گزشتہ صدی کے آٹھویں دہے میں جب وہ عین عالم شباب میں تھے انھوں نے خود بھی قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ استوار کرلیا۔ یہ جدیدیت کے عروج کا دور تھا۔ روایتی اور بیانیہ انداز متروک ہو چکا تھا اور اب بلا کہانی پلاٹ اور واقعاتی تسلسل کے بغیر ہی افسانے لکھے جا رہے تھے۔ لہٰذا انھوں نے بھی اسی رنگ و آہنگ کے علامتی اور استعاراتی افسانے تخلیق کیے۔

ان کے افسانوں کا اولین مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' پچھلے سال ۲۰۱۳ء میں شہ نشین آفاق ادب پر جلوہ فشاں ہوکر حلقہ ہائے شائقین ادب اور پرستاران افسانہ سے تحسین و تہنیت اور داد و ستائش کے قیمتی نذرانے وصول کر چکا ہے۔

اور اب مارچ ۲۰۱۴ء میں ان کی ناول ''پتھر پتھر آئینہ'' بھی جلوہ گہہ آفاق پر طلوع ہوکر حلقہ ہائے شائقین ناول کی پسندیدگی، دلچسپی اور تعریف و توصیف کے کلمات سے

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

سرفراز ہورہی ہے۔

۱۴۰ر صفحات کو محیط یہ کتاب جوان کے دوناولوں ''پتھر پتھر آئینہ'' اور ''ایک موسم کا خط'' پر مبنی ہے۔ جدید انداز کے سرورق پختہ جلد قیمتی، کاغذ اور روشن کتابت وطباعت اور مصنف کی تصویر سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے سبب نظر افروز بھی ہے اور دلکش و دلآویز بھی۔

وحشی سعید آج کے ایک باشعور اور کہنہ مشق ناول نگار ہیں۔ ان کا جمال وکمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دونوں ہی ناولوں میں ''سائیکوسس'' (Psychosis) کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کی ہیروئنوں ایتا اور کومل کی سائیکی کے عمق میں اتر کر اوران کی شخصیات کی پراسراریت سے پردہ اٹھا کر جس طرح ان کی مخفی صداقتوں کو آشکار و واشگاف کیا ہے اس سے خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ وحشی سعید ناول نگار ہی نہیں بلکہ ایک ماہر و مشاق ماہر نفسیات بھی ہیں۔

''پتھر پتھر آئینہ'' سرور اور ایتا کی کہانی ہے جس کا آغاز کالج سے ہوتا ہے۔ ایتا ثروت مند خاندان کی بیٹی ہے اور سرور غریب خاندان کا چشم و چراغ۔ وہ ذہن فیشن ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اچھے نمبر لاتا ہے۔ ایتا اس کا مذاق اڑاتی رہتی ہے۔ وہ جب ڈاکٹر ہو جاتا ہے تب بھی وہ اس پر جا و بے جا طنز کرتی رہتی ہے۔ پھر ایتا کے والد کی معاشی حالت ابتر ہو جانے پر ایتا کا منگیتر رشتہ توڑ دیتا ہے۔ ادھر ایتا کا بیمار باپ جب بیٹی کے مستقبل کو لے کر فکر مند ہے۔ سرور اس کا ہاتھ مانگ لیتا ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ شب عروسی میں ایتا کہتی ہے کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، وہ اس کی محبت تک کبھی رسائی نہ حاصل کر سکے گا۔ سرور اس سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ ایتا اس کی قربت نہ پا کر سخت بیمار ہو جاتی ہے اور پھر اسپتال کے بیڈ پر اس کی انا سرافگند ہو جاتی ہے تو وہ محبت کا اقرار کر کے اس کے آگے خود سپردگی اختیار کر لیتی ہے گویا یہ باہمی محبت

ہی تھی جسے انانیت نے نفرت کا روپ دے دیا تھا۔ ان کا دوسرا ناول ''ایک موسم کا خط'' بھی قطعاً ایسی ہی کہانی پیش کرتا ہے۔ دولت مند ایک حسینہ نوجوان انل کی جو اس کے یہاں ملازم ہے، خودداری کو نہیں توڑ پاتی تو طرح طرح سے اس سے انتقام لیتی ہے اور پھر جب انل بڑا آدمی بن کر اُسے اپنے ماتحت کر لیتا ہے تو ایک خاص موقع پر درمیانی دیوار ٹوٹ جانے پر وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ دونوں ناولیں مصنف کے ماہر نفسیات ہونے پر دال ہیں۔

ادھر نہایت مختصر سے عرصے میں مجھے ان کے افسانوں پر مبنی تین مجموعے موصول ہوئے ہیں: (۱) ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ''، (۲) ''خواب حقیقت'' اور (۳) ''سڑک جا رہی ہے''۔

ان کے شروع کے دو مجموعے علامتی و استعاراتی رنگ و بو میں رچے بسے ہیں جو سریندر پرکاش، بلراج کومل، بلراج مینرا اور انور سجاد کے جدید دور کے افسانوں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ یہ ہمہ جہت و ہمہ رنگ اور کثیر الجہات افسانے ان کے سیاسی، سماجی، ادبی اور تہذیبی و ثقافتی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقت و واقعیت، ارضی صداقت، عصری حیثیت، مقامیت اور آفاقیت کی دھوپ چھاؤں ''خواب حقیقت میں شمولہ کہانیوں: کب آئے گا سقراط، میرا قاتل میرا مسیحا، نجات دہندہ، اپنا عکس اپنا آئینہ، میٹھا چشمہ اور میں، لمبا آدمی چھوٹا قد اور وہ صبح کب آئے گی'' میں بخوبی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔

ان کے باقی دو مجموعوں سے قطعاً مختلف ہے۔ اس میں مشمولہ سبھی افسانے بیانیہ انداز میں کہانی، پلاٹ، کردار اور واقعاتی تسلسل کے ساتھ تخلیق کئے گئے ہیں جن میں ماجرا منظر اور مکالمہ سبھی کچھ موجود ہے اور علامتی اسلوب سے تو ان کو دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ ہر کہانی میں امن و آشتی اور انسان دوستی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ان

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

کہانیوں میں پُر آشوب سماج میں انسانی زندگی کو کرب و کسک سے دو چار کرنے والے گونا گوں مسائل و مصائب کو افسانوی خلعت فاخرہ زیب تن کرایا گیا ہے۔ ان تیس کہانیوں میں کئی کہانیاں حقیقت اور زمینی صداقت کے سبب ہوش وحواس کو شدت سے متاثر کرتی ہیں۔

''سائے کی لاش'' ایک ایسی کہانی ہے جو ایک مصور کی ناکام زندگی کے المیے کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں یکے بعد دیگرے تین لڑکیاں آئیں اور اس سے جڑے بغیر ہی چلی گئیں اور اس طرح اس کی اپنی زندگی کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی۔ ''جب ممبئی جھک جائے گی'' میں دولت مندوں کی بے حسی و بے ضمیر اور غریبوں سے ان کے ظالمانہ و بے رحمانہ سلوک کو آشکار کیا گیا ہے۔

''جمود کا جنازہ'' رشتوں کو ترسے ہوئے ایک نوجوان کی نفسیاتی کہانی ہے جو کسی کو بہن بنانا چاہتا ہے۔ وہ فٹ پاتھ سے ایک بے سہارا لڑکی کو بہن بنا کر گھر لے آتا ہے۔ پھر ایک دن جب وہ اس کے آگے شادی کی تجویز رکھتی ہے تو وہ اسے فٹ پاتھ پر چھوڑ آتا ہے۔ ہنسی کا قتل، ہڑتال، یہ تہذیب یافتہ لوگ، سودا، احساس کا گھاؤ، گناہوں کا پجاری، وہ ہار گیا اور خدا کون ہے؟ کہانیاں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مری دعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔



وحشی سعید (انشائیہ)

☆ ایف آزاد دِلنوی

وحشی...... ناظم تقریب کی زبان پر آتے ہی انور پاشا کے جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی۔ وہ خوفزدہ ہو گیا۔ وحشی...... وحشی بار بار گونجنے سے اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی گھنے جنگل میں آ پھنسا ہو اور وہ وحشی جانوروں کے غول کے درمیان ہے، جو اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اُس کے دل و دماغ پر بے حسی سی چھا جاتی ہے اور وہ اپنی بے زبان آنکھوں سے اس غول کو اشارہ کر کے جیسے کہہ رہا ہو "میں راستہ بھٹک گیا ہوں، مجھے جانے دو، یہ جنگل تمہارا مسکن ہے۔ یہ سدا ہرا بھرا رہے، اس کو لگا جیسے یہ وحشی جانور یک زبان ہو کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے ہوں تم انسان ضرور ہو، انسانیت تمہاری صفت ہے مگر تمہاری خصلت بدل گئی ہے۔ تم اب وہ انسان نہیں رہے، جوان جنگلوں کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے درخت لگاتے تھے۔ تم نے ان درختوں کی بے دریغ کٹائی کر کے ہمارے مسکن کو بے رونق کر دیا ہے۔ جو تمہارے صفات کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے ہماری صفات کو اپنا ہی لیا ہے۔ تو تم ہماری برادری میں شامل ہو کر صحیح جگہ پر آئے ہو۔ خوش آمدید...... خوش آمدید اس غول کو اپنی طرف بانہیں پھیلائے آتے دیکھ کر وہ بے سر و پا بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں تالیوں کی گونج سن کر اس کے نظام حس میں حرکت سی آ جاتی ہے۔ وہ دائیں بائیں نظریں دوڑاتا ہے۔ تب اس کو اس بات کا اطمینان ہوا کہ وہ جنگل میں نہیں ہے بلکہ خوبصورت ڈل جھیل کے کنارے واقع ایک عالیشان ہوٹل کے احاطے میں موجود ہے۔ جہاں ایک پر رونق تقریب چل رہی ہے اور مرد و زن نفیس نفیس لباس زیب تن کئے بڑے ادب کے ساتھ براجمان ہیں، جن کے چہرے کھلے ہوئے ہیں۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اُس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھی ایک خوبصورت لڑکی سے پوچھا: تم کون ہو؟ وہ اپنے چہرے پر ہنسی بکھیرتے ہوئے بولی: ڈاکٹر۔ انور پاشا کچھ دیر تک حیران وپریشان اس کو تکتا رہا، پھر سوچ میں پڑ کر سوچنے لگا...... "میں تو وحشی جانوروں کے جنگل سے سلامت نکل آیا ہوں۔ میرے جسم پر تو ایک بھی خراش نہیں ہے۔ مجھے دوا دارُو کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ توقف کے بعد اُس نے کہا: میں تو بالکل بھلا چنگا ہوں۔ ڈاکٹر نے چھیڑنے کے انداز میں اُسے پوچھا: تم کو کیا بیماری ہے؟ اس سوال پر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر متانت کے آثار نمودار ہوتے ہی وہ پھر بول پڑی، گھبراؤ مت، میں مرض کا علاج نہیں کرسکتی۔ دراصل میں کتابی ڈاکٹر ہوں۔ میں نے یونہی بیماری کا نام لیا۔ تم ایک ادبی تقریب میں ہو۔ اتنے میں پھر تالیاں بجیں۔ وہ چونک پڑا۔ اُس نے دیکھا اسٹیج پر اپنا مقالہ سنانے والے ایک ادیب کو سب غور سے سنتے جا رہے ہیں اور مقالے میں جہاں جہاں لفظ وحشی استعمال ہوتا رہا، سامعین تالیاں بجاتے رہے۔ انور پاشا کو اب یہ یقین ہوا کہ وہ کسی وحشی کے نشانے پر نہیں ہے۔ وہ دانشوروں کے ایک مجمع میں بیٹھا ہے، جہاں کوئی وحشی نہیں ہے۔ شاید میری ہی قوتِ سماعت میں کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور وہ خوف وہراس کی اُس فضا سے باہر آنے کی کوشش کرتا رہا جو اس کے دل میں کہیں اب بھی موجود تھی۔ وہ اُس کاؤنٹر کی طرف نکل جاتا ہے جہاں مختلف نوع کے مشروبات بانٹے جا رہے تھے۔ اُس نے ایک گلاس ہاتھ میں لیا۔ پھر کھڑے کھڑے اپنے دل کی تسکین کے لیے سارے ماحول کا جائزہ لیا۔ لیکن اُس کو وہاں کوئی وحشی نظر نہ آیا۔ وہ اطمینان سے جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور مقالہ نگار کو غور سے سننے لگا وہ، اُس نے ایوانِ صدارت کی طرف اشارہ کر کے کہا: "افسانوی دنیا کی اُفق پر ایک درخشندہ تارے کی طرح اُبھر کر آیا ہے وحشیؔ"، انور پاشا پھر چونک گیا۔ اُس نے اپنی بائیں طرف کی کرسی پر بیٹھے ایک خوب رو شخص سے پوچھا:

وحشی سعید نمبر

قلمکاروں کی محفل میں وحشی کون ہے؟ اُس شخص نے ہنستے ہوئے کہا: ''وحشی! ہے نا وہ'' اور ایوانِ صدارت میں موجود ایک گول ڈیل ڈول والے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں، جو دولہا لگ رہا تھا۔ انور پاشا نے متعجب ہو کر کہا: وہ تو انسان ہے۔ انسان کو وحشی کہنا زیب نہیں دیتا۔ اس کی تجسس کی حدیں بیکراں سی ہوئیں۔ اُس نے اُس شخص سے پھر پوچھا: ''اس کو وحشی کیوں کہتے ہیں''؟ وہ تو بہت خوبصورت شخص ہے۔ انور پاشا کو اپنے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ اس کا دل قطعاً یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ ایسے خوبصورت شخص کو وحشی کہے۔ وہ اسٹیج کی طرف چل پڑتا ہے جہاں وہ شخص دو ننھے منے بچوں کو گود میں لئے بیٹھا تھا، وہ وحشی ہوتا تو بچے ڈر جاتے۔ کچھ قدم چل کر اُس کی ملاقات سالک سے ہوئی، وہی قلمکار، جس کے مضامین اخبار میں چھپتے ہیں، جس کے ساتھ اس کا صرف اخباری تعارف تھا۔ انور پاشا بے صبر ہو کر اُس سے پوچھ بیٹھا: تم ایک شریف آدمی کو وحشی کیوں کہتے ہو؟ وہ ہنستے مسکراتے بولا: وہ وحشی ہی نہیں بلکہ......؟ وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ اُس کو دادا انور شاہ نے اشارہ کر کے اپنے پاس بلا لیا۔ افسانوی دنیا کا شہنشاہ۔ انور پاشا نے سوچا، میں دادا انور شاہ سے ہی جا کر کیوں نہ پوچھوں؟ لیکن ہمت نہ جٹا پایا۔ اتنی بڑی شخصیت سے کیسے پوچھ لیتا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ سوال اس کو تنگ کئے جا رہا تھا، وہ آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

اسٹیج کے بالکل نزدیک پہنچ کر اُس کے قدم خود بخود رُک گئے۔ شاید اب بھی اُس کے دل کے کسی کونے میں خوف موجود تھا۔ اُس نے سامعین کی پہلی صف میں ایک کرسی خالی پائی۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھ کر اس چھوٹی سی، ننھی سی بچی کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں فرشتہ صورت جیسی ایک ننھی بچی اُس کی گود میں آ کر بیٹھ گئی۔ انور پاشا نے اُس سے پوچھا: مُنّی! تمہیں ڈر نہیں لگ رہا ہے؟ وہ اپنی توتلی زبان

وحشی سعید نمبر

میں بولی ڈر، کس بات کا ڈرانکل۔ وہ...... مُنّی! تم اُس...... کی گود میں بیٹھی ہونا۔ مُنّی! ناراض ہوکر اُٹھ کھڑی ہوئی اور چلا چلا کر اسٹیج کی طرف دوڑی ''وہ میرے دادا جی ہیں، وہ بہت اچھے ہیں، وہ مجھے ڈھیر سارا پیار کرتے ہیں''۔ انور پاشا اس معصوم بچی کی باتوں پر سوچ ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں کچھ پریس رپورٹر حاضر ہوئے، جو اُس سے کچھ سوال پوچھنا چاہتے تھے۔ انور پاشا ان کی صف میں موجود رہا اور سوال پوچھے گئے۔ اس بیچ انور پاشا بھی پوچھ بیٹھا: تم وحشی ہو؟ ہاں...... میں وحشی ہوں، وحشی سعید، ایک افسانہ نگار۔ انور پاشا بہت دیر تک اس مرکب ''وحشی سعید'' پر سوچتا رہا۔ اور یہ سوال اس کے ذہن میں کھٹکتا رہا، کیا وحشی...... سعید بن سکتا ہے۔ اگر یہ ممکن ہے تو خدا کرے کہ سب وحشی سعید بن جائیں، تا کہ اس سماج میں برائیوں کا نام ونشان مٹ جائے۔ اتنی سی دیر میں وہ اسٹیج پر چلا گیا۔ پھر آواز آئی، اب معروف افسانہ نگار وحشی سعید کے افسانوی مجموعے ''پتھر پتھر آئینہ'' کی رسم اجرائی کی تقریب ہوگی۔ انور پاشا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کی نظروں کے سامنے اس کے گلے میں پھولوں کی مالائیں پہنائی جا رہی تھیں، مٹھائیاں بانٹی جا رہی تھیں۔ اسٹیج پر موجود سبھی دانشور ہاتھوں میں آئینہ لئے کھڑے تھے اور اس کو مبارکباد دے رہے تھے۔ اس نئے آئینے کے لیے، وحشی اور سعید صفتوں کے مرکب کا ایک نیا آئینہ۔ وہ آئینہ جس پر سماج کی ایک نئی تصویر اُبھر کر آئے گی، ایک سعید کی تصویر۔ انور پاشا نے سوچا کہ وہ آئینہ لے کر اُس...... بستی میں ضرور جائے گا جہاں سڑک جا رہی ہے۔



وحشی سعید سے ایک گفتگو:

کشمیر میں ادب اور فکر و فن کے حوالے سے (مکالمہ)

☆ جاوید انور

جاوید انور: وحشی سعید صاحب ایک زمانہ تھا ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک کا کہ آپ کی ادبی سرگرمیاں ریاست جموں وکشمیر میں مثالی مانی جاتی تھیں۔ آپ نے اس دور میں افسانے بھی تخلیق کیے اور 'نگینہ' نام کا موقر جریدہ بھی آپ کی ادارت میں نکلتا تھا۔ پھر آخر کیا وجہ رہی کہ ادبی سرگرمیاں رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں؟

وحشی سعید: جاوید انور! بچپن سے ہی مجھے کہانیاں سننا اور سنانا بہت اچھا لگتا تھا۔ کم عمری میں ہی اردو ناولوں کو دیر رات تک پڑھنا میرا سب سے پسندیدہ شوق تھا۔ اس زمانے میں ابن صفی کے جاسوسی ناول شائع ہوتے تھے اور میں ان ناولوں کا بے صبری سے انتظار کرتا تھا۔ ابن صفی کے ناولوں کا پلاٹ اور اندازِ بیان لاجواب تھا۔ ان ناولوں کی وجہ سے اردو زبان سے میں قریب ہوتا گیا اور جنوں کی حد تک اردو زبان سے محبت کرنے لگا۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۳ء تک ایک ادبی جریدہ 'نگینہ' بھی شائع کرتا رہا۔ اس جریدے کے توسط سے نئے اور معیاری لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ 'نگینہ' کے ساتھ ساتھ میرا ادبی سفر بھی جاری رہا۔ نئے رجحان کے زیرِ اثر میں بھی روایتی افسانوں سے نکل کر علامتی افسانوں کی دنیا میں آ گیا۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات مجھ پر گہرے اثرات مرتب کرنے لگے اور وہی واقعات افسانہ بننے لگے۔ نگینہ سے وابستہ دور کو میں اپنی زندگی کا انمول دور سمجھتا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس زمانے کے مایہ ناز اور صفِ اول کے ادیب، مکالمہ نگار، افسانہ نگار، ناقد

وحشی سعید نمبر

اور شاعر 'نگینہ' کے ساتھ جڑتے چلے گئے اور نگینہ جموں وکشمیر کی ادبی تاریخ میں اس وقت کا سب سے معیاری جریدہ بن گیا۔ لیکن اب اسے قسمت کہیے یا کچھ اور کہ میری ذاتی کاروباری مصروفیات کچھ اس طرح کی رہیں، کہ اس زمانے میں مجھے اکثر شہر کے باہر تو کیا ملک سے باہر بھی رہنا پڑتا تھا۔ رسالے کی اشاعت تو وقت کی پابندی مانگتی ہے اور وقت کی پابندی ہی میرے بس میں نہیں تھی۔ دیر سویر کچھ شمارے میں نے نکالے لیکن ظاہر ہے کہ لیٹ لطیفی کا بہت اچھا تاثر اہل ادب کی نظر میں نہیں ہوتا۔ پھر رفتہ رفتہ مصروفیت کا یہ عالم ہو گیا کہ دوسرے کئی بہت اہم کاموں کے لیے بھی وقت نکالنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ انھیں میں ایک اہم کام نگینہ کا جاری رکھنا تھا، جو مسلسل پابندیٔ وقت کا متقاضی تھا اور یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے مجبوری میں نگینہ کی اشاعت رک گئی۔

جاوید انور: معتبر ذرائع سے علم ہوا ہے کہ آپ نے اپنے اجداد کے تعلق سے بھی ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا، اس ناول کے کب تک منظر عام پر آنے کے امکانات ہیں؟

وحشی سعید: یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ میرے عزیز دوست مظفر ایرج نے ایک دن مجھ سے کہا کہ یار تم ایک ایسا ناول لکھو جو یادگار اور تاریخی ہو۔ بہت دنوں تک میں اس ناول کے پلاٹ کے متعلق سوچتا رہا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میرے ہاتھ میں ایک ایسی کتاب آ گئی جس میں میرے اجداد کا تذکرہ تھا اور بالکل ناول کے اسلوب میں تھا۔ اس طرح مجھے ناول کا پلاٹ ہاتھ آ گیا اور میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ میرے ناول کا پس منظر میرے اجداد ہوں گے۔ ناول لکھنا شروع کیا، کچھ لکھ چکا ہوں لیکن بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ میں بہت سنجیدگی سے اس جانب توجہ کر رہا ہوں۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو یہ ناول جلد مکمل ہو کر منظر عام پر آئے گا۔

جاوید انور: کالج کے زمانے میں آپ اپنے ذاتی صرفہ پر رسالہ نکالتے تھے۔ آج الحمد

للہ! آپ کے پاس تمام وسائل موجود ہیں۔تو کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ 'نگینہ' یا کوئی دوسرا رسالہ آپ کی ادارت میں شائع ہوگا؟

وحشی سعید: آپ کے جریدے 'تحریک ادب' کو دیکھنے سے قبل تک میری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ نگینہ دوبارہ شائع کروں، لیکن تحریک ادب جب پہلی بار میرے ہاتھوں میں آیا تب مجھے محسوس ہوا کہ عالمی اردو ادب اور ملکی اردو ادب اور بالخصوص جموں وکشمیر کے اردو ادب پر نظر رکھتے ہوئے نگینہ کی جو شکل میرے ذہن میں تھی 'تحریک ادب' بالکل وہی ہے۔آپ کا رسالہ خود ہمارے فرض کو قرض سمجھ کر ادا کر رہا ہے۔ ہر شمارے میں ۳۰ سے ۴۰ فیصد تک ادب یہاں کا شائع ہوتا ہے۔اس رسالے کا معیار بھی وہی ہے جیسا کہ میں تصور کرتا تھا، جس طرح نگینہ کے زمانے میں اردو کے دوسرے رسائل نگینہ سے متاثر ہوکر اس کی پیروی کرتے تھے اور جموں وکشمیر کے اردو ادب کی اشاعت اپنے رسالے کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔آج تحریک ادب سے بھی بعض رسائل اسی طرح متاثر ہیں اور جموں وکشمیر کے ادب پر خاص توجہ کر رہے ہیں۔ کچھ ایک نے تو غالباً تحریک ادب سے ہی اثر لیتے ہوئے جموں وکشمیر نمبر تک شائع کیے ہیں۔تو جب تک آپ تحریک ادب کو جاری رکھے ہوئے ہیں تب تک تو ٹھیک ہے، جب آپ تحریک ادب کو بند کر دیں گے یا کسی وجہ سے اس کو جاری نہ رکھ سکیں گے تو میں دوسرے رسالے کی اشاعت کے بارے میں سوچوں گا۔

جاوید انور: نورشاہ صاحب نے اپنی کتاب جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار کے صفحہ نمبر ۱۱۴ر پر تحریر کیا ہے کہ وہ یعنی آپ افسانوی ادب سے بالکل رشتہ توڑ چکے ہیں۔اس کی دلیل کے طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ گزشتہ پچیس برسوں میں ان کی کوئی تخلیق نظر سے نہیں گزری اور نہ ہی انھیں کسی ادبی محفل میں دیکھا گیا۔میرے نزدیک کسی نئی تخلیق کا شائع نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تخلیق کار کچھ تخلیق ہی نہیں کر رہا ہے، آپ کا

کیا خیال ہے؟

وحشی سعید: نور شاہ صاحب نے یہ صحیح لکھا ہے کہ میں نے افسانوی دنیا سے رشتہ توڑ لیا۔ میں بہت حد تک خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ لیکن میں نے بالکل ادب کو ترک ہی کر دیا ہو، یہ صحیح نہیں ہے۔ رشتہ توڑ لینا اور ادب کو بالکل ترک کر دینا، چھوڑ دینا یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور آپس میں ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دونوں کی نوعیتیں اور معنی الگ ہیں۔ کئی افسانوی موضوع میرے ذہن میں گردش کرتے رہے ہیں، میں نے آدھے ادھورے لکھے بھی اس زمانے میں۔ ناول پر بھی کچھ کام کیا، لیکن باقاعدگی سے توجہ نہیں کر سکا تھا۔ دیکھئے میں افسانہ برائے افسانہ لکھنے کا قائل کبھی نہیں رہا اور نہ ہی ہلکے پھلکے موضوع پر لکھنے کا جیسا کہ بہت سے دوسرے افسانہ نگار کرتے ہیں۔ میرے خیال میں افسانہ نگاری جگر کا خون مانگتی ہے اور میں اپنے ہر افسانے میں یقین مانیں اپنا خون جگر صرف کرتا ہوں۔ بہت سنجیدگی اور بہت وقت کا صرفہ بھی چاہیے اس میں۔ ایک ایک جملہ لکھتے وقت افسانے کے معیار و وقار کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے اس کے لیے پورے طور پر ادبی حاضر ذہن درکار ہے، وقت درکار ہے اور وقت جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ میرے پاس نہیں تھا ان دنوں، لیکن یقینی طور پر ادبی ذہن لگاتار اپنا کام کر رہا تھا۔ بھلے ہی وہ تحریری طور پر رقم نہ ہو سکا لیکن دل کے ایک گوشے میں تحریر تو ہوتا ہی رہا، اور اب جبکہ وقت ملا ہے تو افسانے صفحۂ قرطاس پر بھی تحریر ہو رہے ہیں، تحریک ادب میں چھپ بھی رہے ہیں، کچھ ہندی میں ترجمہ ہو کر بھی چھپ رہے ہیں۔ کچھ افسانوں کا ترجمہ گجراتی زبان میں بھی ہو رہا ہے۔ افسانوں کے مجموعے اور ناول بھی شائع ہو گئے ہیں جن کا رسم اجرا انشا اللہ مئی ۲۰۱۴ء میں ہوگا، تو یہ سب کام ہو رہے ہیں۔

جاوید انور: نور شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ وحشی سعید ساحل کو نظر انداز نہیں کیا جا

سکتا کیونکہ ان کی تحریر کردہ کہانیوں کی تعداد سو کے قریب ہے۔ میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا سو سے زیادہ یا سو کے قریب کہانیاں تحریر کر دینے بھر سے ہی کوئی افسانہ نگار اس لائق ہو جاتا ہے کہ اسے نظر انداز نہ کیا جا سکے۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

وحشی سعید: میں نے سو سے زیادہ افسانے لکھے، یہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ اگر میرے افسانوں میں کوئی نئی بات کسی نئے ڈھنگ سے پیش ہوتی ہے تو پھر مجھے نظر انداز نہ کیا جائے، یہ اہم بات ہے۔ کبھی کبھی اپنے ارد گرد جو واقعات اور حالات گزرتے ہیں وہ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میں ان حالات کو کس حد تک اپنے علامتی افسانوں میں قلم بند کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، وہ دیکھنے کی بات ہے۔ تعین قدر کا دار و مدار بھی انھیں بنیادوں پر ہونا چاہیے۔

جاوید انور: آپ نے جس دور میں افسانے تحریر کیے وہ دور آپ کے عنفوان شباب کا تھا، لیکن ان میں بجائے رومانی فضا کے اسے سخت سنجیدہ حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کے مشاہدے کو ایک عمر درکار ہوتی ہے، تو اس کا سبب کیا ہے؟

وحشی سعید: یقیناً وہ دور عنفوان شباب کا تھا لیکن جاوید انور! ہر تخلیق کار اس دور میں رومانیت کا اسیر ہو جائے یہ ضروری نہیں۔ دنیا بھر کے ادب میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں، میں خود کو انہی میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ میرا ذہن ابتدا سے ہی حقائق کے دبیر گریبان کو چاک کر کے ان کے اندر پوشیدہ اصل حقیقت کو اپنی برہنہ صورت میں دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اسی کا اثر میرے افسانوں میں ہے۔

جاوید انور: آپ کے افسانوں پر بلراج مینرا، انور سجاد اور سریندر پرکاش کا اثر محسوس ہوتا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

وحشی سعید: آپ کے ارد گرد ایسے حالات اور واقعات رونما ہوتے ہیں جو آپ پر

وحشی سعید نمبر

گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ واقعات دل کے تہہ خانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ علامتی افسانوں کی بڑی خوبی یہی ہے کہ ان میں رومانیت بھی ہو تو وہ بھی زندگی کے تجربات کے بیان میں انوکھا اور مختلف اسلوب اختیار کر لیتی ہے اور سنجیدہ حقائق کے شانہ بہ شانہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ میں ذاتی طور پر شب خون اور شاعر جو کہ ۱۹۸۳ء تک بہت باوقار اور موثر جریدہ مانا جاتا تھا، میں شائع ہونے والے علامتی افسانوں سے متاثر رہا ہوں۔ میرے افسانے بھی چھپتے رہے ان جریدوں میں اور ان میں شائع ہونے والے بیشتر افسانے اور نظمیں سنجیدہ تجربے تھے۔ بہترین علامتی افسانہ لکھنے والوں نے مجھے متاثر کیا ہے اور میں نے ان سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے اپنے مختلف اسلوب میں اظہار بیان کی کوشش کی ہے۔

جاوید انور: آپ کے زیادہ تر افسانے علامتی پیرائے اظہار کے حامل ہیں۔ کیا آپ افسانہ نگاری کے دوسرے اظہارات کو علامتی اظہار سے کم تر تصور کرتے ہیں؟

وحشی سعید: نہیں ایسا نہیں ہے، افسانہ افسانہ ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی فارم میں ہو، پڑھنے والے یا سننے والے اس سے متاثر ہونے چاہئیں۔ اچھا افسانہ کسی بھی فارم میں کمتر نہیں ہوتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے ذاتی طور پر مجھے یہ اسلوب پسند ہے، اس میں کسی دوسرے اسلوب کے کمتر یا برتر ہونے کا سوال سرے سے ہے ہی نہیں۔

جاوید انور: آپ نے جس عہد میں افسانہ نگاری کی وہ دَور خاص کر کشمیر میں ترقی پسند ادب یعنی افراد کے مسائل کے براہِ راست اظہار اور نعرہ بازی والا دور تھا۔ آپ کے افسانے کشمیر کی اس ادبی فضا سے متاثر کیوں نہیں ہیں؟

وحشی سعید: ترقی پسند ادب کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ نعرہ بازی کا دور تھا، اس لیے وہ ادب وقتی ادب بن کر رہ گیا۔ وہ ایک تحریک تھی اور ادب ادب ہوتا ہے تحریک نہیں۔ اس لیے میرے افسانے ترقی پسند ادب سے دور رہے۔

وحشی سعید نمبر

جاوید انور: میرا اپنا خیال ہے کہ ہر حساس اور سچا تخلیق کار چاہے مصروفیات زندگی یا ضروریات زندگی میں کتنا ہی گم کیوں نہ ہو گیا ہو اپنے اردگرد کے ادبی ماحول سے بے بہرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس خیال سے آپ کو اتفاق ہے تو آج کے افسانوی ادب کے تعلق سے آپ کیا کہیں گے؟

وحشی سعید: میں اس بات سے بالکل اتفاق رکھتا ہوں کہ سچا تخلیق کار چاہے مصروفیات کے باوجود اپنے اِردگرد سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی کبھی تخلیق کار جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے اِردگرد کے ماحول اور پوری دنیا کے جو اہم واقعات ہیں یا جن اہم واقعات اور حالات کو اس کا تخلیقی ذہن قبول کرتا ہے، اظہار بیان کے لیے مجبور کرتا ہے، اس کا فوری یا دیر تک اظہار نہیں کر پاتا۔ لیکن جو تخلیق کار اس جمود سے نکل جاتا ہے خاص کر افسانوں کے میدان میں وہ ایک بہتر افسانہ نگار بن کر ابھرتا ہے۔

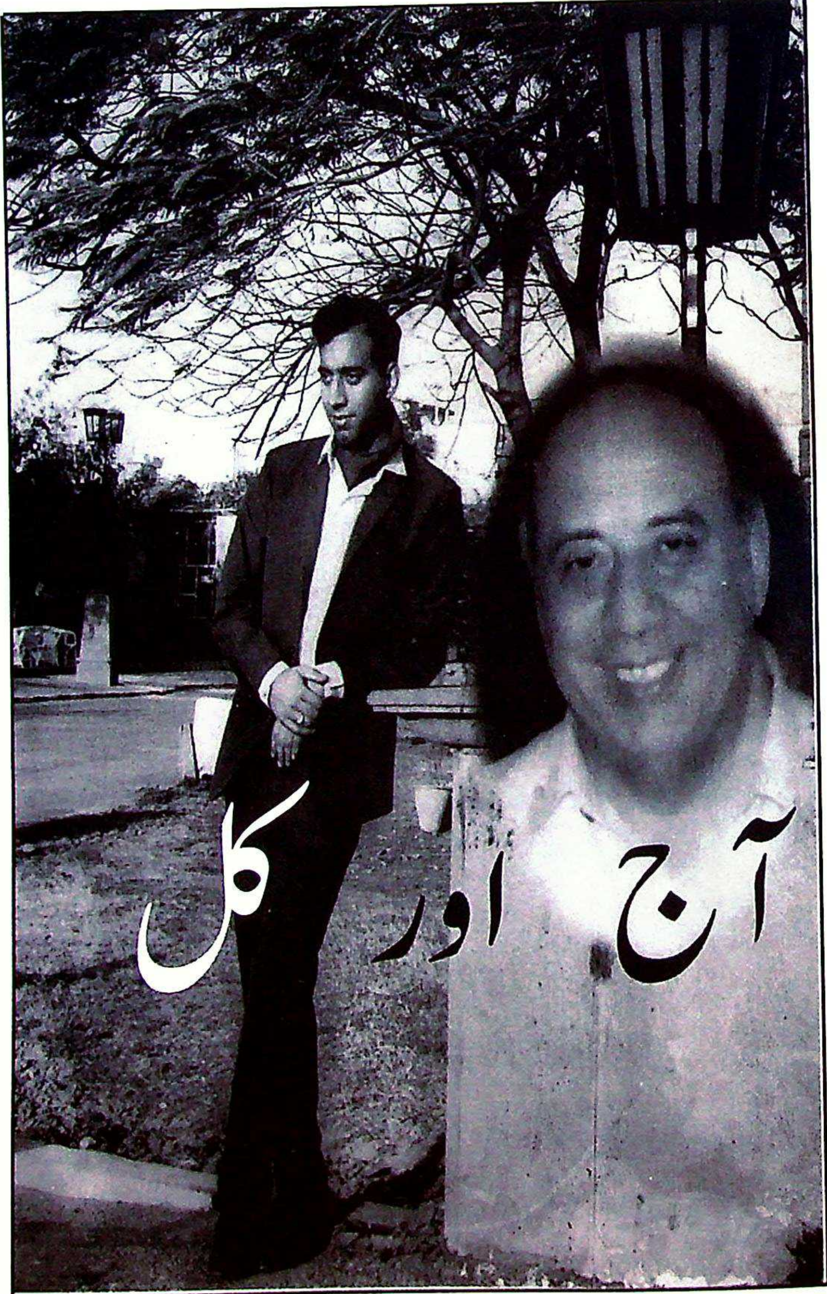
جاوید انور: بہت بہت شکریہ، آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔



لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

وحشی سعید کے کچھ منتخب افسانے



وحشی سعید کے کچھ منتخب افسانے

☆ آسمان میری مٹھی میں

☆ عجائب گھر کا طوطا

☆ قاتل......مقتول

☆ انتظار......اور......میں

☆ شہنشاہ، قاتل، تلوار

☆ چور پولس

☆ عجب زندگی غضب موت

☆ جائز......ناجائز

☆ وحشت محبت

☆ فطرت، محبت، ندامت

☆ قحط

☆☆☆

آسمان میری مٹھی میں

(جموں و کشمیر میں آئے ہوئے حالیہ سیلاب سے متاثر)

ہمارے شہر کی بہت ہی بہترین کالونیوں میں سب سے بہترین کالونی بادشاہ باغ ہے۔ بادشاہ باغ میں شہر کے دولت مندوں میں سے بڑے دولت مند آباد ہیں۔ سرکار شاہی کے بڑے بڑے افسر، بڑے بڑے سیاستداں اس کالونی کی زینت ہیں۔ زیب بٹ بھی رہتا تھا اس کا مکان یہیں اس کی کوٹھی۔ اس کا محل اس کالونی کی سب سے بڑی اور خوبصورت عمارت ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد بادشاہ باغ میں صرف اس بڑی اور خوبصورت عمارت دیکھنے کے لیے آتی ہے۔ وہ خوبصورت عمارت الف لیلوی داستاں سے نکل کر بادشاہ باغ کی سرزمین پر کھڑی ہوگئی۔ اس محل کا نام غزل رکھا گیا تھا۔ اس خوبصورت عمارت کے باغ کو دنیا کے بہترین پھولوں سے سجایا گیا۔ اس کی زمین پر جو سبزہ لگا وہ زمرد کے قیمتی پتھر کو مات دے رہا تھا۔ بلوا کے پتھر سے تراشا گیا فوارہ کسی شیرازی کی سوچ کی پیداوار تھا۔

شالیمار اور نشاط کے فوارے اس بلوا کے فوارے کے سامنے پھیکے لگتے۔ اس وسیع اور خوبصورت عمارت کے کمرے تاریخ کے پس منظر سے نکل کر زیب بٹ کے محل کا حصہ بن گئے تھے۔ زیب بٹ کے محل کی پہلی منزل میں صرف تین کمرے تھے۔ سب سے بڑے کمرے کا نام دیوان عام تھا۔ یہاں زیب بٹ سے ہر خاص و عام ملنے آتا تھا۔ دوسرے بڑے کمرے کا نام دیوان خاص تھا۔ یہاں وہ خاص لوگوں اور اہل خانہ افراد کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ تیسرے کمرے میں زیب بٹ اپنے خانہ افراد کے ساتھ لذیذ کھانے نوش کرتا تھا۔ اس کمرے کا نام دعوت خانہ رکھا گیا تھا۔ دوسری منزل

میں بھی صرف تین کمرے ہی تھے۔ پہلا کمرہ تاج محل کہلاتا تھا وہاں زیب بٹ اور اس کی خوبصورت بیوی آرام کرتے اور نیند کی انوکھی دنیا میں ہچکولے کھاتے تھے۔ اس کمرے کا فرش بہترین ایرانی قالینوں سے سجایا گیا تھا۔ یہاں کشمیری اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا بہت بڑا پلنگ اطلس اور کمخواب کے بستر سے آراستہ تھا۔ یہ پلنگ کشمیری کاریگری اور فنکاری کا شاہکار نمونہ تھا۔ اس کمرے میں اخروٹ کی لکڑی سے بنا ہوا ڈریسنگ ٹیبل، کھانے کی میز اور کرسیاں سب کے سب اعلیٰ فنکاری کے نمونے تھے۔ یہاں ایک بڑا ٹی.وی لگا ہوا تھا۔ جدید لیپ ٹاپ بھی ایک میز پر رکھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں شیلف میں دنیا کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں سلیقے سے سجی تھیں۔ شیلف کے اوپر بہت بڑے مصور کے ہاتھوں بنی ہوئی عمر خیام کی شاہکار تصویر لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے دوسرے کونے میں ٹھنڈی اور گرم ہوا پھینکنے والی مشین لگی ہوئی تھی۔ دوسری منزل کے دوسرے کمرے میں زیب بٹ کے دو چھوٹے بچے رہتے تھے۔ بیٹے کا نام حیات اور بیٹی کا نام جنت۔ اس کمرے کا نام زار داستاں رکھا گیا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ہزار داستاں کے کرداروں کو کارٹونی انداز میں مصوری رنگ دیا گیا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے پلنگ ریشمی بستروں کے ساتھ انوکھے انداز میں ترتیب دیا گیا تھا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ قیمتی کھلونے اور چھوٹے بڑے ویڈیو گیم چاروں اور بکھرے رہتے۔

اس کمرے کی ایک دیوار پر ایک بزرگ عورت کی قلمی تصویر انوکھے طریقے سے لٹکائی گئی تھی۔ یہ زیب بٹ کی والدہ مرحومہ کی تصویر تھی۔ اس منزل کے آخری کمرے کا نام بہار رکھا گیا تھا۔ اس کمرے میں دنیا کے بہترین مصوروں کے نادر و نایاب تصویروں کا خزانہ تھا۔ یہ کمرہ اس محل کے ہر کمرے سے اعلیٰ تھا۔ بہترین فضا سے معطر اس کمرے کا ماحول اپنے اندر ایک عجیب کشش رکھتا تھا۔ جب بھی زیب بٹ کچھ

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

وقت تنہائی میں گزارنا چاہتا، وہ اس میں پناہ لیتا۔ وہ اسے اپنی جائداد کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ سمجھتا تھا۔ وہ اکثر اپنے گھر والوں سے کہتا......

یہ کمرہ اوراس میں رکھی ہوئی تصویریں میری اصل دولت ہے۔

زیب بٹ کیسے اتنا بڑا امیر کبیر بنا، اس کے پیچھے بھی ایک دلفریب داستان ہے۔ اس کے والد شہاب بٹ پشمینہ شال کے ایک مانے ہوئے کاریگر تھے۔ ان کی بیوی اون اپنے چرخہ پر کاتتی تھی۔ شہاب بٹ اس سے خوبصورت شال تیار کرتا، پھر شہر کے جانے مانے دوکانداروں کے پاس فروخت کرتا۔ اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے پانچ بچوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ ان پانچ بچوں میں چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی، جو اب شادی کے لائق ہوگئی تھی۔ شہاب بٹ مشکل ترین حالات سے گزر رہا تھا لیکن بیٹی روشن کی شادی تو کرنی ہی تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی کسی امیر گھرانہ میں ہو۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ روشن ایسے گھر کی زینت بنی جو دو وقت کی روٹی مشکل سے کماتے تھے۔ اس کا شوہر ایک سرکاری ادارہ میں معمولی ملازم تھا اور معمولی مکان میں اپنی ماں اور بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن غریب ہونے کے باوجود خوش تھا۔ اپنی دنیا میں مست، شہاب بٹ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی روشن کے لیے کچھ ایسا کرے جس سے وہ آسودہ حال زندگی بسر کرے لیکن وہ خود بھی افلاس کی سطح سے اوپر نہیں۔ اسی کسمپرسی میں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کی بیوی ممتاز نے روتی ہوئی آنکھوں سے اسے وداع کیا۔ اسے زیب بٹ کی یہ بات بار بار یاد آتی تھی۔

”آسمان اتنا بڑا نہیں کہ میری مٹھی میں نہ آسکے“۔

شہاب بٹ یہ کہہ کر آسمان کی طرف دیکھ کر زور زور سے ہنستا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان اس کی مٹھی میں آ گیا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ممتاز بے سہارا بے مدد گار تھی، اس کو اپنے چار بیٹوں کو پالنا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا اتنا بھی بڑا نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے اتنا کماتا جس سے ان سب کا پیٹ پال سکتا۔ شہاب بٹ سے ہمدردی کرنے والے آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ ممتاز اب زیادہ محنت کرتی اور خود اُون چرخے پر کات کر پشمینہ شال تیار کر بازار میں فروخت کرتی۔ اس کا بیٹا دارا اس کے ساتھ ہوتا۔

بہت مشکل سے گھر کا گزارا ہوتا تھا۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دارا جب اور بڑا ہوا اس نے پشمینے شال بنانا شروع کی اور ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اب ممتاز کی آمدنی کسی حد تک بہتر ہو گئی۔ انھیں دنوں بین الاقوامی منڈی میں پشمینہ کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ دارا نے حالات کا خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کے دو بھائی شجاع اور مراد بھی کاروبار میں شامل ہو گئے۔ وہ دونوں بھائی دہلی کے بازاروں میں کام کرنے لگے۔ کچھ ہی عرصے میں انھوں نے ایک چھوٹا سا فلیٹ بھی خریدا اور گھر اور نیچے کوئی کرایہ وغیرہ نہ دینے کا بھی فائدہ ہوا اور کاروبار ترقی کرنے لگا۔

دارا، شجاع اور مراد کی شادیاں ہو گئیں۔ ممتاز تین بہوؤں کی ساس بن گئی۔ اب ممتاز کو لگا کہ اچھے دن آ گئے۔ زیب بٹ نے جیسے ہی بی اے پاس کیا بڑے بھائی نے اس سے کہا...... ''تمھیں تعلیم میں آگے جانا ہے یا کاروبار میں آنا چاہتے ہو۔

زیب بولا...... ''بھائی میں دُبئی جانا چاہتا ہوں، کاروبار کرنا چاہتا ہوں''۔

دارا بولا...... ''پہلے کاروبار کی اے بی سیکھ لو اس کے بعد جہاں جانا چاہتے ہو جاؤ''۔

زیب کا دل ٹوٹ گیا۔ ممتاز نے دارا سے کہا......

''بیٹا اس گھر کے لیے تم نے بہت کچھ کیا، زیب کو دُبئی جانے دو''۔

دارا نے ماں کی بات سن کر ذرا بھی دیر نہ کی۔ زیب کو بلا کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا...... ''تم جو چاہو کر سکتے ہو''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اب زیب بٹ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ وہ دُبئی جانے کی تیاری کرنے لگا۔

پھر ایک سنہری صبح اس نے دُبئی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ دُبئی جو خوابوں کی دنیا ہے، جہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں، ہر عمارت دوسری عمارت سے مختلف۔ ایسی عمارتوں کا تصور ذہنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ دُبئی دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈیوں میں سے ایک، بڑی بڑی کشادہ صاف شفاف سڑکیں۔ یہاں ہر چیز اشاروں سے ملتی ہے۔ اربوں، کھربوں کا کاروبار ایک دن میں ہوتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے مال (Mall)، ان مالوں کی ایک ایک دوکان ہزاروں فٹ پر پھیلی ہوئی۔ دُبئی انسانوں کے ہاتھوں سے بنا ہوا دلفریب شاہکار ہے۔ زیب بٹ اس شہر کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اس نے دُبئی کے ڈیرہ علاقے میں ایک چھوٹا کمرہ کرایہ پر لیا۔ اس کی کاروباری دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ بہت دنوں تک ہاتھ پیر مارتا رہا لیکن جس کامیابی کے لیے وہ یہاں آیا تھا، اس کے ہاتھ نہ لگی۔ دارا وطن سے مال بھیجتا اور وہ نقصان میں بہت کچھ گنواتا رہا۔ ایسا بھی وقت آیا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ وطن واپس چلا جائے۔ اچانک ایک دن اس کی قسمت پلٹی۔ دُبئی کے ایک دوست نے اس کو دُبئی مال میں دوکان دلوائی۔ یہیں سے اس کے امیر کبیر بننے کی داستان شروع ہوگئی۔ 'دُبئی مال' کے اس دوکان کو بہترین قالینوں اور پشمینہ شالوں سے اس خوبصورتی سے سجایا کہ گراہک متاثر ہونے لگے اور اس کی تجارت وُسعت پانے لگی۔ زیب بٹ کے دماغ میں کاروبار کے نئے نئے خیالات پلتے رہے، اور انھیں وہ عملی جامہ پہناتا رہا۔ ان دنوں دُبئی میں رئیل اسٹیٹ مارکیٹ آسمان کو چھونے لگا۔ زیب بٹ نے بھی اس میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی قسمت چمک گئی۔ زیب کے تینوں بھائی اس سے بہت خوش تھے کیونکہ اس کی وجہ سے پشمینہ کی مارکیٹ میں ان کی طوطی بولنے لگی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

دارا کی بیوی اپنی چھوٹی بہن سے زیب کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسے دارا کی حمایت حاصل تھی۔ اس کی سالی پڑھی لکھی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کی سالی اگر اس کی بیوی بنتی ہے تو زیب پوری طرح اس کے قابو میں آ جائے گا۔ ممتاز کو بھی لڑکی پسند تھی لیکن اس کے لیے زیب کی رضامندی ضروری تھی۔

زیب بہت دنوں کے بعد وطن آیا۔ ممتاز نے کہا ''بیٹا معلوم نہیں کب اللہ کا بلاوا آ جائے، میں چاہتی ہوں کہ تمہارا سہرا دیکھ لوں۔ میری نظر میں ایک خوبصورت اور سلیقہ مند لڑکی ہے جو تمہارے لیے بہت اچھی رہے گی''۔

''ماں میں اس سلسلے میں آپ سے بات کروں گا''۔

زیب بھی شادی کرنا چاہتا تھا لیکن دارا کی سالی سے نہیں۔

یہ بات ان دنوں کی ہے جب زیب کالج میں پڑھتا تھا، وہ ایک حسین مہ جبیں لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا۔ بانو واقعی بہت خوبصورت تھی۔ زیب اور بانو ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ زیب کالج کی ڈگری کے بعد دُبئی چلا گیا۔ بانو اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آ جائے اور اس کو اپنی دلہن بنا لے۔ ماں باپ کسی اور جگہ اس کی شادی کرنے پر زور ڈال رہے تھے لیکن وہ زیب کے انتظار میں اپنی ساری عمر ختم کرنے کو تیار تھی۔ پھر ایک دن زیب آ گیا۔

''بانو اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے، تم حامی بھرو تو میں ماں سے بات کروں''۔

''کیا میرا انتظار میری حامی نہیں''۔

''بانو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے ایسا محل تعمیر کروں گا جو صرف اس شہر میں بلکہ ملک بھر میں لاجواب ہوگا''۔

''ہماری محبت کسی تاج محل کی محتاج نہیں''۔

زیب نے اپنی ماں کو ساری بات کہہ سنائی۔ ممتاز کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گئی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اسے معلوم تھا کہ دارا کو اس کی بیوی کو زیب کا یہ فیصلہ منظور نہ ہوگا اور گھر کے بکھر جانے کا یہ پہلا مرحلہ ہوگا۔ بہر حال اس نے اپنے تینوں بیٹوں کو زیب کا یہ فیصلہ سنایا تو وہ ایک ساتھ بول پڑے ''ہم اس شادی کو منظور نہیں کریں گے''۔

''زیب بالغ ہے، وہ خود کماتا ہے، اس کو اپنا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے''۔

ماں کی بات پر دارا بول پڑا ''پھر ہم بھی اس کی زندگی سے علیحدہ ہونے کا حق رکھتے ہیں''۔

زیب اپنے کمرے میں تھا جب ممتاز داخل ہوئی۔

''زیب بانو کو بھول جاؤ، تمہارے بھائیوں کو یہ رشتہ منظور نہیں''۔

زیب کھڑا ہوا...... ''ماں تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں اس گھر کو ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی''۔

''آپ کا گھر نہیں ٹوٹے گا۔ آپ کا گھر آپ کو اور بھائیوں کو مبارک''۔

''زیب تمہارا فیصلہ صحیح نہیں ہے''۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ اپنے کپڑے سمیٹے اور ماں سے بولا ''میں آپ کے دل سے نہیں لیکن نظر سے دور ہو رہا ہوں''۔

ممتاز یہ سن کر بت بن گئی۔

چند دنوں میں زیب اور بانو کی شادی ہوگئی۔ اس شادی میں نہ اس کے بھائی نہ اس کی ماں نہ اس کا کوئی رشتہ دار شامل ہوا۔ صرف اس کے قریبی دوست شریک ہوئے۔ شادی کے دوسرے دن وہ بانو کو لے کر دبئی چلا گیا اور اپنی ماں اور اپنے خاندان سے کٹ کے رہ گیا۔ لیکن دولت اس کے پاؤں چومتی رہی۔ اس نے جس کاروبار میں ہاتھ ڈالا کامیابی نے اس کو گلے لگایا۔

زیب اور بانو کا پہلا بچہ بیٹا ہوا۔ انھوں نے اس کا نام حیات رکھا۔ حیات کی پہلی

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

سالگرہ ایک عالیشان ہوٹل میں بڑے پیمانے پر منائی گئی۔ جب ممتاز نے سنا کہ اس کا پوتا ایک سال کا ہوا وہ ضبط نہ کر سکی اور اپنی بیٹی روشن کے ساتھ اپنا درد بانٹا۔

بادشاہ باغ کا سب سے بہترین پلاٹ جو بہت قیمتی تھا، زیب بٹ نے خرید لیا۔ پچاس ہزار روپئے فی گز کا چرچا سارے شہر میں بہت دنوں تک لوگوں کی گفتگو کا موضوع رہا۔

زیب نے اپنی بیوی سے کیے ہوئے وعدہ کی تکمیل کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھایا۔ اس بڑے پلاٹ پر شاندار محل کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس محل کا ڈیزائن اٹلی کے بہترین آرکیٹیکٹ نے بنایا تھا۔ تعمیر بڑے شد و حد سے جاری تھی۔ بے تحاشہ پیسہ بہایا جا رہا تھا۔

بانو جب سے دُبئی گئی اپنے وطن واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے بچے کو دُبئی کے ایک بڑے اسپتال میں جنم دیا۔ بیٹی کا نام جنت رکھا گیا۔

زیب کا بیٹا حیات دو سال کا ہوا اور جنت ایک سال کی۔ ممتاز کو معلوم ہوا کہ حیات دو سال اور جنت ایک سال کی ہو گئی، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس نے اپنی بیٹی روشن سے کہا ''مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی میں اپنے پوتے حیات اور پوتی جنت کو دیکھ پاؤں گی یا نہیں''۔

ماں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن ممتاز کو اپنے پوتوں کی دوری کھائے جا رہی تھی۔

جب حیات تین سال کا ہوا اور جنت دو سال کی تو زیب کی غزل مکمل ہوئی۔ محل 'غزل' نہ صرف بادشاہ باغ بلکہ سارے شہر میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے چرچا میں آ گیا۔ دیکھنے والے اس محل کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے۔

زیب نے بانو سے کہا ''بانو غزل تمہارا انتظار کر رہا ہے، ہم اگلے سوموار کو اپنے ملک

اور اپنے شہر جائیں گے''۔

جب بانو نے اپنے محل میں قدم رکھا،'غزل' غزل سے بھی خوبصورت تھا۔ بانو نے اپنے شوہر کو عقیدت اور محبت سے چوم لیا۔

ممتاز کو جب معلوم ہوا کہ اس کا پوتا حیات اور اس کی پوتی جنت بادشاہ باغ کے محل میں ہیں وہ ان کو دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھی۔ اس نے اپنی بیٹی روشن کو بلایا۔

''روشن میرے صبر کا پیمانہ چھلک رہا ہے، میں اپنے پوتے حیات اور اپنی پوتی جنت کو دیکھنا چاہتی ہوں''۔

روشن بولی''میں زیب کے پاس جاتی ہوں، اس کو بولوں گی دادی بچوں کو دیکھنا چاہتی ہے''۔

''روشن حیات میری زندگی ہے، جنت میری روح''۔

''ماں میں جارہی ہوں حیات اور جنت کو اپنے ساتھ لانے کے لیے''۔

جب روشن نے زیب کے عظیم محل پر دستک دی، پہرے دار نے کہا

''کس سے ملنا ہے؟''

''بھائی سے''۔

''ٹھہرو''۔

پہرے دار اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد زیب باہر آیا، روشن کو دیکھا'' کیسے آئی''۔

''ماں حیات اور جنت کو دیکھنا چاہتی ہے، ان کو لینے آئی ہوں''۔

''ماں نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا اور دارا، شجاع اور مراد کو اپنا لیا۔ مجھ سے اور میری زندگی کے کسی بھی حصے کے ساتھ اس نے تعلق نہیں رکھا، یہاں پھر کبھی نہ آنا''۔

روشن اپنے بھائی کے یہ تیور دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی گود میں کھیلتا تھا۔ روتے ہوئے وہ واپس لوٹ رہی تھی کہ ایک گاڑی محل میں جانے لگی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اس میں اس کا بھتیجا حیات اور بھتیجی جنت تھے۔ گاڑی محل کے دروازے پر رُکی۔ بچے نیچے اُترے۔ روشن نے ان کو پیار کیا، انھیں کچھ دیر تک اپنی بانہوں میں لیے رہی۔ زیب چاہ کر بھی اسے روک نہ سکا۔ روشن نے ماں کا دل نہ ٹوٹے اس لیے کہا......

"زیب اپنے بچوں کوایک دو دن میں بھیج رہا ہے"۔

ماں بولی "نہیں...... میں ان کو خود لینے جاؤں گی"۔

روشن بولی "نہیں، ماں وہ آجائیں گے"۔

روشن اور ممتاز کے لیے وہ رات بہت لمبی تھی۔ زیب بھی اس رات نہیں سویا۔ صبح ہوتے ہی بانو سے کہا "بچوں کو تیار کرو، ہم دُبئی واپس جارہے ہیں"۔

زیب، بانو، حیات اور جنت اسی دن دُبئی واپس چلے گئے۔ ممتاز حیات اور جنت کا انتظار کرتی رہی۔ دوسرے دن جب اسے معلوم ہوا کہ حیات اور جنت واپس دبئ چلے گئے اس کے آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ گئے۔ وہ روشن سے بولی......

"حیات اور جنت میری زندگی کے آخری پڑاؤ تھے"۔

کچھ دن ممتاز بیمار رہی۔ روشن اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جب آخری وقت آیا تو خاندان کے سارے افراد اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اس نے روشن کو نحیف ہاتھوں سے اپنے قریب بلایا اور کمزور آواز میں کہا

"روشن میں جارہی ہوں، حیات اور جنت آئے تو ان سے کہنا دادی تمہیں بہت پیار کرتی تھی"۔

ان آخری جملوں کے ساتھ ہی ممتاز اپنی زندگی کے آخری سفر کو روانہ ہوگئی۔ زیب نے جب اپنی ماں کی وفات کے بارے میں سنا تو اداس ہوا لیکن آخری رسومات میں شریک نہ ہوا۔

زیب اگلے دو سال اپنے وطن واپس نہیں آیا۔ بانو اپنے خوابوں کے محل اور اپنے شہر

کو دیکھنے کے لیے تڑپتی رہی۔اس نے زیب سے کہا

''حیات اب پانچ سال کا ہونے والا ہے، میں چاہتی ہوں کہ اس کی سالگرہ غزل میں اپنے احباب کے ساتھ منائیں''۔

زیب بولا''پھر تیاری کرو، ہم وطن جائیں گے''۔

جس دن ان سب نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا خوشگوار دھوپ کھلی تھی۔ وادی کے خوبصورت باغیچوں نے ان کا استقبال کیا۔ ہنستے ہوئے خوبصورت پھولوں نے ان کو خوش آمدید کہا۔ ہر طرف مسرت کا ماحول تھا۔ وہ اپنے محل 'غزل' پہنچے۔ حیات اور جنت کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ کھیلنے میں مگن ہو گئے۔ زیب اور بانو اپنے بیٹے حیات کی سالگرہ کے انتظامات کو ترتیب دینے لگے۔ حیات کی سالگرہ پر بادشاہ باغ کے امیر کبیر، سیاستداں، افسر شاہی کے بڑے افسر سب ہی موجود تھے۔ نہ تھے تو ان کے چاچے چاچیاں اور ان کی پھوپھی اور پھوپھا۔

حیات کی سالگرہ ایک مثالی سالگرہ تھی۔ لیکن نہ جانے زیب زندگی میں پہلی بار خود کو پرسکون نہیں محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ اس نے ایک مشہور مصور سے اپنی ماں کی قلمی تصویر بنوائی اور اپنے بچوں کے کمرے میں لگوائی تھی۔

''یہ تمہاری دادی ہے''۔

اس رات سے شہر اور گاؤں میں بڑی زبردست موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ سات دنوں تک جاری رہا۔ ایسی بارش نہ پہلے دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ زیب ہر دن اپنی ماں کی تصویر کے سامنے کھڑا ہوتا جیسے ماں کچھ بولنے والی تھی لیکن تصویر کیا بولتی اور نہ زیب کے پاس کچھ بولنے کے لیے تھا۔

زیب کچھ دنوں سے سو نہیں پا رہا تھا لیکن اس رات وہ سویا۔ جب اس کی مست نیند ٹوٹی اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے باہر بہت شور سنا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ہر طرف چیخ و پکار تھی "بچاؤ...... بچاؤ"۔

زیب نے اپنی کھڑکی کھولی، ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ سیلاب کا یہ منظر دیکھ کر وہ لرز اٹھا۔ یوں لگتا تھا کہ سیلاب شہر کو نگل جائے گا۔

وہ خود کو قدرت کے اس قہر کے سامنے بے بس پا رہا تھا۔ اپنی کم عمری میں اس نے تجارت میں بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے اور کامیابی کے ساتھ ان پر عبور پایا۔ ہر نقصان کو نفع میں بدلا۔ لیکن اس سیلاب کے سامنے وہ کچھ نہ کر سکا۔ جلدی سے اپنی بیوی اور بچوں کو جگایا۔

زیب ایک کمرے سے دوسرے کمرے دوڑ رہا تھا۔ پانی تیزی سے دوسری منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس رات کی صبح وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ محل کی چھت پر آ گیا۔ آج اس کا یہ شاندار محل اس کا محافظ نہیں تھا۔ آسمان سے گزرنے والے ہر ہیلی کاپٹر کو وہ آواز دیتا "میرے بچوں کو بچاؤ"۔

پانی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ زیب کو لگا کہ کچھ ہی وقت میں سیلاب کا تیز رفتار پانی ان کو نگل جائے گا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ان کے پاس سے ایک بچاؤ شکارا گزرنے لگا "مجھے بچاؤ...... میرے بچوں کو بچاؤ"۔

اس شکارے کو دو نوجوان چلا رہے تھے۔ نوجوان نے کہا "اس شکارے میں پہلے ہی بیس آدمی ہیں، آپ کو نہیں لے سکتے لیکن ہم واپس آ رہے ہیں"۔

زیب نے روتے ہوئے کہا "کم از کم میرے بچوں کو تو لے جاؤ"۔

شکارے میں سوار افراد نے نوجوان سے کہا "بچوں کو لے لو"۔

نوجوان نے کہا "اب اور بوجھ سے افراد کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے"۔

شکارے میں سوار افراد نے یک زبان ہو کر کہا...... "اللہ نگہبان"۔

حیات اور جنت شکارے میں آ گئے۔ زیب اور بانو اپنے عالیشان محل کی چھت پر رہ

گئے۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ کوئی ان کو بچانے کے لیے آجائے۔

اچانک زیب بوکھلائے انداز میں بول پڑا ''ماں کی تصویر کمرے میں رہ گئی، میں اس کو لانے جارہا ہوں''۔

وہ کمرے کی طرف دوڑا۔ بانو اس کے پیچھے چلی ''رُکو......رُکو!''۔

اسی وقت پانی کا ایک زبردست ریلہ آیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔

اب نہ زیب تھا، نہ بانو تھی......صرف ان کے خوابوں کا محل سیلاب کے حصار میں تھا۔

شکارا جب ریلیف کیمپ کے سامنے رک گیا تو حیات اور جنت بھی اتار دیئے گئے۔ دونوں زار زار رو رہے تھے۔ روتے روتے تھک گئے تو ان کے سامنے ایک بوڑھی عورت آکر کھڑی ہوگئی۔

حیات بول پڑا ''دادی......دادی''۔

''دادی تم کہاں تھیں؟'' جنت بولی۔

ریلیف کیمپ کے انچارج نے بوڑھی سے کہا...... ''یہ تمہارے بچے ہیں؟''

بوڑھی نے اقرار میں سر ہلایا۔

انچارج بولا ''سنبھالو اپنے بچوں کو، روتے روتے آسمان سر پر اٹھالیا''۔

بوڑھی نے حیات اور جنت کو اپنی گود میں بھر لیا۔

جیسے ہی اندھیرا ہوا بوڑھی خاموشی کے ساتھ ریلیف کیمپ سے حیات اور جنت کو لے کر روانہ ہوئی۔ اس نے اپنے نحیف کندوں پر حیات اور جنت کو بٹھالیا اور تقریباً ایک گھنٹے چلتی رہی۔ پھر وہ ایک معمولی مکان کے سامنے رک گئی اور دروازے پر دستک دینے لگی۔ اندر سے ایک عورت کی آواز آئی ''رات کے اس وقت کون؟''

جیسے ہی اس معمولی مکان کا دروازہ کھلا، بوڑھی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

لے لے

وحشی سعید نمبر

دروازہ کھولنے والی عورت روشن تھی۔ روشن نے جب بچوں کو دیکھا وہ خوشی سے بول پڑی......

''حیات اور جنت''۔

اس نے دونوں بچوں کو گلے لگایا۔

''میرے بچوں تمہارے ابو اور امی کہاں ہیں؟''

دونوں بچوں نے توتلی زبان سے سیلاب کا منظر پیش کیا۔

روشن بولی ''تم کو یہاں کون لایا؟''

دونوں بچے ایک ساتھ بول پڑے ''دادی''۔

روشن اندھیرے میں ماں کو ڈھونڈنے لگی۔ اچانک اس کو یاد آیا کہ ماں کا انتقال ہوئے دو سال ہو گئے۔

روشن نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں چاند کے ارد گرد ان گنت تارے تھے۔ وہ آسمان دیکھ کر زیر لب مسکرائی، کیونکہ اسے اپنے والد کا یہ جملہ یاد آیا......

''آسمان اتنا بڑا نہیں کہ میری مٹھی میں نہ آسکے''۔

☆☆☆

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

عجائب گھر کا طوطا

پرانے وقتوں کی کئی بار بگڑی اور بنی، کئی بار اجڑی اور بسی اور کئی بار آباد اور برباد اس عمارت کو اب عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وہیں سامری کی دنیا سے بھاگا ہوا طوطا ہمارے شہر کے اس عجائب گھر کا مکین بن گیا۔ اس کی یہ خوبی تھی کہ دنیا کی ساری زبانوں میں گفتگو کر لیتا تھا۔ خوبصورت اور خوشنما طوطا جو سب کا پیارا تھا اور ہر آنے والے مہمان سے اس کی ہی زبان میں ہم کلام ہوتا۔

عجائب گھر کو پرانے وقتوں کی پرانی چیزوں سے سجایا گیا تھا۔ شہنشاہوں کی فاتح تلواروں کی انمول قلمی تصویروں سے عجائب گھر کی دیواریں مزین تھیں۔ نایاب دستاویز اور کتابیں اس عجائب گھر کی زینت تھیں۔ ان بتوں کو بھی عجائب گھر میں جگہ ملی تھی جنھیں صدیوں سے پوجا جا رہا تھا اور ان سب کے درمیان ہمارا بولتا ہوا خوشنما طوطا۔

عجائب گھر کی عمارت سے لگی ہوئی ایک نئی شاندار عمارت بھی تھی۔ اس عمارت کے سامنے ایک چاندی کا بنا ہوا بہت بڑا ترازو رکھا گیا تھا۔ اس کی مناسبت سے اس شاندار عمارت کا نام بھی رکھا گیا۔

اس عمارت میں لوگوں کے دکھوں کی داستانیں سنی اور سنائی جاتی تھیں

کسی کی عزت و ناموس پر کس نے حملہ کیا، کس نے کس کا قتل کیا، لیکن ان غموں کا مداوا اور ان جرائم پر فیصلہ انصاف کی صورت میں نہیں ہوتا تھا۔ ایک متعین عرصہ پر یہاں کے چہرے تو بدلتے تھے لیکن انصاف......؟

بہت دنوں کے بعد یہاں کے شہری سمجھ پائے کہ وہ اس دور میں جی رہے ہیں جس میں سمندر بھی پانی مانگتا ہے، جہاں لالہ و گل بھی خوشبو کے لیے ترستے ہیں۔ پھر بھی وہ

لمحے

وحشی سعید نمبر

اس امید میں جیتے رہے کہ ان کے یقین کا شجر کبھی تو پھلے پھولے گا۔ حالانکہ اکثر لوگ اس دنیا سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ ''ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا''......

دھیرے دھیرے اس خیال نے زور پکڑنا شروع کیا۔

اس شہر میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں تھی جو خود کو معززین کہتے تھے۔ ان معززین نے ایک نشست بلائی جس میں یہ سوال اٹھایا گیا۔

اب لوگوں کے یقین کا شجر بھی خزاں کی مایوسی میں گم ہورہا ہے۔ ''ہمارے ہاتھ کچھ نہ لگا'' کا نظریہ زور پکڑتا جارہا ہے۔ حالات قابو سے باہر ہورہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ایک بزرگ زیرلب مسکرایا

''کوئی نیا کھیل، کوئی نیا ڈرامہ''۔

''کیا مطلب؟'' سب ایک ساتھ بول پڑے۔

''عجائب گھر کے طوطے کو ترازو والی عمارت کے سب سے عالیشان کمرے کی سب سے بڑی اور قیمتی کرسی جسے ''انصاف کرسی'' بھی کہا جاتا ہے، پر بٹھا دیا جائے۔

شہر کے معززین نے عجائب گھر کے طوطے کو ایک بڑی اور خوبصورت بگھی میں بٹھایا۔

اس بگھی کو فوج کی پلٹن کھینچ رہی تھی۔ بگھی کے ساتھ شہر کے نام نہاد معززین کے علاوہ سرمایہ دار، سیاست داں، ادباء وشعرا، مفکر و دانشور سب تھے۔ بگھی کے آگے آگے پولیس کے بینڈ جاہ وحشمت کی مختلف دھنیں بجا رہے تھے۔ ناچنے والے ناچ رہے تھے، گانے والے گا رہے تھے۔ بہت بڑے تماشے کے ساتھ بگھی ترازو والی عمارت میں داخل ہوئی۔ طوطے کو بگھی سے اتار کر ترازو والی عمارت کے سب سے عالیشان کمرے کی سب سے بڑی اور سب سے قیمتی ''انصاف کرسی'' پر رکھا گیا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

جس بزرگ نے خوبصورت طوطے کو اس بڑی اور قیمتی انصاف والی کرسی پر رکھا، طوطے سے کہا......

''ہم نے تمہیں ''ترازو'' سونپ دیا ہے۔ اس قوم کے دکھوں پر انصاف کا مرہم رکھنا، یہ آج تک خون کے آنسو روتی رہی ہے۔ اس قوم کی ماؤں نے اپنے لاڈلے کھوئے ہیں۔ لوگ اندھیروں میں گم ہوئے ہیں اور دوشیزاؤں کا ناموس پارہ پارہ ہوا ہے، اب تو ہی ہمارا مسیحا ہے''۔

طوطا اداس ہو گیا، کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا......

''بزرگ محترم! آپ نے اور آپ کے لوگوں نے جس اعتماد کے لائق مجھے سمجھا، میں اس اعتماد کی کسوٹی پر پورا اُتروں گا''۔

لیکن اس رات آسمان پر ایسے بادل پھیلے کہ آسمان بھی نظر نہ آتا تھا۔

کئی دنوں تک زوردار بارش ہوتی رہی۔ کئی دنوں تک سورج اور آسمان دونوں غائب رہے۔ شہر میں قہر برپا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر زیرِ آب آ گیا۔ ہر طرف ماتم اور ہو کا عالم تھا۔

''ترازو والی عمارت'' بھی ڈوبنے لگی۔ طوطا اپنی نحیف قوتِ جسمانی سے کرسی سنبھالے ہوئے تھا لیکن کب تک......؟ پانی کا ایک ایسا ریلا آیا کہ طوطا نہ خود کو اور نہ ہی کرسی کو سنبھال سکا۔ کچھ دنوں بعد جب سیلاب کا پانی اترا تو لوگ جوق در جوق ترازو والی عمارت کے سامنے جمع ہو گئے۔ لیکن ترازو والی عمارت کا ترازو سیلاب اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لوگ عجائب گھر کے طوطے کی تلاش کرنے لگے کیونکہ اب ان کو طوطے کی مورتی عمارت کے سامنے نصب کرنی تھی، تاکہ آنے والی نسلوں کو تو معلوم ہو کہ سامری کی دنیا سے بھاگا ہوا ایک طوطا جو کہ عجائب گھر کی زینت تھا، کبھی ترازو والی عمارت کی سب سے بڑی اور قیمتی انصاف والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

☆☆☆

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

قاتل......مقتول......؟

مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اس کو موت کی نیند سلانا ہوگا جو ہماری آنے والی صدی کو خون سے نہلا دے گا۔ عہد حاضر کو اور آنے والی صدی کو اس آفت سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے قتل کے سوا چارہ نہیں۔

وہ خوبصورت شخصیت کا مالک تھا جو پچاس سال کی عمر میں بھی چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ خوش گفتار، اپنی باتوں سے سب کو گرویدہ بنانے والا، لوگوں کا کتنا ہی بڑا ہجوم ہو، کتنا مشکل ہجوم ہو وہ اپنی لچک دار باتوں سے ایسا سماں باندھتا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔

اس خوبصورت اور خوش گفتار شخص کا میں خود بھی گرویدہ تھا اور اس کو قتل کرنا وہم و گمان میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔ لیکن موجودہ اور آنے والی صدی کے تحفظ کا معاملہ تھا اس لیے میں دل پر پتھر رکھ کر تیار ہو گیا۔ میرا نشانہ آج تک کبھی خطا نہیں ہوا تھا کیونکہ مجھے اس کی تربیت سالوں سال دی گئی تھی۔ اس کی موت میرے ہاتھوں یقینی تھی، بس کب اور کہاں ہوگی یہ مقرر کرنا تھا۔

وہ خوش گفتار اکثر کہتا تھا......

''اگر تم میں یقین ہو، جستجو ہو، تم جھوٹ کے سائے میں بھی سچ کو ڈھونڈ لاؤ گے''۔

اس کے یہ جملے میرے ذہن میں دن رات گونجتے تھے اور آج میں اس کی موت کے پروگرام کو ترتیب دے رہا تھا۔

اس خوبصورت شخص کا خوبصورت مکان جھیل کے کنارے تھے۔ اس خوبصورت مکان کے سامنے ایک بڑا سرسبز میدان تھا۔ رنگ برنگ پھولوں سے دلہن کی طرح سجا

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ہوا، اس خوبصورت گلشن میں اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی دلفریب نقش و نگار سے آراستہ کرسی پر بیٹھ کر وہ اپنے مکان کے اردگرد کے نظاروں کو اپنی آنکھوں میں بھر لیتا تھا۔ وہاں کتنے ہی لوگ کس وقت آتے تھے ان کی تعداد گننا گیٹ پر کھڑے چوکیدار کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔

مجھے اس خوبصورت شخص کے خوبصورت مکان میں جانا ضروری تھا۔ اس لیے کہ مکان اور اس کے اردگرد کے ماحول کا نقشہ اپنے دماغ میں بٹھانا تھا۔ اپنے منصوبہ کو انجام دینے سے پہلے ہر باریکی کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنا تھا۔ پہلی بار جب میں اس کے سامنے کھڑا ہوا، اس نے کہا

''کیسے آئے؟ کس لیے آئے؟''

میں نے سوال پر سوال کیا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''راستہ ہمارے سامنے ہے''۔

''لیکن اندھیرا کیوں ہے؟''

''کیونکہ بند آنکھوں میں اندھیرا بستا ہے''۔

میں ایک بار پھر اس خوش گفتار آدمی کا گرویدہ ہو گیا۔ کئی دنوں تک میں اس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ مختلف لوگوں سے ملتا، ان کے سامنے لمبی لمبی گفتگو کرتا، میں اس کی تمام حرکات وسکنات پر نظر گڑائے رکھتا۔

اب میں موقع کی تلاش میں تھا کہ اس کے قتل کو انجام دینے کے بعد اگلے مشن پر روانہ ہو جاؤں۔

قتل کرنے کے لیے وہ وقت سب سے مناسب تھا جب دن کی روشنی رات کے اندھیرے میں گم ہو جاتی اور وہ اپنی چھوٹی سی لائبریری میں مطالعہ کے لیے جاتا تھا اور

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

کتابوں میں محو ہو جاتا تھا''۔

میں جب اس کا صحن پار کرتے ہوئے لائبریری کی جانب بڑھ رہا تھا، بار بار یہ خیال آتا کہ میں آنے والی صدی کو خونریزی سے محفوظ کر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''پھر تم......!''

میں نے اپنی جیب سے پستول نکالی۔

وہ مسکرایا۔

''مجھے معلوم تھا تم سے یہ گناہ سرزد ہوگا، تم نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہو، میں تمہیں اپنا قتل معاف کرتا ہوں''۔

اس لمحے، اس پل میرے احساسات مردہ ہو گئے۔ پستول کی گولی اس کے سینے کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔

یہ خبر سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ خوش گفتار کا قتل ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جھیل والے مکان میں سارا شہر امڈ آیا۔

ہزاروں لوگوں نے اس کے جسد خاکی کو اپنے بدلتے کندھوں پر لیا اور شہر کی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے میدان میں لائے۔ وہیں اس کو سپرد خاک کیا گیا۔

شہر غم میں ڈوب گیا۔

بدلتے ہوئے یہ حالات میرے ضمیر پر کوڑے برسا رہے تھے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر کے ان حالات سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن خوش گفتار کے یہ جملے بار بار یاد آتے......

''بند آنکھوں میں اندھیرا بستا ہے''۔

میں نیند سے بھاگتا رہا، ہر پل میرے لیے عذاب تھا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''اب کیا کروں؟''

یہ سوال دن رات میرا پیچھا کرتا۔

میں باتوں میں آکر اگلی صدی پر ظلم کر بیٹھا۔ نہ میں آنے والے کل کو بچاسکا نہ خودکو۔ خونریزی دیکھ کر آنسوؤں میں خون بہتا رہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس مسلسل عذاب سے خودکو آزاد کیا جائے۔ جب وردی پوشوں نے مجھے نرغے میں لے لیا، میں نے خودکو ہوا میں اڑا دیا۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے میری لاش اٹھائی اور مجھے بھی اس بڑے میدان میں دفنا دیا، جہاں میرے ہاتھوں قتل ہوا خوش گفتار دفن تھا۔ اسی کے بغل میں مجھے بھی سپردِ خاک کر دیا۔ وہ دن اگلی صدی کا پہلا دن تھا۔

قاتل......مقتول......؟

☆☆☆

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

انتظار......اور......میں؟

میں عمر کے اس پڑاؤ پر ہوں جہاں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر بہت خوبصورت لگتا ہے، جہاں بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لو بھی زندگی کا یقین دلاتی ہے۔ زندگی اس پڑاؤ پر ہمارے دل میں جو بچے ہوئے بت ہوتے ہیں وہ ہمیں بہت عزیز ہوتے ہیں۔ ان بتوں کے ٹوٹنے کے احساس سے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی میں اپنے آپ سے اور اپنی اس کیفیت سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر کے قریب ایک کھنڈر میں پناہ لیتا ہوں اور قدیم کھنڈر کی داستانِ پارینہ میں کھو جاتا ہوں۔

ایک رات میں گہری نیند میں تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جن بتوں کو جان سے عزیز رکھتا ہوں وہ میرے بستر کے ارد گرد خونخوار انداز میں گشت کر رہے ہیں، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں کھنڈر کی طرف بھاگا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ غش کھا کے زمین پر گر گیا۔ جب ہوش میں آیا ایک خوبصورت عورت کو اپنے اوپر جھکا پایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ عورت نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ میں ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ اس لمحے کہیں سے کھنڈر کے دروازے پر ایک معصوم بچہ آ کھڑا ہوا اور دل خراش آواز میں رونے لگا۔ بچے کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میرے جسم میں ایک آہنی قوت بجلی بن کر دوڑی۔ میں عورت کو ایک طرف کر کے معصوم بچے کی جانب دوڑ پڑا۔

وہ معصوم بچہ ندی کی سمت دوڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس کی رفتار مجھ سے قدرے تیز تھی۔ میں ہانپتے ہوئے رک گیا۔ وہ بھی رک گیا، اب اس نے

رونا بند کر دیا اور عجب انداز سے ہنسنے لگا۔

اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہو گیا۔ میں اس کو گود میں اٹھانے کے لیے بڑھا کہ عورت اچانک نمودار ہو گئی۔ اس نے مجھے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور لپک کر بچے کو گود میں بھر لیا اور بھاگنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا، بچہ منھ بنا بنا کر میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس حیرت انگیز سفر نے مجھے ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ وہ عورت جو مجھے اپنی بانہوں سے آزاد نہیں کرنا چاہتی تھی، اب مجھ سے بھاگ رہی تھی۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟

یہ سب سوچ اور ادراک سے پرے تھا۔

اچانک عورت رک گئی اور مجھے اشارے سے کہنے لگی۔

''اپنے پیچھے دیکھو''۔

میں پیچھے مڑا۔ میرے پیچھے وردی پوش سپاہی دوڑ رہے تھے۔

وہ چیخے ''رُکو......! رُکو......!''

میں بھاگتا رہا۔

وہ چیختے رہے۔

''عورت کو اغوا کرنے کے جرم میں خود کو ہمارے سپرد کرو''۔

میں پھر بھی نہ رکا۔

''اگر اب بھی تم نہ رکے تو ہمیں مجبوراً گولی چلانی پڑے گی''۔

میں جنون میں تھا اس لیے بھاگتا رہا۔ اس سے پہلے کہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا ایک سنسناتی ہوئی گولی میری پیٹھ سے داخل ہو کر دل کے اندر سما گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اب میرے سامنے ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر آ گیا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہو گئیں، بت ٹوٹ گئے۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

عورت نے اپنی سدھ بدھ کھو دی۔ سوٹ بوٹ والا مرد اس کو کوس رہا تھا۔ عورت نے اپنے آنسو پونچھ لیے، پھر اس نے اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ بچہ جو اس کی گود سے نکل کر ندی کی طرف گیا تھا، ندی میں کود پڑا اور ندی کے پانی میں ہاتھ ہلا ہلا کر بچانے کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔

عورت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی، جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔

پھر بچہ آخری بار چیخا......

''بچاؤ''۔

ندی نے بچے کو نگل لیا، عورت بے حس بت کی طرح بچے کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

سوٹ بوٹ والے آدمی نے پانی میں چھلانگ لگائی لیکن بچے کو نہ بچا سکا۔ اس نے پانی سے مردہ بچے کو نکال کر زمین پر لٹا دیا اور چیخ پڑا......

''ذلیل عورت''۔

عورت نے سپاہیوں کا نرغہ توڑ کر سوٹ بوٹ والے آدمی کا گریبان پکڑ لیا۔

''میرا انتظار ختم اور تمہارا شروع''۔

عورت نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور ندی میں کود گئی۔

اس کی لاش پانی سے نکال کر زمین پر رکھی گئی۔ اب اس کے کھلے چہرے پر نہ جانے کیوں سکون اور اطمینان تھا۔ پاس کھڑا سوٹ بوٹ والا آدمی اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دانتوں سے چبا رہا تھا، میں یہ نہ جان سکا کہ عورت نے اپنے انتظار میں مجھے کیوں شریک کیا؟

اب سورج ڈوب گیا۔



شہنشاہ، قاتل، تلوار

انجان ملک کے انجان شہنشاہ کے اردگرد وزراء کی خاصی تعداد جمع تھی لیکن ان کے پاس کون کون سے محکمے تھے، وہ اس سے انجان تھے۔ٹوٹے ہوئے تخت طاؤس پر مسند نشین شہنشاہ نے مجھ سے کہا......

''تمہارا قتل ہو گیا ہے اور تمہیں اپنے قاتل کو ڈھونڈنا ہے''۔

مرے ہاتھوں میں ایک قدیم تلوار سونپ دی گئی۔

''تمہیں خود اپنا انصاف کرنا ہوگا''۔

میں تلوار کے ساتھ ایک وسیع ریگزار، جس کو انسانی آنکھ احاطہ میں نہیں لے سکتی تھی، کھڑا تھا۔ سامنے ایک فربہ سفید گھوڑا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ برق رفتاری سے بھاگنے لگا۔ جلد ہی وہ سمندر کے پاس تھا۔ سمندر کے پار ایک بڑی دنیا میری منتظر تھی جس کے ہجوم میں مجھے اپنے قاتل کو تلاش کرنا تھا۔

اس دنیا میں کیا نہیں تھا، آسمان چھوتی ہوئی عمارتیں، لمبی چوڑی سڑکیں، ہوا سے باتیں کرتی ہوئی گاڑیاں، سمندر کی لہروں کے تھپیڑے، بپھرتے ہوئے سمندر میں جہاز، فضا میں ہوا سے تیز رفتار ہوائی جہاز۔ ہر طرف گہما گہمی، ہر ایک اس قدر مصروف کہ سر اٹھانے اور ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے فرصت نہیں تھی۔

میں اس دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا۔ جب میں اپنے سفید گھوڑے کو اس شہر کی شفاف سڑکوں پر دوڑانے لگا، لوگ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے......

''کیا دو سو سال پرانا زمانہ واپس لوٹ آیا ہے؟''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

پھر اچانک آندھیاں چلیں، نیلے آسمان کو بادلوں نے ایسا گھیرا کہ آسمان غائب ہو گیا۔ آناً فاناً ایسی موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ تمام سڑکیں دریا ہوگئیں، لوگ گھروں میں مقید تھے۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے بھی خود کو بچانے کے لیے پناہ گاہ میں پناہ لی۔

کئی دنوں کی بارش کے بعد آسمان میں تاروں کا جھرمٹ نظر آیا۔ اب چاند کی چاندنی میں سارا ماحول نہا رہا تھا۔ ہر مکان، ہر سڑک، ہر پہاڑی چاند کی چاندنی سے ایسے نکھرے جیسے پورا شہر چاند بن گیا ہو۔ میں بھی اس ماحول میں ایسا کھو گیا کہ سب کچھ بھول گیا اور اپنی پناہ گاہ میں سونے کے لیے چلا گیا۔

میں سونے ہی والا تھا کہ مائک سے اعلان ہوا...... ''گھروں سے باہر نکلو''۔

میں کچھ ٹھٹکا کیونکہ ایسا اعلان تین دہائی پہلے میں اپنی دنیا میں سنا کرتا تھا اور اب یہاں......!

لوگوں کا جم غفیر سڑکوں پر نکل آیا۔ میری دنیا میں تین دہائی پہلے بھی لوگ ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے اور آج بھی۔

''کیا ہوا؟''

''شہر سیلاب میں ڈوب گیا، اب ہمارا کیا ہوگا؟''

مجھے یاد آیا کہ اپنے قاتل کو ڈھونڈنا ہے لیکن پہلے خود کو سیلاب سے بچانا تھا۔ سیلاب کے ریلے میرے بیحد طاقتور گھوڑے کو بھی ایسے نگل گئے جیسے وہ کوئی گھاس کا تنکا تھا۔ اب میرا اثاثہ صرف میری تلوار تھی۔

سیلاب اتر گیا۔ ہزاروں لوگ بے گھر ہوگئے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کرتے تھے۔ پریشان حالی نے ان کی آنکھوں کو بدل دیا تھا۔ وہ اندھے ہوگئے تھے اور اندھوں کی اس دنیا میں مجھے اپنے قاتل کو ڈھونڈنا تھا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

بہت کوشش کی، بہت ہاتھ پیر مارے لیکن کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

سیلاب کی تباہی نے سب کچھ اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔ میرے لیے وہ اعلان بڑا حیران کن تھا جو ریڈیو اور ٹی.وی سے نشر ہو رہا تھا کہ میری دنیا کا شہنشاہ اس دنیا میں اس دنیا کے حکمران سے ملنے آ رہا تھا۔ دونوں کو ہاتھ ملا کر ایک نئ دوستی کی تاریخ رقم کرنا تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

میرے شہنشاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا قاتل یہاں ہے اور وہ خود یہاں!

شہر کے راستوں کو ایسے سجایا گیا تھا جیسے یہاں کبھی سیلاب آیا ہی نہیں تھا جیسے اس شہر کو سیلاب نے تہس نہس نہیں کیا تھا۔ لیکن آج سارا شہر ایک نئ نویلی دلہن کی طرح سج گیا۔ پولیس والوں کو نئ وردی پہنائی گئی۔ ہر چوک پر پھولوں کے دروازے کھڑے کیے گئے۔ یہ سب ہمارے شہنشاہ کے لیے تھا۔

ایک نئ صبح، ایک نیا سورج، ایک نیا فریب؛ ہمارا شہنشاہ ایک شاہی بگھی میں سوا ہوا۔ جب وہ سڑکوں سے گزر رہا تھا لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ انہی لوگوں میں میرا قاتل بھی چھپا ہوا ہے۔

پھر وہ لمحہ آیا جب ہمارا شہنشاہ یہاں کے حکمران سے ملا، جیسے وہ دیرینہ دوست ہوں۔ وہ لمحہ قیامت خیز تھا جب مجھ پر آشکار ہوا کہ میری دنیا کا حکمران ہی میرا قاتل تھا، میرا قاتل......!

میرے ہاتھوں میں میرے شہنشاہ نے جو تلوار سونپی تھی وہ گر کر سمندر کی تہہ میں دفن ہو گئی۔ اب میں اس انتظار میں ہوں کہ کوئی تو ہوگا جو سمندر کی تہہ سے تلوار نکال کر میرے ہاتھوں میں سونپ دے گا۔

☆☆☆

چور پولس

وہ ایک ماہر نفسیات، اعلیٰ پائے کا جادوگر اور شاطر چور تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا پولس افسر بھی اپنی صلاحیت کا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے شاطر چور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا......

''تم کتنی ہی گھما پھرا کر باتیں کرو، آخر کار تمہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تم نے ہی ملکہ کو قومی عجائب گھر سے غائب کیا ہے''۔

شاطر چور مسکرانے لگا اور لمبی سانس لیتے ہوئے بولا......

''یہ زمانہ CCTV کا ہے، کون کون آپ کے عجائب گھر میں داخل ہوا، سب کی فلم موجود ہے پھر آپ مجھے کیوں پریشان کرر ہے ہیں۔ اگر آپ کے ریکارڈ میں یہ موجود ہے کہ میں نے ہی ملکہ کو غائب کیا ہے تو مجھے جیل میں ڈال دیجیے۔ مجھ سے اس طرح قبول کروانے کا کیا مطلب؟''

وہ حوالات کی سفید دیواروں کو تکنے لگا۔

پولس افسر اس کے اس انداز سے کچھ اخذ کرنے لگا۔

''تم جادوگر بھی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ تم CCTV کیمرے کی نظروں میں دھول جھونک کر اور پھر اپنے ماہر نفسیات ہونے کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل گئے ہو۔ بتاؤ سچائی کیا ہے؟ تم نے کیسے ملکہ کو عجائب گھر سے غائب کیا؟''

''جناب میں جب بچہ تھا تو ایک دوکان سے مٹھائی چرائی۔ وہ بات اتنی پھیلی کہ سب مجھے چور سمجھنے لگے۔ کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ایک معمولی جادوگر ہوں۔ میرا جادو دیکھنے والے میرے سجائے ہوئے خوابوں کی دنیا

میں سیر کرتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے میں ان کے دل بہلاتا ہوں۔ کیا اس قسم کا جادوگر ہونا گناہ ہے''۔

''ایسی لچھے دار باتوں سے تم مجھے الجھا نہیں سکتے، تم اپنے جادو میں نفسیات کا فن بھی استعمال کرتے ہو اور نفسیات میں جادو کا فن۔ اور ان دونوں کا استعمال تم چوری میں کرتے ہو۔ CCTV کے تحفظ سے بچ نکلنا تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ تمہیں اپنا گناہ قبول کرنا ہوگا۔ تم نے ملکہ کو غائب کر کے ملک کی امانت میں خیانت کی ہے۔ ملکہ کہاں ہے، کس حال میں ہے؟ بتاؤ ورنہ تم خود کو بہت بڑی اذیت میں مبتلا پاؤ گے''۔ یہ کہہ کر پولس افسر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا اس کے دائیں کندھے پر رکھ دیا''۔

''ایک ماہر نفسیات پر اپنے نسخے مت آزماؤ آفیسر۔ میرے پاس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہاں تم مجھ پر ڈنڈے برسا کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکتے ہو۔ مگر یہ شعلہ اور بڑھے گا کیونکہ مرتے دم تک میرا ایک ہی جواب ہوگا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں''۔

پولس افسر یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے ڈنڈے کو اس طرح مسلنے لگا گویا اس کی مالش کر رہا ہو۔ پھر غصے کا گھونٹ پیتا ہوا کمرے سے باہر آیا اور اپنے اعلیٰ افسر کے پاس جا کر کہنے لگا......

''ٹیڑھی کھیر ہے، ٹوٹنے والا نہیں''۔

اعلیٰ افسر نے اپنے اس پولس افسر کی جانب دیکھا اور کچھ غور کرتے ہوئے بولا......

''نفسیات کہتی ہے کہ یہ شاطر چور اب شہنشاہ کو قابو میں کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا''۔

''لیکن ہم نے شہنشاہ کو جس جگہ رکھا ہے وہاں تک اس کی رسائی ناممکن ہے، اور

پھر یہ بھی تو ہماری قید میں ہے''۔

''یہ تو قید میں ہے لیکن ممکن ہے اس کے کچھ ساتھی بھی ہوں، اور مان لو یہ شہنشاہ تک نہ بھی پہنچ سکے تو ملکہ کا مسئلہ تو بہر حال ہے ہی اسے حل کرنا ہی ہوگا''۔

''ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے سر۔''

''کیا؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملکہ کو واپس لانا ہے تو اس میں شہنشاہ سے بھی مدد لینی پڑے گی''۔

''کس قسم کی مدد''۔

''ہم اعلان کریں گے کہ قومی عجائب گھر میں شہنشاہ تشریف لا رہے ہیں، عوام کو دعوت ہے کہ وہ شہنشاہ کا دیدار کریں''۔

''ٹھیک ہے، تم شطرنج بچھاؤ، پورا پولس محکمہ تمہارے ساتھ ہے''۔

پولس افسر دوبارہ شاطر چور کے کمرے میں آیا۔

''یہ حقیقت ہے کہ قانون کبھی کبھی ثبوت کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی محتاجگی کی بنا پر تمہیں رہا کیا جاتا ہے۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائیگی، کبھی تو چھری کے نیچے آئیگی''۔

شاطر چور مسکراتا ہوا پولس تھانے سے باہر چلا گیا۔

اخبارات، ریڈیو، ٹی۔وی اور دیگر چینلوں نے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دی کہ قومی عجائب گھر میں عوام شہنشاہ کا دیدار کرسکتی ہے اور یہ موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔

شاطر چور قومی عجائب گھر کے اس ستون پر چڑھ گیا جہاں بادشاہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا، وہاں سے لوگوں سے کہنے لگا......

''لوگو! تم کیوں ایک کاغذی بادشاہ کے دیدار کے لیے اس طرح بوکھلائے ہوئے ہو۔ مجھے دیکھو میں اس ملک کا سب سے بڑا ماہر نفسیات اور جادوگر ہوں۔ میرا فن

دیکھو، میں اس کاغذی بادشاہ کو اڑا کر اس کی ملکہ کے پاس پہنچا دوں گا''۔

یہ سنتے ہی عوام میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ پولس محکمہ حرکت میں آ گیا۔

''اس نے ہمیں للکارا ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ قانون توڑنے والوں کو ایک دن قانون کے سامنے پشیمان ہونا پڑا ہے کیونکہ شاطر چور بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے''۔

اعلیٰ افسر نے کہا...... ''چوکنا رہنے کی ضرورہے''۔

عجائب گھر میں شہنشاہ کا پہلا دن عافیت سے گزرا۔ لوگ آتے رہے اور ملتے رہے، دوسرے دن بھی لوگ حسب معمول آتے رہے اور جاتے رہے۔ تیسرے دن جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو شاطر چور قومی عجائب گھر کے سامنے والے ستون پر کھڑا ہوا اور لوگوں کے جم غفیر سے مخاطب ہوا......

''آج میں آپ لوگوں کو ایسا جادو دکھانے والا ہوں کہ آپ لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ آپ آسمان کی جانب دیکھو، تاروں کا جھرمٹ دیکھو اور فضاؤں میں اپنی ملکہ کو تیرتا ہوا دیکھو''۔

فضا میں ملکہ کی شبیہ تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سارے لوگ اس تیرتے ہوئے پیکر کے پیچھے دوڑے۔ پولس افسر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا......

''آپ لوگ کہاں بھاگے جا رہے ہیں، یہ تو شاطر چور کا جادو ہے، اس کا دھوکہ ہے''۔

شاطر چور ہوا میں اچھلتا کودتا قومی عجائب گھر میں داخل ہوا، الارم بجے لیکن ان کی آوازوں پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ شاطر چور بادشاہ کے پاس جا پہنچا اور نہایت ہی احترام اور نفاست سے شہنشاہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور چل پڑا۔ پولس افسر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یکایک شاطر چور بہت تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگا۔ پولس افسر

وحشی سعید نمبر

بھی پوری جان لگا کر اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ شاطر چور سڑک کے چوراہے کے بیچوں بیچ بنی ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گیا جس کے چاروں جانب بڑے بڑے قد آور آئینے لگے ہوئے تھے۔ پولس افسر اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے نزدیک آ گیا تو وہ مسکراتے ہوئے اس عمارت کے ایک آئینے میں داخل ہو گیا۔ پولس والے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ بھی پیچھے پیچھے آئینے میں داخل ہو گیا۔

پولس افسر جب آئینے سے باہر آیا تو اس کا حلیہ تبدیل ہو چکا تھا، وہ خود شاطر چور کی طرح لگ رہا تھا۔ کیا چور پولس کا یہ کھیل تب تک جاری رہے گا جب تک حیات اور کائنات کا کھیل جاری رہے گا۔

''چور پولس......''

☆☆☆

عجب زندگی......غضب موت

روشنی بجھادو......رو......رو......شنی۔

حولدار کی آواز نے کالی اور اونچی دیواروں سے ٹکرا کر خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔ عبدالجبار کی کالی آنکھیں گھنی داڑھی کے پس منظر میں چمک رہی تھیں۔ لیکن لگتا تھا کہ یہ چمک بجلی کے بلب کے خراب ہونے سے پہلے کی آئی ہوئی چمک ہو اور جیسے ہمیشہ کے لیے کچھ ہی لمحوں بعد بجھ جانا ہو۔

اسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ تمہاری زندگی دم توڑ دے گی۔ زندگی کا نام سن کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حالانکہ اس کا ارتقا اسی لفظ سے شروع ہوا تھا، جب وہ پیدا ہوا تب زندگی کی شہنائیاں گونجیں۔ لیکن اب زندگی سے کتنی دیر کا واسطہ تھا۔ جلد ہی اس کا جسم مٹی کی طرح بے جان ہونے والا تھا۔ حولدار اس کے ہولے کے پنجرے کے سامنے سے یہ کہتا ہوا گزرا ''روشنی بجھادو''۔

وہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا، اچانک اس کے منہ سے نکلا......

''روشنی بجھادوں......لیکن کیوں؟ نہیں نہیں......رہنے دو ابھی روشنی کو......''۔

''تم بہادر آدمی ہو، پھر ہمت کا ساتھ کیوں چھوڑتے ہو، پھانسی پر چڑھنا ہے تو ہنستے ہوئے چڑھو۔ دوسروں کو یہ کہنے کا موقع نہ دو کہ تم موت کے نام سے ڈر گئے''۔

''موت''۔

اسے ہنسی آ گئی، لیکن اس میں شدید تلخی تھی۔ موت سے وہ کب ڈرا تھا۔ زندگی نے اسے دیا ہی کیا تھا۔ کچھ دنوں کی خوشی کے بعد سلسلے وار غم، دُکھ اور مصیبتیں اور آج وہ زندگی کی آخری رات جیل کے کالے اندھیروں میں کاٹ رہا تھا۔ زندگی...... ہاں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

زندگی...... کچھ بھی ہو زندگی، پھر بھی پیاری ہے۔ اچانک اس کے خیالوں میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ جیل کی سلاخوں کو کاٹ کر آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ لیکن وہ جیل کی دیواروں کو کاٹ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی انھیں پھاند سکتا تھا۔ وہ چاہنے لگا کہ زندگی کی یہ کالی رات اتنی لمبی ہو جائے کہ اس کی سحر کبھی نہ ہو۔ اس کے سامنے بچپن کا وہ منظر آ گیا جب وہ کھیتوں میں اچھلتا کودتا ندی کے کنارے تک چلا جاتا تھا۔ وہاں اس کی معصوم ساتھی گلابو، اس کی منتظر رہتی۔ وہ گلابو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میدانوں، کھیتوں کو پار کرتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ جاتا تو گلابو کہتی "اچھا اب میں جاؤں؟"۔

"ہاں، لیکن کل ضرور ملنا"۔

گلابو چلی جاتی اور وہ اس کو جاتے ہوئے تب تک دیکھتا رہتا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔

کھردرے ہاتھوں میں ہل بہت اچھا لگتا ہے اور اس پر آدمی کا پسینہ کھیت کے لیے خون بن جاتا ہے۔ عبدالجبار سو کنال کے وسیع وعریض کھیت کا مالک تھا۔ اس کے کھیت میں مزدوری کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی لیکن اس کے اندر کا کسانی خون جوش مارتا تھا اور وہ خود بھی ہل چلاتے ہوئے کھیتی باڑی میں نئے نئے تجربات کرتا رہتا۔ خود کے کھیت میں خود ہل چلانا اس کے روحانی سکون کا باعث تھا۔ وہ اس دھن میں اتنا کھو جاتا کہ خود کو شہنشاہ محسوس ہوتا۔ وہ شہنشاہ جو مدہوشی کے عالم میں ہچکولے کھا کر زندگی کا راگ الاپ رہا تھا اور جب اس راگ میں کسی حسینہ کا ذکر آتا تو اس کی زبان سے نکل پڑتا "گلابو!"

کل کے معصوم بچے کو گزرتے وقت نے صحت مند خوبصورت نوجوان میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن اس جوانی نے ان دونوں کو ملنے میں سماجی پابندیاں عائد کر دیں۔ اب

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

انھیں چھپ چھپ کر ملنا پڑتا تھا۔اچانک اس کے ذہن نے اس کے خیالوں کو منتشر کیا۔اس نے بیلوں کو روک کر اپنے بوڑھے ملازم سے پوچھا

''کاکا! وقت کیا ہوا؟''

''دوپہر ہونے کو آئی''۔

''دوپہر...... پھر تو مجھے جانا چاہیے''۔

گرمی نے زور پکڑا، پسینہ عبدالجبار کی سرخ چمڑی پر چمک رہا تھا۔اس نے کھیت کے پاس والی ندی میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور گھر کی جانب روانہ ہوا۔

اچھے خاصے گھر کے باہر اچھا خاصا باغ بھی تھا۔ یہاں اس کے والد کسی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔باپ کی نظروں سے بچتا ہوا وہ گھر میں داخل ہوا......''ماں!''

ماں نے شفقت بھری نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا......

''کیوں، تم آج پھر کھیت پر گئے تھے؟''

''گیا تھا''۔

''کیوں؟''

''ماں! مجھے ہل بڑا پیارا لگتا ہے''۔

''بیٹا! تمہاری یہ منطق مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ جو کام تم وہاں جا کر کرتے ہو وہ کام دو سو روپئے میں مزدور بھی کر سکتا ہے۔تم بڑے گھر کے چشم و چراغ ہو۔خاندان کی عزت کا بھی خیال رکھو۔تمہارے والد سنیں گے تو خفا ہوں گے''۔

''ماں! یہ سب پرانی باتیں ہیں، آج کے دور میں جب تک آدمی کے بازوؤں میں دم ہے تب تک دنیا اس کے ساتھ چلتی ہے، خیر چھوڑو، اس وقت پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں، کچھ کھانے کو دو، مجھے ضروری کام سے نکلنا ہے''۔

کھانا کھا کر وہ چاگر نامی پہاڑ کی جانب چل پڑا۔ یہ پہاڑ ایک طرح سے اس کا

دوست تھا، بچپن کا دوست، جس نے اس کے بچپن کی معصوم دوڑ، ایک ایسی دوڑ جس میں جنون ہوتا ہے کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ جو جوانی کی دوڑ ایک ایسی دوڑ جس میں جذبۂ شوق ہوتا ہے، منزل تک پہنچنے کا شوق، اس کو پا لینے کی خواہش۔ وہ اس دوڑ میں عبدالجبار کا شریک تھا۔

جا کر پہاڑ پر پہنچنے کے بعد اس نے پکارا...... ''گلابو!''۔

گلابو کے چہرے پر انتظار کی شکن تھی۔

''یہ کیا ہم دوڑتے ہوئے آئے اور تم منہ پھیر کر کھڑی ہو گئیں، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے روٹھ کر چلی گئیں تو میرا کیا ہوگا۔ میرے لیے تو یہ کائنات بیکار ہو جائے گی، میرے لیے سب کچھ ختم ہو جائے گا''۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا''، گلابو کی آواز پر اعتماد تھی جس میں ہلکا سا خوف موجود ہوتا ہے۔

''بہت انتظار کرایا''۔

''کھیت میں کام کر رہا تھا کہ تمہاری یاد میں کھو گیا، اس لیے تھوڑی دیر ہو گئی، معاف کر دو''۔

''معاف کیا'' گلابو کے حسین چہرے پر دلفریب تبسم پھیل گیا جس میں عبدالجبار ڈوب گیا۔

''گلابو! تم بہت خوبصورت ہو''۔

''اچھا......آ......آ......''

گلابو کی اس دلبرانہ ادا نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اس نے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا...... ''گلابو! تمہارے لیے میں ایسا گھر بناؤں گا جس کے ہر کمرے میں ریشمی قالین بچھے ہوں گے۔ وہ گھر دنیا بھر کے نادر و نایاب چیزوں سے سجاؤں گا۔ جو بھی ہمارے گھر آئے گا وہ حیران رہ جائے گا''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''مجھے تمہارے سونے چاندی سے بنے ہوئے گھر میں جگہ نہیں چاہیے، تمہارے دل میں جگہ چاہیے۔تم میرے پاس رہو، میں تمہارے پاس رہوں، بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میں روکھی سوکھی کھا کر بھی تمہارے ساتھ زندگی گزار دوں گی۔ میرے جبار! یہ دنیا بہت بری ہے، روپیہ کمانے کے لیے کوئی غلط راہ مت اپنانا، وہ اپنا پڑوسی صمد خان ہے نا......''

''ہاں کیا ہوا اس کو؟''

''اس کا ایک جوان بیٹا یوسف ہے''۔

''یوسف''۔

''ہاں! وہ مجھے عجیب نظروں سے گھورتا ہے''۔

''وہ دیکھو کوئی ہماری طرف آرہا ہے''۔

''چل بھاگ یہاں سے''۔

وہ دونوں پہاڑ کی جھاڑیوں کی اور جانے لگے کہ یوسف کی خوفناک آواز نے فضا پر لرزہ طاری کر دیا۔

''سؤر کی اولاد! بھاگ کے کہاں جائے گا؟''

خون پر اگر طنز کیا جائے تو نحیف اور کمزور بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جبار غصے میں اس آواز کی جانب لپکا۔

''جانے دو جبار، یوسف کمینہ ہے، اس کے ساتھ جھگڑا مت مول لو، تم اس کو نہیں جانتے''، گلابو گھبرا اُٹھی۔

''گلابو! تمہارا مطلب ہے کہ گالی سننے کے بعد بھی میں بزدلوں کی طرح بھاگ جاؤں، نہیں گلابو! میں بزدل نہیں''۔

جبار جھاڑیوں سے باہر آیا۔ یوسف بھی اس کے نزدیک آ گیا تھا۔ جبار چیخ پڑا

وحشی سعید نمبر

''زبان کو لگام دو ورنہ......''

یوسف کی آنکھیں غصے کی شدت سے سرخ ہو گئی تھیں۔

''کمینے گاؤں کی لڑکی کو ورغلاتا ہے۔ کیوں نہیں، تیری رگوں میں نیچ کا خون جو ٹھہرا''۔

جبار کا خون کھول اٹھا۔ اس کا ہاتھ فضا میں اٹھا اور بجلی بن کر یوسف پر پڑا۔ دونوں آپس میں الجھ گئے۔ جبار لمبا چوڑا صحت مند آدمی تھا لیکن یوسف بھی گاؤں کی کشتی ٹیم کا کھلاڑی تھا۔ وہ ہنر یہاں کام آیا۔ اچانک جبار کو محسوس ہوا کہ آسمان گھوم رہا ہے۔ اس کا سر ایک پتھر سے ٹکرا کر لہولہان ہو گیا۔ خون آلود چہرا دیکھ کر گلابو چیخ پڑی ''جبار''۔

''خاموش لڑکی! اس کمینے کو میں پنچایت لے جاؤں گا، وہاں اس کا فیصلہ ہوگا۔ اس کو اور اس کے باپ کو ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑنا پڑے گا''۔

گلابو نے خود پر قابو پایا، وہ جانتی تھی کہ پنچایت کا سامنا اس کے لیے بھی مناسب نہیں ہوگا...... ''نہیں یوسف تم ایسا نہیں کرو گے''۔

''چل میرے ساتھ''۔

گلابو نے زخمی جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیسے جا سکتی ہوں، جبار بیہوش پڑا ہے، میں کیسے اس کو اکیلا چھوڑ دوں''۔

''اچھا تو پھر میں پنچایت کو یہیں بلاتا ہوں اور سوٴر کے کارنامے کو دکھاتا ہوں''۔

یہ ترکیب کام کر گئی۔ گلابو کو مجبوراً جبار کو وہیں اسی حالت میں چھوڑنا پڑا۔ یوسف نے اس کے گھر پہنچتے ہی قہر برپا کر دیا

''جناب آپ یہاں خدا کی عبادت میں محو ہیں اور آپ کی بیٹی آپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس لفنگے جبار کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے، اس لڑکی پر لگام کسئے''۔

اسی درمیان گلابو کی ماں بھی آ گئی ''کیا بات ہے بیٹا؟''

یوسف نے قصہ بیان کیا۔لیکن اس میں سچ سے زیادہ جھوٹ شامل تھا۔شاید اس لیے کہ کچھ دن پہلے ہی گلابو سے اس کے رشتے کی بات چلی تھی۔کچھ دنوں سے وہ غور کر رہا تھا کہ ایک مخصوص وقت گلابو گھر سے غائب ہو جاتی تھی۔آج اس نے گلابو کا تعاقب کیا اور اصل بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

گلابو کا والد اس کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''بیٹا ممکن ہے کہ آج کی میری یہ عزت کل کو تمہاری عزت بن جائے،اس لیے......

یوسف نے اس کی بات بیچ سے کاٹ دی

''اسی لیے تو اب تک خاموش ہوں،لیکن اب اس کا علاج بہت جلد ہونا چاہیے''۔

''لیکن وہ علاج ہے کیا؟''

''آپ گلابو اور میری شادی بہت جلد کر دیجیے''۔

''بیٹا یہ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی،لیکن تمہارے والد...... وہ اتنی جلدی شادی کو مان جائیں گے؟''

''یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں،آپ شادی کی تیاری کیجیے''۔

یہ کہہ کر یوسف نے ان سے اجازت لی،اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جس میں انتقام کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔

جبار کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے سر کو خون سے لت پت پایا۔اس کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے جسم میں طاقت ہی نہ رہی۔کسی طرح وہ حکیم کے پاس پہنچا۔حکیم نے مرہم پٹی کی اور ہدایت دی کہ کم از کم دو دن مکمل آرام کرے،جیسے تیسے وہ گھر پہنچا۔ماں دوڑتی ہوئی آئی،بیٹے کا حال دیکھ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''بیٹا!یہ کیا؟''

جبار نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کچھ نہیں امی، معمولی چوٹ ہے۔

''لیکن یہ چوٹ آئی کیسے؟''

''امی اندھیرے میں گر پڑا اور سر پتھر سے ٹکرا گیا''۔

''سچ بول رہا ہے''۔

''اور نہیں تو کیا''۔

''اچھا آرام کرو، میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں''۔

امی کھانا لانے چلی گئیں، جبار کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات پھرنے لگے، وہ چیخ پڑا ''یوسف میں تمہیں قتل کر دوں گا''۔ لیکن وہاں اس کی چیخ سننے والا کوئی نہ تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہیں صحت یاب کیا۔ دو دن بعد آج تم نے آنکھیں کھولیں'' والد نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔

تیسرے دن وہ کافی اچھا ہو گیا تھا۔ اس کا دل گلابو سے ملنے کو بیتاب تھا۔

تین دن...... نہ جانے گلابو کا کیا حال ہوگا؟

''امی! میں کھیت پر جا رہا ہوں''۔

''بیٹا حکیم صاحب نے ابھی تمہیں زیادہ چلنے پھرنے کو منع کیا ہے''۔

''بس امی کھیت تک جاؤں گا اور دس منٹ میں واپس آجاؤں گا''۔

وہ کھیتوں سے ہوتا ہوا چاگر پہاڑ پر جا پہنچا، کافی دیر بیت گئی لیکن......

''گلابو ابھی تک کیوں نہیں آئی''۔

دور سے شہنائی کی مدھر آواز آرہی تھی، کسی کی بارات اس جانب آرہی تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ خوشی کا یہ قافلہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ دولہا سفید گھوڑے پر سوار تھا۔

''یہ تو یوسف ہے''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

دوسرا سوال اس کے دماغ میں آیا ''کس کے ساتھ اس کی شادی ہو رہی ہے؟'' یہ جاننے کے لیے وہ ایک باراتی کے پاس پہنچا۔

''گلابو کے ساتھ''۔

شہنائیوں کے مدھر راگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے، گلابو چلی گئی، وہ تھکے قدموں سے گھر واپس لوٹا۔

''کیا ہوا بیٹا، تمہارا چہرہ پیلا کیوں پڑا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں امی، شاید تھکاوٹ کے سبب''۔

''اچھا، ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے، شہر کے ایک بڑے خاندان سے تمہارے رشتے کی بات آئی ہے''۔

''ٹھیک ہے امی، جیسی آپ لوگوں کی مرضی''۔

وقت نے کب کس کو مہلت دی ہے، ہمیشہ اپنی چال چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زندگی کے مصنوعی رنگ جو کہ نئے نئے چمکدار اور دلفریب معلوم ہوتے ہیں، دھیرے دھیرے پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔

آج جبار دولہا بنا ہوا تھا اور اپنی دلہن کو لے کر آرہا تھا۔ حجلۂ عروسی میں اس کے جذبات بے قابو ہو گئے۔

''نسرین''

دلہن خاموش رہی۔

اس نے دلہن کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''کچھ بولو، اب تو ہمیں اکٹھے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کا سفر طے کرنا ہے''۔

نسرین نے پہلی بار زبان کھولی، وہ شہر کی لڑکی تھی اس لیے شہر کی فضا اس کے دماغ

میں رچی بسی تھی۔

''گاؤں میں بڑی پریشانی ہوتی ہے، بجلی کا نظام بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ دیکھئے کتنا چھوٹا کمرہ ہے، کتنی گرمی ہے، بجلی بھی نہیں ہے جو پنکھا چلے۔ گرمیوں میں تو پنکھے اور کولر تک بیکار ہو جاتے ہیں اور صرف .A.C سے راحت ملتی ہے۔ آپ کل ہی مرے ساتھ شہر چلئے، وہاں کی چھل پہل میں مردہ آدمی بھی زندہ ہو جاتا ہے''۔

جبار کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں، لیکن اس نے ضبط کیا۔

''میری پیاری دلہن آؤ ابھی سب کچھ بھول کر ایک دوسرے میں سما جائیں''۔

''لیکن میں کیسے اس بند ماحول کو بھول جاؤں، ایسے......''

''جبار نے اس کی باتوں کے پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے لبوں پر لب رکھ دیئے جس سے اس کی احتجاج بھری آواز دب گئی۔

نئ زندگی کی نئ باتوں کے درمیان نسرین نے اپنے شہری جذبات کو قابو میں رکھا۔ لیکن کچھ دن بیتنے کے بعد اس نے بغاوت شروع کر دی۔ اس کا گھر سر پر اٹھا لینا گھر والوں کے لیے روزمرہ کا معمول بن گیا۔ اس کا برا اثر روزی پر بھی ہوا۔ جلد ہی ان کو مفلسی نے آ گھیرا۔ گاؤں کی زندگی اور دن بہ دن بڑھتی ہوئی مفلسی سے تنگ آ کر آخر ایک دن نسرین نے اعلان کر دیا

''اس گھر میں میری زندگی اجیرن بن گئی، میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی، مر جاؤں گی، کہاں وہ شہروں کی رونق، کہاں کلبوں کی چمکتی ہوئی روشنیاں اور ہنگامہ بھری ہوئی زندگی، کہاں وہ کاروں میں بیٹھ کر ایک دنیا گھوم آنا اور یہاں ......نہ بجلی، نہ کار، بس دیواروں کو تکتے رہنا''۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں......تم شہر چلو میرے ساتھ''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''یہ ناممکن ہے''۔

''تو پھر...... تو پھر میرے لیے گھر میں ایک جنریٹر، انورٹر، .L.E.D، ڈش کیبل اور ایک کار چاہیے تا کہ میں گاؤں سے باہر بھی گھوم پھر کر آسکوں''۔

''اتنے روپئے کہاں سے آئیں گے، تم تو جانتی ہو اب ہمارے پہلے سے دن نہیں رہے، اب ہم ایک معمولی کسان ہیں''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں اتنا روپیہ کمانے کی قوت نہیں ہے''۔

''قوت......'' جبار چلا اٹھا۔

''تم میری قوت دیکھنا چاہتی ہو، میں تمہارے سامنے دولت کا انبار لگا سکتا ہوں''۔

نسرین نے سکون سے کہا'' کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے''۔

''ٹھیک ہے جب تک میں اتنی دولت نہ کما لوں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا''۔

یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ جب غصہ کم ہوا تو اس کو یہ حقیقت سمجھ میں آ گئی کہ وہ زندگی بھر بھی ہل چلاتا رہے گا تو بھی اتنی رقم نہ بچا سکے گا۔ ان سب چیزوں کے لیے کم از کم ۷-۶/لاکھ روپیوں کی ضرورت ہے۔

۷-۶/لاکھ۔

وہ اپنے آپ میں بڑبڑاتا رہا، ایک جواری نے اس کے دماغ کو منتشر کیا۔

''۷-۶/لاکھ کیا ہیں یہاں ہزار روپئے لگانے پر اگر قسمت ساتھ دے تو آدمی کروڑ پتی بن جاتا ہے ورنہ ہزار روپیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے''۔

''چلو ہم بھی قسمت آزماتے ہیں''۔

واقعی آج جبار کی قسمت زوروں پر تھی، ایک ہزار کے چالیس ہزار ہو گئے۔ اس کیفیت نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ پھر یادوں میں کھو گیا۔

''کہاں کھو گئے''۔

وحشی سعید نمبر

مونچھوں والے آدمی نے اسے ہلایا۔

''ہاں کھو گیا تھا''۔

''لیکن تاش کے پتوں میں اس طرح نہیں کھو جاتے۔تم تاش بہت اچھا کھیلتے ہو۔ اگر تم میرے ساتھ آ جاؤ تو......''

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''چاہتا تو بہت کچھ ہوں، لیکن پہلے تم اپنا نام بتاؤ''۔

''میرا نام جبار ہے''۔

''میں سلیمان ہوں۔اب بتاؤ تم اتنے سنجیدہ کیوں لگ رہے ہو؟''

''چھوڑ و یار تم مجھے دیوانہ سمجھو گے۔تم تو کیا دنیا میں کوئی بھی میری بات سن کر مجھے دیوانہ سمجھے گا''۔

''جب دوست کہا ہے تو بتا دو یار، ہم بھی تو دیوانگی کے فلسفے کچھ کچھ ہی سہی مگر سمجھتے ضرور ہیں''۔

جبار اس کی بات سے متاثر ہوا اور اپنی زندگی کی شادی والے پہلو کو کھول دیا۔

''اب بتاؤ میں ۷-۶/لاکھ روپئے کس طرح اکٹھا کروں گا''۔

''میرے دوست بازوؤں میں اتنی طاقت بھلے نہ ہو لیکن دماغ میں ضرور اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ناممکن کو ممکن بنا سکے''۔

''کیا کوئی ایسی ترکیب ہے''۔

''ہاں لیکن اس کے لیے ہمت اور حوصلہ چاہیے''۔

''تم ہمت کی بات کر رہے ہو''۔ جبار نے اپنے لمبے چوڑے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا......''بازوؤں سے کچھ نہیں ہوتا، ہاتھی کتنا طاقتور ہوتا ہے لیکن خالی الذہن ہونے کے سبب اس کی طاقت بے سود ہے''۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے''۔

''میں جلد ہی تم سے ملوں گا اور پھر بتاؤں گا، آج رات چاگر پہاڑ پر ملنا کیسا رہے گا؟''۔

''میں انتظار کروں گا''۔

جبار خوش خوش واپس اپنے کھیت کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا کبھی ہمارا کھیت بھی سونا پیدا کرے گا؟''

اس کا بوڑھا ملازم کسی دوسرے سے بات کر رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے کاکا؟''

''بیٹا احمد کہتا ہے کہ آج کل گاؤں میں پولیس گھوم رہی ہے''۔

''کیوں؟''

''شاید ہمارے گاؤں میں جوئے کا کھیل شہر سے بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔ کچھ شہر کے لوگ بھی ہمارے گاؤں کی جانب برابر آتے دیکھے گئے ہیں'' احمد نے جبار کی بات کا جواب دیا۔

''کاکا گھر پر کہہ دینا کہ مجھے کچھ کام ہے، اس لیے میں دیر سے گھر آؤں گا''۔

وہ چاگر پہاڑ کی جانب روانہ ہوا۔ وہ پہاڑ جس نے اس کی خوشیوں کے نظارے دیکھے تھے اور اس کی بربادی کا گواہ تھا۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑکنے لگا جیسے وہ چوری کرنے جا رہا ہو۔ پھر اس نے خود کو تسلی دی۔

''میں تو کاروبار کرنے جا رہا ہوں''۔

وہاں دو سائے پہلے سے موجود تھے، ان میں ایک سلیمان تھا۔

''آ گئے تم''۔

''ہاں''۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ اکرام ہے، بہت بڑا غنڈہ''۔

''غنڈہ''

جبار کا دل لرز اٹھا، لیکن سلیمان نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔

''اکرام بھی ہماری مہم میں شریک ہوگا''۔

''کس مہم میں؟''

''وہ مہم جو تمہیں ۷-۶ /لاکھ روپئے سے بھی زیادہ روپئے دلائے گی''۔

''لیکن کس طریقے سے......؟''

اکرام پہلی بار بول پڑا۔ اس کی آواز قدرے خوفناک تھی۔

''استاد! اسے شریک مت کیجیے، یہ کام بگاڑ دے گا''۔

''تم خاموش رہو، دیکھو پیارے جبار! اتنے روپئے چٹکی بجانے سے حاصل نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ایسا نسخہ ضرور ہے جس سے تم چٹکی بجا کر حاصل کر سکتے ہو، وہ نسخہ ہے تحصیل کا خزانہ۔ اس خزانے میں روپیوں کا انبار پڑا ہوا ہے، اب......''۔

''یہ تو چوری ہوئی''۔

اکرام یہ بات نہ سہہ سکا اور ایک بھرپور گھونسا جبار کے پیٹ پر مارا۔ وہ ابھی اس کے گھونسے کا درد سہہ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک گرجدار آواز فضا میں گونجی

''ہینڈز اپ۔ مشورے بہت ہو چکے، پولیس نے تم تینوں کو گھیر لیا ہے، اگر کسی نے بھاگنے کی جرأت کی تو اس کو گولی ماردی جائے گی''۔

''لیکن......میں چور نہیں ہوں''۔

تھانے دار نے منہ پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ''بدمعاش! تھانے دار یوسف سے

جھوٹ بول رہا ہے''۔

''یوسف'' جس نے اس کی دنیا لوٹ لی تھی، جو اس بات پر تلا ہوا تھا کہ اس کو برباد کر کے ہی دم لے گا۔

یوسف نے ایسا ہی کیا، اس نے سلیمان اور اکرام سے کہلوایا کہ خزانہ لوٹنے کا منصوبہ اس کا تھا۔ حالات کچھ ایسے بنے کہ اس کی ماں بھی اسے چور سمجھنے لگی۔

''بیٹے مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی''۔

جبار لاکھ دہائی دیتا رہا لیکن ہوا وہی جو یوسف چاہتا تھا۔ چار دن کی طویل بحث کے بعد جج نے فیصلہ سنایا...... ''دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ملزم جبار شیخ ولد اصغر شیخ نے شہر کے دو نامی غنڈوں کے ساتھ مل کر ناگر تحصیل کا خزانہ لوٹنے کی ناکام کوشش کی۔ ملزم جبار شیخ کو اس سنگین جرم کے لیے چھ ماہ قید سخت کی سزا دی جاتی ہے''۔

تین ماہ کے بعد اس کا بوڑھا ملازم اس کو جیل میں ملنے آیا۔

''کاکا کیسے آئے؟''

بیٹے میں تمہاری خیر و عافیت پوچھنے آیا ہوں، ''کیسے ہو؟''

''زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں، معلوم نہیں کل کیا ہوگا، تم سناؤ گاؤں میں کیا ہو رہا ہے؟''

''بیٹا...... ناگر گاؤں میں پہلی بار ایک طلاق ہوئی ہے''۔

جبار حیران رہ گیا۔

''یہ کون بد نصیب لڑکی ہے؟''

''گلابو''۔

''گلابو''۔

''ہاں بیٹا! لیکن گلابو ایک حساس لڑکی تھی، وہ ذلت کی زندگی برداشت نہیں کر سکی

اور اس دنیا سے چلی گئی"۔

"کاکا......"

اس کے بعد اس کی زندگی میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو سمندر میں طوفان کے پہلے آتی ہے۔

ہوسکتا ہے یہ خاموشی تہذیب یافتہ لوگوں کی شرافت کی علامت ہو، لیکن اس کے اس نئے انداز نے جیلر کو ضرور متاثر کیا تھا، اس لیے اس کی ایک ماہ کی سزا کم کر دی گئی تھی۔ جیلر جبار سے کہہ رہا تھا

"جبار! اب تم آزاد ہو، اب ایک اچھے آدمی کی طرح زندگی بسر کرنا"۔

"جیلر صاحب! یوں تو مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہی، اب تو دن کاٹنے ہیں، کوشش کروں گا کہ اچھے آدمی کی طرح کاٹ سکوں"۔

"اپنا سب کچھ لے لیا"۔

"جی ہاں"۔

"کل ہی تمہارے نام ایک خط آیا ہے، یہ بھی لے لو"۔

"شکریہ"۔

وہ جیل سے باہر آزاد فضا میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ جیب میں تھا۔

"خط...... کس کا خط ہوگا؟"

یہ خط ایک سرکاری ملازم کا تھا اور اس عدالت کا لکھا ہوا تھا جس نے کبھی اس کو جیل کے پنجرے میں ڈال دیا تھا۔

"تم کو عدالت یہ اطلاع دیتی ہے کہ تمہاری بیوی نسرین ولد شیخ جمال نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمہارا چال چلن خراب ہے۔ اس بنیاد پر اس نے عدالت سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کو طلاق چاہیے۔ عدالت نے معقول شہادت پانے کے بعد محترمہ نسرین کی

طلاق کی درخواست منظور کر لی۔ اس لیے آج سے تمہارا کوئی بھی اور کسی بھی قسم کا رشتہ محترمہ نسرین کے ساتھ نہیں ہے''۔

جبار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چلو یہ قصہ بھی پاک ہوا''۔ اب اسے اپنے پیارے والدین کی یاد آئی۔ وہ گاؤں کی اور چل پڑا، لیکن اسے ماں کا جملہ یاد آیا۔

''مجھے تم کو اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم آتی ہے''۔

اس کے قدم رک گئے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ نئی زندگی شروع کرنے کا تھا۔

''لیکن کیسے؟ کہاں سے؟ کس طریقے سے؟''

اسی ادھیڑ بن میں وہ چلا جا رہا تھا۔ انجان راستے سے انجان منزل کی اور......

کافی دور چلنے پر اسے ایک بھکاری ملا۔ لیکن اس نے ہاتھ پھیلانے سے پہلے اس سے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''زندگی سے دور، خود سے دور''۔

''کہاں تک بھاگو گے؟''

اس سوال نے بھکاری کو فلسفی میں تبدیل کر دیا، وہ رُک گیا۔

''کیا کوئی راستہ ہے؟''

''ہاں راستہ بھی اور منزل بھی''۔

''کہاں؟''

''چلو میرے ساتھ''۔

''مکان والو...... کہاں ہو تم......؟ ایک پاگل بھکاری تم کو یاد کرتا ہے، ایک ایسا بھکاری جس کی سب کو ضرورت ہے''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی باہر آیا...... ''کیوں آج تو پھر آیا ہے؟''

''آیا ہوں''۔

''کل ہی تو تجھے ۵۰/روپئے دیئے تھے''۔

''لیے تھے اور اس کے بدلے کچھ دینے آیا ہوں''۔

''اس آدمی نے زندگی میں بہت چوٹیں کھائیں ہیں، بوڑھے نے جبار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، اسے اپنے پاس رکھ لو''، بوڑھے نے جبار کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خدمت میں ہی عظمت کا راز چھپا ہوا ہے''۔

وہ نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا، یہاں رنگین عشق کے کھوکھلے خواب نہیں تھے۔ ایک نصب العین تھا، یتیم خانے میں بے سہارا بچوں کی خدمت۔ یتیم خانے کے بچے بھی اس کو چاہنے لگے تھے۔

بوڑھے کے آخری دن قریب آ گئے تھے۔ اس لیے اس نے اپنی وصیت میں یتیم خانے کا سربراہ جبار کو بنا دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد بوڑھا اس جہانِ فانی سے چلا گیا۔

جبار یتیم خانے کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے لگا۔ ایک دن اس نے دفتر کے ایک کونے میں بندوق دیکھی۔

''یہ کس کی بندوق ہے؟''

''جی یہ بابا کی بندوق ہے، جو وہ شکار کے لیے استعمال کرتے تھے''۔

''ٹھیک ہے، اسے صاف کر کے وہیں رکھ دو''۔

ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ چپراسی نے آ کر کہا

''جناب ایک میاں بیوی آپ سے ملنے آئے ہیں، شاید وہ لوگ کسی بچے کو گود لینا چاہتے ہیں''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''ان کو اندر بھیج دو''۔

جب دونوں اندر آئے، جبار کے ہوش فاختہ ہوگئے...... ''نسرین اور یوسف''۔

''جناب یہ میری بیوی نسرین ہے، ہماری شادی کو پانچ سال ہوگئے لیکن اب تک اولاد کے لیے ترس رہے ہیں۔ اب ہم ایک بچے کو گود لینا چاہتے ہیں''۔

''پانچ سال، ایک لمبی مدت، دنیا تبدیل ہوگئی ہوگی !!!''۔

''ہماری اندھیری زندگی کو روشنی کا چراغ دے دیجیے''۔

''کس کے پاس آئے ہو تم لوگ؟ اس کے پاس جس کی جھولی میں تمہارے لیے انتقام کے سوا کچھ نہیں ہے''۔

اس کی آواز خوفناک تھی۔ یوسف کو چاگر پہاڑ کی وہ آواز یاد آئی جس کی وجہ سے اس نے گلابو سے شادی کی تھی اور پھر اپنا انتقام لینے کے بعد اس کی زندگی تباہ کر کے طلاق دے دیا تھا۔

''جبار''۔

اسی درمیان جبار نے بابا کی کونے میں رکھی ہوئی بندوق اٹھالی۔

یوسف گڑگڑانے لگا۔

''مجھے چھوڑ دو، مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا، پھانسی کا تختہ۔ میں تمہیں دولت سے مالا مال کردوں گا، میری جان بخش دو''۔

''میں اپنے اوپر ہوئے ظلم کو معاف کر سکتا ہوں، لیکن گلابو کے قاتل کو...... کبھی نہیں''۔

بندوق نے شعلہ اُگلا۔ یوسف کچھ دیر تڑپنے کے بعد لاش میں تبدیل ہوگیا۔

بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، اسے محسوس ہوا کہ برسوں بعد اس کی روح کو سکون مل رہا ہو۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''کہاں جارہے ہو؟''

یہ نسرین کی آواز تھی۔اس نے جبار کے ہاتھ سے گری ہوئی بندوق اٹھالی تھی۔

''اگر تم اپنا انتقام لے سکتے ہو تو کیا میں تم سے اپنے شوہر کی موت کا بدلہ نہیں لے سکتی؟''

''ضرور! لیکن یہ یاد کر کے کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ کس کی وجہ سے ہوں''۔

نسرین کو سارے واقعات یاد آنے لگے، پہلی بار اس کی روح نے اس کے موقع پرست اور مطلبی ذہن پر قابو پایا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

جبار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا...... ''جاؤ چراغ کو روشن کرو''۔

پولیس نے جبار کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ بھری عدالت میں جج نے اس کو وحشی مجرم قرار دیا۔اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔

یہ اس کی عجب زندگی کی آخری رات تھی، جس میں غضب ناک موت سے خوف کھانے کے ساتھ ساتھ اپنی بے مقصد زندگی سے چھٹکارا پانے کی مسرت میں جاگ رہا تھا...... ''سورج کب نکلے گا، یہ رات کب ختم ہوگی؟''

حولدار کی آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی...... ''سو جاؤ اب''۔

''وہ سو گیا۔ گلابو اپنی دونوں بانہیں پھیلائے ہوئے اس کے قریب آرہی تھی اور وہ اس کی بانہوں میں بانہیں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا''۔

''سورج نکل آیا''۔

لیکن وہ اس نئی صبح کو نہ دیکھ سکا، اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''عجب زندگی......غضب موت''۔



جائز......ناجائز



انقلاب ایک طوفان ہے اور اس طوفان کو برپا کرنے کے لیے ہمیشہ جرأت و جوش اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر غلام قوم انقلاب کے نعرے کو بلند کر کے سامراجیوں کے بندھنوں کو توڑ کر ایک آزاد فضا میں سانس لینے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ سرتن کی بازی لگا کر، رنگ نسل اور مذہب سے اوپر اٹھ کر کیونکہ آزادی ہر قوم، ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

انقلاب......زندہ باد!

انور جان کے نعرے کا جواب بہت زور شور سے دیا گیا۔ جلوس آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ پولس آ گئی اور لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ طالب علموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس بھاگ دوڑ میں انور خان ایک برقعہ پوش خاتون سے ٹکرا گیا۔

''اندھے ہو گیا؟''

''آپ دیکھ رہی ہیں کہ......'' برقعہ پوش کے ساتھ جو دوسری عورت تھی، بول پڑی۔

''نواب صاحب تیز گھوڑے پر سوار ہیں''۔

''لیڈر جو ٹھہرے، تقریر اچھی کرتے ہیں''۔

''ذرہ نوازی کا شکریہ!''

''ذرہ نوازی......؟......خاک''

''آپ جیسے لوگ صرف بولنا جانتے ہیں''۔

انور خان مایوس گھر کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے والد کے انتقال کو دس سال ہو چکے تھے جو کہ فوج میں میجر تھے اور کسی مہم میں شہید ہو گئے تھے۔ اب صرف ماں تھی اور

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اچھی خاصی جائیداد۔

گھر کے دروازے پر شیر علی نے کہا...... ''آپ کی امی یاد کر رہی تھیں''۔

''اچھا''۔

''امی حضور! آپ نے مجھے یاد کیا''۔

امی کے سامنے سونے کے چند زیور تھے۔

''ہاں بیٹا! آپ اب تک کہاں تھے؟''

''وہ امی آج کالج کے طالب علموں کے جلسے میں تقریر تھی، اس لیے تھوڑی دیر ہو گئی''۔

''بیٹا مجھے بتاؤ کہ آپ یہ لیڈری کب چھوڑیں گے؟''

''جب ملک آزاد ہوگا''۔

بیٹا میں آپ کے گھر کو بسانے کی فکر میں ہوں، آپ کے لیے ایک خوبصورت لڑکی دیکھ لی گئی ہے اور اس کے ساتھ آپ کی سگائی ہو رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ جلد ہی آپ کا گھر بس جائے۔ نہ جانے میری آنکھیں کب بند ہو جائیں''۔

''ایسی باتیں نہ کریں امی، مجھے تکلیف ہوتی ہے''۔

''اچھا کل آپ کہیں نہیں جائیں گے، آپ کی سگائی ہے''۔

''امی، اس متعلق آپ نے مجھے......''

''بیٹا! لڑکی بہت خوبصورت ہے''۔

''ظاہری خوبصورتی سے کیا ہوتا ہے، سیرت اچھی ہونی چاہیے، دل حسین ہونا چاہیے''۔

''بیٹا! یہ سب کچھ اس میں ہے''۔

دوسرے دن بیس افراد پر مشتمل قافلہ مع لڑکی انور خان کے گھر وارد ہوا۔ سگائی کی

رسم ادا کی گئی۔ نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے ہوئی اور رسم پردہ کے لیے ہونے والے دولہا اور دلہن کے درمیان ایک باریک پردہ کیا گیا جس کے آر پار صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ انور کے سامنے ایک حسین لڑکی تھی جیسے جنت کی حور آسمان سے اتر آئی ہو۔ اس کے پاس کھڑی لڑکی کے منہ سے آواز نکلی...... ''لیڈر''۔

آواز نہایت دھیمی تھی لیکن انور کے کانوں تک پہنچ گئی۔

تو میری شادی اس لڑکی سے ہو رہی ہے جس نے شاید کچھ اس طرح کا جملہ کہا تھا کہ...... ''نواب ہوا کے گھوڑے پر......'' لیکن لیڈر کہنے والی لڑکی کی آواز نے اس کے خیال کو منتشر کر دیا۔

''دولہا بھائی کی نگاہیں کیوں جھکی ہوئی ہیں؟ او...... ہو...... خاندانی شرافت......''۔

کچھ دیر کے لیے رشتۂ ازدواج میں بندھنے والے جوڑے کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔

''رقیہ بانو! شاید آپ کو شکایت ہو کہ میں صرف بولتا ہوں، نعرہ بازی کرتا ہوں اور عمل کچھ نہیں کرتا، اس لیے......''۔

''میں اپنے اس سلوک پر شرمندہ ہوں، آپ کی اس تقریر نے بعد میں جو اثر دکھایا، اس کے بعد میرے دل میں تھا کہ کالج میں آپ سے مل کر معافی مانگوں گی۔ لیکن اس سے پہلے ہی یہ اتفاق ہوا کہ جو میرے خوابوں کا شہزادہ بن سکتا تھا اسے قدرت نے میرے شوہر کی شکل میں پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا۔ آپ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں اور میری حقیر محبت کو قبول فرما لیں۔

انور خان کا دل چاہا کہ اس کی اس پیاری ادا پر اس کو گلے لگا لے لیکن دوست و احباب ان کے نزدیک آ گئے۔ خوشی کے نغمے بجنے لگے۔

انور اور رقیہ کی شادی میں ابھی کچھ دن باقی تھے لیکن کالج میں دونوں کی نزدیکیاں بڑھ گئیں تھیں۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''رقیہ! آپ میری جان بن گئی ہیں۔ آپ کے ساتھ کے پہلے میری زندگی بنجر اور خشک تھی، آپ نے اسے سیراب کر دیا''۔

''میرے انور! آپ کو پا کر زندگی کی ہر مراد بر آئی، اب تو یہی دل کرتا ہے کہ آپ کی آغوش میں سمٹی رہوں''۔

رقیہ کی بات نے انور کو دیوانہ کر دیا، اسے خود پر اختیار نہ رہا۔ ایک طرف پیاسی آنکھیں اور پیاسے لب، دوسری طرف متوالی آنکھیں اور شیریں لب، لب سے لب جڑ گئے اور دونوں سرور کے عالم میں کھو گئے۔ یکا یک رقیہ کو کسی حس نے چونکا دیا۔

''نہیں، یہ گناہ ہے۔ ابھی تو مدت کی دیوار کھڑی ہے۔ جب وقت پر یہ دیوار گر جائے گی، ہم ایک ہو جائیں گے''۔

''وقت'' انور کے منھ سے سرد آہ نکلی، لیکن بدن کے شعلوں نے گناہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دونوں کو ایک کر دیا۔ وقت کی آندھی ایسی چلی کہ انقلابیوں نے قتل و غارت کو اپنا لیا۔ زندگی درہم برہم ہو گئی۔ اس کا اثر پورے ملک میں پھیل گیا۔ انور کہتا:

''موت زندگی میں ایک بار آتی ہے اور غلامانہ زندگی کی موت حیات میں ہی کتنی بار ہوتی ہے، اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ انقلاب ہی وہ راستہ ہے جس سے آنے والی نسلیں یہ کہہ سکیں گی کہ ہمارے غازیوں نے اپنا سر دے کر ہمارے لیے آزادی کی اعلیٰ نعمت حاصل کی۔

لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ خونی انقلاب میں شدت ضرور ہوتی ہے لیکن جذباتی حرارت میں مستقل دم نہیں رہتا کیونکہ اس میں اعتدال نہیں ہوتا۔ آخر کب تک لیڈر حکومت کے ہاتھ سے بچتا۔ آخر کار وہ پکڑا گیا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔

رقیہ کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے، وہ ملاقات کے لیے جیل گئی۔ ''میری محبت''۔

لمحے

وحشی سعید نمبر

''نہ رو میری جان''۔

''مجھ سے دور جاتے ہوئے آپ مجھے کس کے حوالے کیے جا رہے ہیں''۔

''خدا کے حوالے جو کہ عالم کا رکھوالا ہے''۔

''ملن کا خواب دیکھتے تھے''۔

''میری جان! شاید اب وہ خواب حقیقت نہ بن سکے''۔

''کیوں نہیں......'' وہ چیخ پڑی لیکن...... مایوس لوٹی۔

فوجی عدالت میں انقلابی لیڈر کو کھڑا کیا گیا لیکن انصاف...... سامراجیوں کی عدالت میں انصاف لفظ کو ناانصافی سمجھا جاتا ہے۔

انور خان نے کہا...... ''انصاف کی اس عدالت میں کھڑے ہو کر انصاف پانے کی امید رکھنے والا بیوقوف ہے۔ معززین جیوری جو کہ سامراجیوں کے پٹھو ہیں، وہ کیا انصاف کریں گے۔ ہر انسان کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق کے حصول کے لیے ہی انقلاب آیا، بغاوت ہوئی۔ میں باغی ہوں اور سامراجی حکومت کے خلاف ہوں''۔

جیوری نے فیصلہ سنایا...... ''انقلاب لا کر خون کی ندیاں بہانے والا، قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والا، قانون کی نگاہوں میں مجرم ہے، قاتل ہے۔ مجرم انور خان ولد احمد خان نے چونکہ اپنے جرم کا اعتراف خود کر لیا ہے لہٰذا ان کو سزائے موت دی جاتی ہے''۔

قوم نے جب یہ فیصلہ سنا تو ہنگامہ برپا کیا لیکن ان کو بھی دبا دیا گیا، انور نے تختۂ دار پر کہا...... ''انور کے ایک خون کے قطرے سے دس انور پیدا ہوں گے اور ایک ایک انور سامراجیوں کے لیے چٹان ثابت ہوگا۔ قوموں کی آوازیں دبائی نہیں جا سکتیں۔ وہ طوفان بن کر سامراجیوں کے منصوبوں کو چکنا چور کر دیتی ہیں''۔

انور تو ہمیشہ کے لیے چلا گیا لیکن رقیہ کی زندگی کو الجھن میں ڈال گیا۔ رقیہ کے والد نے کہا...... ''ذلت کے اس ٹیکے سے بہتر تھا کہ تو مر جاتی۔ انور لوگوں کے دلوں میں

مقام بنا گیا کیونکہ لوگ اس کی کالی کرتوت سے بے خبر رہے"۔

حمل کو گرانے کی کوشش رائیگاں ہوئی۔ اب آنے والے کو چھپانے کی کوشش میں گھر کے لوگ مصروف ہو گئے۔



اس رات ہر طرف اندھیرا تھا۔ بادل گرج رہے تھے، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی۔ دو فرد ایک سودے کے لیے آمنے سامنے تھے۔

ایک بڑا امیر...... ایک بڑا غریب، سیٹھ نے کہا......

"پچاس لاکھ روپئے...... تمہاری تقدیر"۔

پچاس لاکھ...... ہاں یہ دولت میری ہے۔ سیٹھ جس بچے کو تم اپنی بیٹی کے ماتھے کا بدنما داغ سمجھ کر میری جھولی میں ڈال رہے ہو، یہی شیر خوار میرے لیے نئے مستقبل کا پیغام لایا ہے۔ دولت سب کچھ ہے، دنیا میں دھن کے بغیر آدمی کا سماج میں کوئی مقام نہیں۔

"اب لے جاؤ بچے کو اور سمیٹ لو اس دولت کو، دوبارہ اس شہر میں نظر نہ آنا"۔

دونوں جیت گئے۔ سیٹھ نے اپنی کنواری بیٹی کے کنوارے پن کی مہر برقرار رکھی اور غریب نے اپنی جھولی میں دونوں دولتیں سمیٹ لیں۔ سیٹھ اپنی کنواری بیٹی کے لیے کسی راجہ لڑکے کے بارے میں سوچنے لگا تو غریب اس پیسے کے بل بوتے پر نئی زندگی کے منصوبے بنانے لگا۔

وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہوا، میلی کچیلی قمیض میں دولت کا انبار لیے اس نے اپنی بیوی سے کہا...... "تیار ہو جاؤ، ہم شہر چھوڑ کے جا رہے ہیں"۔

"کہاں؟"

''یہاں سے دور''۔

''مگر کیوں؟ اور یہ بچہ......؟''

''میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں جس کی تکمیل ممکن ہے اور یہ بچہ حرام کا ہے اور آج سے ہمارے ساتھ رہے گا۔ بشیر کہاں گیا؟''

''باہر کھیل رہا ہوگا''۔

''تم تیار ہو جاؤ، میں اس کو لاتا ہوں''۔

سامان سمیٹ لیا گیا۔ قافلہ روانہ ہو گیا۔

کل تک جو سیٹھ کے پاس نوکر تھا، آج اس قصبے کے چھوٹے امیروں میں گنا جاتا تھا۔ جمال نے پچاس لاکھ سے کروڑ بنائے اور کروڑ سے دس کروڑ۔ یہ ان سب کامیابیوں کا باعث وہی بچہ تھا جو سماج کے نام پر داغ تھا۔ جمال اکثر اپنی بیوی رقیہ سے کہتا...... ''یہ بچہ بڑا قسمت والا ہے''۔

''ہو سکتا ہے''۔ رقیہ کا جواب ہمیشہ الٹا سیدھا ہوتا۔ وہ سوچتی کہ جو حرامی ہے وہ کیسے قسمت والا ہو سکتا ہے۔ وہ اسے برداشت کرنے کو مجبور تھی کیونکہ اس کے شوہر کو لگتا تھا کہ اس بچے کے سبب اس کی قسمت چمکی ہے۔ اس لیے وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کے لیے نئے نئے خواب دیکھ رہا تھا۔ بچہ ابھی اسکول جا رہا ہے، پھر کالج، پھر یونیورسٹی اور آگے......اور آگے وہ کہاں تک ترقی کرے گا، یہ آنے والا وقت بتائیگا۔



جمال اب جمال نہ رہا، بلکہ سیٹھ ناصر جمال بن گیا تھا۔ تین بنگلوں اور دو بڑے بڑے کارخانوں کا مالک۔

''بشیر کہاں ہے؟''

وحشی سعید نمبر

''جناب سو رہے ہیں''۔

''اب تک''۔

جمال اپنے بیٹے بشیر کے کمرے میں داخل ہوا...... ''برخوردار!''

''او......ابا جان! آپ......'' بشیر نے نیند بھری آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

''تم اب تک سو رہے ہو''۔

''جی......اب تو اٹھ گیا ہوں''۔

''تمہیں یاد ہے آج تمہارا چھوٹا بھائی فوج سے ڈیڑھ سال کے بعد آنے والا ہے''۔

''جی یاد ہے''۔

''جہاز کس وقت آنے والا ہے؟''

''جی......دس بجے''۔

''اور ابھی کیا بجا ہے''۔

''ساڑھے نو......اوہو، بس آدھا گھنٹہ، میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں''۔

یہ کہتے ہی وہ غسل خانے کی اور بھاگا۔ جمال نے اپنی بیوی سے کہا......

''آج افضل آنے والا ہے''۔

''اونھ......میں جانتی ہوں، آپ سانپ کو دودھ پلا رہے ہیں جو کسی وقت آپ کو ڈس لے گا''۔

جمال کو غصہ آ گیا۔

''رقیہ اپنی اصلیت مت بھولو۔ آج ہم جس مقام پر ہیں وہ اسی بچے کی برکت ہے''۔

''یوں کہیے کہ ایک سیٹھ کی بیٹی کے داغ کو چھپانے کے لیے ہم کو پچاس لاکھ

روپئے رشوت میں ملے۔ افضل کی رگوں میں گندہ خون دوڑتا ہے اور وہ ایک دن......''

''خاموش ہو جاؤ، کوئی سنتا ہوگا''۔

''جس کو سننا تھا، اس نے سن لیا'' بشیر خود سے بول پڑا۔

''تو وہ میرا بھائی نہیں ہے''۔

اس راز سے واقف ہوتے ہی اس کے دماغ میں نئے خیالات آنے لگے اور اس کی کار ہوائی اڈے کے سامنے رک گئی۔

ہوائی جہاز لینڈ ہو چکا تھا۔ افضل نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا، دونوں گلے ملے۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے''۔

''ہاں''۔

''بشیر تمہارا چہرا کیوں اترا ہوا ہے؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں''، بشیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھائی آپ نے فوج میں اچھی صحت بنالی''۔

''یار میری اور آپ کی عمر میں فرق ہی کتنا ہے، ہمیں بھائی سے زیادہ دوست ہونا چاہیے''۔

''ہاں دوست''، بشیر سوچنے لگا۔ اب تمہیں کون اپنا بھائی سمجھے گا۔ نہ جانے یہ کس خاندان کا ہے۔ میرا باپ شہر کا مانا ہوا رئیس ہے لیکن کبھی وہ اس عورت کے پاس ملازم تھا جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا، لیکن حرام کی اولاد......

بنگلے کے سامنے کار رک گئی۔ جمال باہر کھڑا تھا۔ افضل دوڑتے ہوئے جمال کے گلے لگ گیا۔

''افضل، میرے بچے آنکھیں ترس گئی تھیں تجھے دیکھنے کے لیے''۔

رقیہ باہر آئی، جمال نے آنکھیں دکھائیں۔

''تمہاری امی''۔

وہ رقیہ سے لپٹ گیا۔''امی آپ کچھ ناراض......''۔

''نہیں بیٹا! تم سے کیا ناراضگی، ناراض تو میں تمہارے ابا سے ہوں''۔

''کیوں؟''

''ارے میں نے صبح سے رٹ لگا رکھی ہے کہ بیٹے کو لینے خود جاؤ لیکن ٹس سے مس نہیں ہوئے، بس چائے پر چائے پیتے جا رہے ہیں۔ چلو اندر چلیں''۔

اسی دوران باہر ایک کار آکر رکی۔

''ارے رحمت اللہ بھائی'' جمال نے کہا...... ''سب خیریت تو ہے''۔

''جی ہاں! بالکل ٹھیک۔ آپ کے لیے دعوت نامہ ہے مع اہل وعیال۔ میری بیٹی رخسانہ کی سالگرہ میں شرکت فرمائیں''۔

''میرا آنا تو شاید نہ ہو سکے لیکن میرے بیٹے ضرور شرکت کریں گے''۔

''آپ لوگ بھی ہوتے تو...... بہر حال''۔

شام کو بشیر افضل کے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیوں دوست دعوت میں نہیں چلنا''۔

''ابا جان کا حکم میں نہیں ٹال سکتا''۔

''تو پھر جلدی تیار ہو جائیں، میں کار نکالتا ہوں''۔

''کیا سوچ رہے ہو بشیر؟''

''زندگی کے پہلوؤں پر غور کر رہا ہوں، عجیب خیال آ رہا ہے''۔

''جیسے؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ جس آدمی کی رگوں میں گندہ خون دوڑتا ہو، جو ناجائز طریقے سے دنیا میں آیا ہو، وہ سماج کے لیے کیسا ثابت ہوگا''۔

''میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کی نیت اچھی ہو، دماغ سلجھا ہوا ہو، وہ سماج کے لیے بہتر فرد ثابت ہوگا۔ چاہے وہ ناجائز طریقے سے ہی دنیا میں کیوں نہ لایا گیا ہو''۔

''وقت ہی اس بات کو ثابت کر سکتا ہے''۔

کار رک گئی۔

''آ گئے، آپ لوگ''۔

''جی! آپ کی خدمت میں حاضر ہیں''۔

''میری بیٹی رخسانہ سے ملئے، بیٹی ان سے ملو جمال ناصر کے بڑے بیٹے بشیر ناصر اور چھوٹے کیپٹن افضل ہیں''۔

''آداب'' رخسانہ حسن کا انگارہ تھی۔ نہایت خوبصورت، سڈول جسم کے انگ انگ سے جوانی رس ٹپکا رہی تھی۔ کیپٹن افضل اس حسین شاہکار کے خواب میں ڈوب گیا جہاں سے رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک نئی منزل کی اور جا رہا تھا۔

لیکن رخسانہ نے اپنی منزل بشیر کی آنکھوں میں پائی اور بشیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت مدت ہوئی، جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی''۔

''تصور میں تو آپ ہمارے ہر وقت رہتے ہیں''۔

اور پھر سالگرہ میں کچھ ایسے اشارے اور وعدے ارادے ہوئے کہ افضل سمجھ گیا کہ بشیر بھی رخسانہ کی جانب مائل ہے لیکن وہ رخسانہ کی نظروں کو نہ پڑھ سکا۔

''شاید رخسانہ بھی بشیر سے محبت کرتی ہو، لیکن اس کا رجحان تو میری طرف بھی ہے کیوں نہ رخسانہ سے بات کر کے دیکھوں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا''۔

''وہ تمہارا چھوٹا بھائی افضل مجھ سے محبت کرتا ہے، کہہ رہا تھا کہ گھنٹوں وہ میری تصویر میں کھویا رہتا ہے''۔

''اس کی یہ مجال''۔

''مجال...... وہ تمہارا بھائی ہے لیکن شاید اس کو معلوم نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں''۔

''نہیں اسے معلوم ہوگا، خون کی گندگی آخر کب تک چھپی رہتی''۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے، کسی کی ناجائز اولاد ہے جسے میرے باپ رحم کھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے''۔

رخسانہ نے اس کے لب پر اپنے لب رکھ دیئے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس کے پہلو میں سمٹ گئی۔

حقیقت کب تک چھپتی ہے۔ بشیر نے غصے میں آکر اپنی اور رخسانہ کی محبت کی کہانی اور اس میں افضل کی دخل اندازی کی کہانی اپنی ماں رقیہ کو سنائی۔ رقیہ نے بھی گندے خون کو برا بھلا کہا اور اپنے بیٹے بشیر اور رخسانہ کی شادی کا وعدہ کیا۔ افضل کو جب اپنے ناجائز ہونے کا علم ہوا تو جذباتی طور پر اس کے دل میں آیا کہ خودکشی کرلے لیکن تھا وہ فوجی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ساری حقیقت جانے بنا خودکشی بزدلی ہے اور وہ ناجائز تو ہو سکتا ہے لیکن بزدل کبھی نہیں۔

جمال کے دل میں خیال آیا کہ اس نے سب کے لیے کچھ نہ کچھ کیا لیکن اپنے محسن افضل جس کی بدولت آج وہ شہر کے رئیسوں میں گنا جاتا تھا، کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

''رقیہ میں چاہتا ہوں کہ رخسانہ اور افضل کی شادی کر دی جائے، تمہارا کیا خیال ہے''۔

''آخر اس گندے خون نے اپنا اثر دکھا ہی دیا۔ بشیر اور رخسانہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی اس نے رخسانہ کو ایسی نظر سے دیکھا، اور اب یہ

جان کر بھی کہ وہ ناجائز ہے، اس نے آپ کو ورغلایا ہے۔

''نہیں نہیں...... اس نے مجھے کچھ نہیں کہا...... تو کیا اسے معلوم ہو گیا...... اُف خدایا۔ اگر بشیر اور رخسانہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں افضل کے لیے دوسرا رشتہ ڈھونڈ لوں گا''۔

جمال سیٹھ رحمت اللہ کے پاس رخسانہ اور بشیر کا رشتہ پکا کرنے گیا۔

''اب تو رخسانہ بیٹی ہماری ہو گئی، تو کیوں نہ اس کے ساتھ ہی ایک اور رشتہ جوڑ لیا جائے''۔

''جی......؟''

''آپ کے بھائی نور اللہ کی بیٹی کا رشتہ افضل سے کیوں نہ ہو جائے''۔

''جمال صاحب آپ رشتے میں میرے سمدھی ہونے والے ہیں اور ایسے بچے کے لیے رشتہ جوڑ رہے ہیں جس کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں۔ کہاں میرا اعلیٰ خاندان اور کہاں.....؟''

'اعلیٰ خاندان وہ نہیں ہوتا جس کے پاس دولت ہو۔ خاندان وہ اعلیٰ ہوتا ہے جہاں انسان بستے ہیں۔ انسانیت بستی ہے۔''

''آپ میرے خاندان کی توہین کر رہے ہیں۔ آپ کی زبان بے لگام ہوتی جا رہی ہے۔''

''آپ دولت کے نشے میں عزت و احترام بھولے جا رہے ہیں۔ میں ایسی جگہ رشتہ نہیں جوڑ سکتا۔'' جمال اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمت اللہ دیکھتے رہے۔

رقیہ کو جب یہ پتہ چلا تو اس نے طوفان کھڑا کر دیا۔

''وہ حرامی اب ہماری خوشیوں میں رخنہ ڈالے گا۔ یا تو وہ اب اس گھر میں رہے گا یا میں۔ اور آپ فوراً جائیے اور ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے جوڑ کر آئیے ورنہ میں اور

بشیر کچھ کر بیٹھیں گے۔"

جمال سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کریں۔ ادھر رحمت اللہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ جوش میں زیادہ آگے بڑھ گئے تھے۔ بشیر جیسا اچھا رشتہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ وہ اپنی غلطی سمجھ گئے اور جمال کے کچھ کرنے سے پہلے ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔"

رشتہ برقرار رہا۔ رقیہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ بشیر رخسانہ کے ساتھ رنگ رلیوں میں کھو گیا۔

جمال نے افضل کے رشتے کے لیے ہر اچھے در پر دستک دی لیکن ناجائز ہونے کے داغ نے افضل کا رشتہ کہیں بھی جمنے نہ دیا۔ جمال جب بھی افضل کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتا، پاگل سا ہو جاتا لیکن کچھ کہہ نہ پاتا۔ افضل بھی اپنے محسن کو نظر بھر دیکھتا اور چپ رہتا۔ جمال سوچ رہا تھا کہ اگر افضل کی شادی ہو جائے گی تو اس کی ویران زندگی میں بہار آ جائے گی۔ لیکن افضل سے شادی کرے گا کون.....اوہ..... ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

ولی شاہ نے جب جمال کو دیکھا تو ادب سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے جمال سیٹھ۔ آیئے۔"

"یہاں سے گذر رہا تھا کہ سوچا تم سے ملتا چلوں۔ کیسی طبیعت ہے۔"

"سیٹھ آپ تو جانتے ہیں کہ کاروبار اچھا نہیں چل رہا۔ آپ کے روپئے لوٹانے کی مجھے بہت فکر ہے لیکن اب تک کچھ بن نہیں پڑا.....میں جلد ہی......"

"ارے ولی میں اس لیے نہیں آیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے بیٹے افضل کی شادی تمہاری بیٹی......"

"جناب رک جایئے.... افضل آپ کا بیٹا کب سے ہو گیا۔ سارا شہر اس کی

اصلیت جانتا ہے۔''

''لیکن ولی۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ میں سوچتا تھا کہ تم میری بات سمجھو گے۔''

''ہاں......میں آپ کی دھمکی کو خوب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھئے......بھلے آپ میری حویلی نیلام کروادیں۔''

''ولی شاہ میرا کوئی ایسا ارادہ تو نہیں تھا۔ لیکن تمہارے دل کی نفرت نے تمہارے خیالات کو اجاگر کر دیا۔ اب تو یہی ہوگا۔ اگر تمہاری بیٹی سے افضل کی شادی نہ ہوئی تو یقیناً تمہاری حویلی کے ساتھ ساتھ تمہاری جھوٹی شان وشوکت اور عزت نیلام ہو کر رہے گی۔''

اسی درمیان ولی شاہ کی بیٹی فریدہ بھی آگئی۔ قدرت کا حسین شاہکار۔

''کیا بات ہے ڈیڈی.....چاچا جی آپ کھڑے کیوں ہیں۔ بیٹھئے۔''

جمال نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹی میں نے ولی سے جو کچھ کہا ہے، تم بھی اس پر غور کرنا اور اگر سمجھ سکو تو اپنے ڈیڈی کو بھی سمجھانا کہ سب کی بھلائی کس میں ہے۔''

فریدہ نے باپ سے سب کچھ سننے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میری زندگی برباد ہوتو ہو لیکن میں باپ دادا کی پگڑی پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گی۔ شادی طے ہوگئی۔ ولی رنجیدہ تھا کہ اس کی آبرو کے لیے بیٹی اپنی زندگی قربان کر رہی ہے۔

افضل عجب پس وپیش میں تھا کہ کیا کرے۔ تھک ہار کر اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ بھاری من سے افضل سہاگ رات کے کمرے میں داخل ہوا اور ڈرتے ڈرتے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ جوانی کے دہکتے ہوئے انگارے نے اس کی آنکھوں کو ایک مرتبہ خیرہ کر دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''میں جانتی ہوں کہ تم ایک ناجائز اولاد ہو اور میں نے اپنے خاندان کی آبرو اور وقار برقرار رکھنے کے لیے تم سے مجبوری میں شادی کی۔ تم زبردستی میرا جسم حاصل کر سکتے ہو۔ تم نے روپیوں کے بل پر مجھے حاصل کیا لیکن میرا پیار بکاؤ نہیں۔ مجھے تم سے نفرت ہے صرف نفرت۔''

افضل کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہاں نفرت......اس کے علاوہ اب میں دنیا سے توقع ہی کیا کر سکتا ہوں۔ تم آرام سے سو جاؤ۔'' اس جملے سے فریدہ کے دل میں کچھ پلوں کے لیے پیار کا جذبہ پھوٹا لیکن فوراً انتقام کی آگ نے اسے جلا کر راکھ کر دیا۔

جمال خوش تھا کہ افضل کی شادہ ہوگئی۔ اب کچھ دن میں پوتا بھی آجائے گا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ افضل کو واپس جانا پڑا۔ فریدہ تنہائی کی ویرانی کو گلے لگاتی رہی۔

''کیا بات ہے یار۔ جب سے واپس آئے ہو بدلے بدلے ہی رہے۔ یہاں تک کہ تمہارے واپس گھر جانے کا وقت بھی آ گیا۔ شادی کے بعد سب خیریت تو ہے۔''

''ہاں زندگی میں تو سب کچھ ہے دوست۔ خیریت سکھ دکھ۔ کل مجھے یہاں سے گھر جانا ہے لیکن دل نہیں چاہتا۔ پھر سوچتا ہوں دن ہی تو کاٹنے ہیں۔ چاہے یہاں، چاہے وہاں۔''

وہ ریل گاڑی میں سوار ہوا۔ زندگی سے بے پرواہ۔ بنا مقصد۔ یکا یک ریل رک گئی۔ باہر بڑا شور تھا۔

''کیا ہوا....''

''انقلابیوں نے ریل کو روک دیا ہے اور اس ڈبے کو لوٹ لیا جس میں خزانہ تھا۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

افضل سوچنے لگا۔
انقلابیوں کی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے۔ایک منزل۔قوم کی آزادی۔اور میری زندگی.......

''آگئے بیٹا۔''

''جی''

''اب کہ تو لمبی چھٹی پر آئے ہوگے۔''

''جی........فریدہ......''

''بیٹا وہ میکے چلی گئی۔اب تمہیں اسے لینے جانا ہوگا۔''

''ضروری ہے۔''

''ہاں۔کل جا کر اپنی بیوی کو لے آنا۔''

نوکر دوڑتا ہوا فریدہ کے پاس آیا۔

''بی بی۔میں نے افضل بابو کو دیکھا۔''

''اچھا......ڈیڈی۔''

''نہیں بیٹی میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گا.....وہ حرامی ہے۔''

افضل نے آخری جملہ سن لیا اور وہیں سے واپس چلا آیا۔ زندگی کا بوجھ اب برداشت سے باہر تھا۔اس نے فریدہ کے نام ایک خط لکھا جس کے ساتھ اور لوگوں کے نام بھی خطوط تھے۔

فریدہ۔
مری رگوں میں گندہ خون دوڑ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے باپ کہلانے والے میرے محسن جمال صاحب نے تمہارے والد کے آگے کیا شرط رکھی اور تم سے میری شادی کن حالات میں ہوئی۔ یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ میں تمہیں کچھ نہ

دے سکا۔ اپنا نام تمہارے نام کے ساتھ جوڑنے کا عظیم گناہ مجھ سے ہو گیا۔ جس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں تمہاری زندگی سے بہت دور جا رہا ہوں۔ تمہارے خط کے ساتھ چار خط اور ہیں ہو سکے تو انھیں میرے گھر والوں کے پاس پہنچا دینا"۔

فریدہ نے تینوں خط سامنے رکھ دیئے۔

امی!

آپ نے جو کچھ کہا وہ حقیقت تھی اور حق کہنا گناہ نہیں ہوتا۔ مجھے اس بات کا افسوس ضرور رہے گا کہ آپ کے لیے میں ہمیشہ بدنامی کا باعث بنا رہا اور آپ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

افضل

ابا جان!

آپ کا اور میرا رشتہ وہ نہیں لیکن جو محبت آپ نے مجھے دی اس کے بدلے میں آپ کو بدنامی اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہ دے سکا، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

افضل

بشیر صاحب!

میں آپ کی راہ کا کانٹا تھا۔ تم نے میرے بارے میں سچ کہا تھا۔ حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ناراضگی کیسی۔

افضل

رخسانہ!

میں نے تم سے محبت کی تھی لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ تم بشیر سے محبت کرتی ہو، میں نے تمہارا خیال اپنے دل سے نکال دیا تھا، شاید تمہیں یقین نہ آئے۔

افضل

جمال صدمے سے بے ہوش ہو گئے۔ باقی تینوں بت بن کر ایک دوسرے کا منھ حیرت سے تکنے لگے۔

﴿ ۴ ﴾

افضل متواتر تین دن تک پیدل چلتا رہا۔ بنا کھائے پیے۔ بدن نحیف ہو گیا تھا۔ آخر کار بدن چلنے کی تاب نہ لا سکا اور وہ ایک جھونپڑی کے سامنے گر گیا۔ آواز سن کر جھونپڑی کے اندر سے ایک آدمی نکلا......

''یہ کون ہے؟''

''ناصر تم کہاں تھے؟''

''پیر صاحب باہر ایک آدمی بے ہوش پڑا ملا۔ میں اس کو اندر لے آیا ہوں''۔

''بہت اچھا کیا۔ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے پاس لانا۔ مجھے اس سے باتیں کرنی ہیں۔ اور اس کا اچھی طرح خیال رکھو''۔

پیر صاحب نے من ہی من کہا ''شاید وہی ہو''۔

''میں کہاں ہوں؟''

''آپ محفوظ ہیں اور شاہ کمال کے سائے میں آ گئے ہیں''۔

''شاہ کمال صاحب! نام سنا ہے۔ کہتے ہیں خدا دوست آدمی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''وہ خود آپ سے ملنا چاہتے ہیں''۔

''تو پھر چلئے''۔

''السلام علیکم پیر صاحب! میں افضل ہوں''۔

''افضل کمال کہو''۔

''میں سمجھا نہیں، میں گنہگار......''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''تم میرے بعد اس گدی کے وارث ہو''۔

''لیکن میں اس قابل......''۔

''قابل، قابلیت کا سوال ہی کہاں ہے، یہ تو دل کا سوال ہے۔ جس کا دل صاف ہو، جس کے دل میں کسی کے لیے نفرت نہ ہو وہ خدا کے قریب ہوتا ہے۔ اپنی زندگی یوں ضائع مت کرو، میری خواہش پوری کرو''۔

''لیکن......''۔

''مجھے یقین ہے کہ تم میرے بعد میری گدی اچھی طرح سنبھال سکتے ہو''۔

یہ لفظ پیر صاحب نے کچھ اس انداز میں کہا کہ افضل کے منہ سے سوائے ان لفظوں کے اور کچھ نہ نکل سکا...... ''آپ کا حکم اور یقین سر آنکھوں پر''۔

وقت گزرتا گیا۔ پیر صاحب دنیائے لافانی سے رخصت ہو گئے اور افضل کی گفتگو اور نیک کاموں کے سبب لوگ اسے پیر صاحب کہنے لگے۔

ایک دن ناصر نے کہا......

''پیر صاحب! وہ جو انقلابی جماعت ہے نہ جو ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کر رہی ہے، اسے سامراجی حکومت نے بڑا نقصان پہنچایا ہے''۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ پیدائشی حق کے لیے اتنے لوگوں نے اپنے خون کی قربانی دی ہے، کتنی امیدیں ان سے وابستہ ہیں''۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں، ہمارے لیے تو صرف دعاؤں کے لیے ہاتھ ہیں''۔

''ہاں!''

اسی وقت رحیموں بھاگتا ہوا آیا۔

''انقلابی تحریک کی آخری کمپنی کو بھی ختم کر دیا گیا''۔

''اب کیا ہوگا؟ کیا قوم غلام ہی رہے گی؟ مجھے بڑی بے چینی ہو رہی ہے، کیا کوئی

ایسی جگہ ہے جہاں میں بالکل تنہا رہوں اور کچھ سکون ملے''۔

''پیر صاحب ایسی جگہ ہے، سامنے کی چھوٹی پہاڑی پر ایک بڑا درخت ہے۔ بڑے پیر صاحب بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر سکون حاصل کرتے تھے''۔

''وہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''آدھا گھنٹہ''۔

''چلو''۔

افضل درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ دل کو کچھ سکون ہوا۔ آنکھ لگ گئی۔ خواب میں آزاد ملک دیکھا۔ پھر ایک چندن کا تخت، اس پر ایک نور کا سایہ جلوہ گر ہوا۔

''پیر صاحب! آپ''۔

''ہاں بیٹا''۔

''آپ نے جتنی ذمہ داری مجھے دی اس نے مجھے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ میرے بہت سے فرض اس میں دم توڑ رہے ہیں۔ آزادی کے لیے جدوجہد کرنا میرے اوپر بھی فرض ہے، لہو پکار رہا ہے۔ لیکن سماجی اور اخلاقی ذمہ داری نے میرے پیر باندھ دیئے ہیں۔ حالانکہ میں بھی پہلے فوج میں تھا لیکن اب روح کی آنکھیں کھل چکی ہیں''۔

''میرے بیٹے! آزادی کی جدوجہد بھی تو اخلاقی اور سماجی فرائض میں شامل ہے۔ تم بالکل آزاد ہو۔ تم میں وہ صلاحیت ہے کہ تم سماجی اور اخلاقی کاموں کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی میں بھی شریک ہو سکتے ہو''۔

''افضل کی آنکھ کھل گئی''۔

''ناصر! پیر صاحب نے مجھے خواب میں بشارت دی اور کہا کہ میں انقلابی تحریک میں شامل ہو سکتا ہوں''۔

''لیکن تنظیم تو ختم ہو گئی''۔

''تو کیا ہوا، نئی تنظیم بنائی جائے گی۔ تم آج گاؤں والوں کو اکٹھا کرو۔ میں ان سے گفتگو کروں گا''۔

''پیر صاحب! یہ آپ نے میرے دل کی بات کہی، میں ابھی کام میں لگ جاتا ہوں''۔

لوگ جمع ہوئے۔ افضل نے آزادی کے متعلق تقریر کی۔ وہ چھوٹی سی بستی متاثر ہوئی اور تیس آدمیوں کی جماعت انقلابی تحریک میں شامل ہوئی۔ طے یہ ہوا کہ ۵ رکلو میٹر دور پل کے پاس جو حکومت کی پوسٹ ہے، اس پر حملہ کر کے انقلاب کا آغاز کیا جائے۔

رات کا سناٹا تھا۔ افضل اور رحمٰن پل کو پار کرنے لگے۔ دو سپاہی جو اس وقت وہاں موجود تھے، ایک ساتھ بول پڑے۔

''اسٹاپ! کون ہو تم؟ کہاں جا رہے ہو؟''

''مائی باپ، ہم گاؤں کے آدمی ہیں۔ بیٹا بیمار ہے، وید کو لینے جا رہے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، لیکن تمہاری تلاشی لینی ہوگی، ہاتھ اوپر کرو''۔

''جی مائی باپ''۔

جیسے ہی دونوں سپاہی تلاشی لینے کو نیچے جھکے، افضل نے فوجی داؤ دکھاتے ہوئے اس سپاہی کو قابو میں لے لیا۔ رحمٰن نے بھی اپنی طاقت کام میں لائی۔ بندوقیں چھین لی گئیں اور سپاہیوں کو دریا میں پھینک دیا گیا۔

''پہلی کامیابی مبارک''۔

''شکریہ۔ کیا آپ لوگوں میں کوئی بندوق چلانا جانتا ہے؟''

''جی ہاں، میں جانتا ہوں''، صابر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، کل سے بندوق چلانا سکھائیں گے لیکن اس کے لیے کسی محفوظ مقام

ضروری ہے''۔

''پاس کے گھنے جنگل میں ایک مقام ہے جناب اور وہاں ایک بڑا غار بھی ہے جہاں رہا بھی جاسکتا ہے''۔

''تو پھر آج سے اپنا مسکن وہی ہوگا''۔

دوسرے دن اخبار کی سب سے بڑی سرخی یہی تھی کہ ایک نئی انقلابی تحریک نے جنم لیا اور پل کے پاس کے پوسٹ کو تباہ کر دیا۔ آزادی کے خواہش منداس خبر کو پڑھ کر جھوم اٹھے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرنے لگے۔

افضل نے متاثر کن تقریر کے بعد اپنا نقطۂ نظر رکھا۔

''دوستو! اب ہمیں کوئی بڑا کام کرنا چاہیے جس سے حکومت ہل جائے۔ مثلاً کسی بڑی چھاؤنی پر حملہ کرنا چاہیے''۔

''پیر صاحب! یہاں سے چار میل کی دوری پر ایک آبشار ہے، اسی کے پاس فوج کی ایک چھاؤنی ہے لیکن اس کو جیتنے کے لیے کم از کم ۳۰ ر بموں کی ضرورت ہوگی''۔

''اس کا انتظام ہے''۔

''تو پھر چلو''۔

یکا یک متواتر بموں کے دھاکوں سے چھاؤنی میں انتشار پھیل گیا۔ سپاہی سمجھ نہیں پائے کہ کیا ہوا۔ خبر یہ پھیلی کہ شاید بارود گودام میں آگ لگ گئی ہے اور اس لیے متواتر دھماکے ہورہے ہیں۔ ادھر انقلابی جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ چھاؤنی پر قابو لیا گیا۔ سپاہیوں کے ہاتھ پاؤں باندھے جانے لگے۔

''ارے کیپٹن افضل آپ یہاں کیسے؟ یاد ہے ہم دونوں برما کے محاذ پر ساتھ لڑے تھے''۔

''بے وقوف!'' صابر نے کہا...... ''یہ نئی تحریک کے سربراہ ہیں، جو آزادی حاصل

کر کے ہی دم لے گی‘‘۔

’’تو جناب لیڈر بن گئے ہیں، لیکن حکومت کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ کسی دن پکڑے گئے تو مارے جاؤ گے‘‘۔

’’بے وقوف! ہم مرنے کے لیے ہی تو نکلے ہیں‘‘۔

انقلابیوں نے وہاں کا سب کچھ لوٹ لیا۔ راشن پانی، گولہ بارود، بندوقیں۔ لڑائی کے دوران چھ سپاہی جاں بحق ہوئے اور کئی شدید زخمی۔ اس حملے نے حکومت کی نیند اڑادی۔ کیپٹن افضل اپنی ساری فوجی صلاحیت کا استعمال انھیں کے خلاف کر رہا تھا۔ انقلابیوں اور ان کے چاہنے والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔



ولی شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی آواز سے چونک پڑے۔

’’چاچا جی‘‘۔

’’ارے بیٹی نوشابہ!‘‘

’’جی‘‘

’’خیریت سے ہو تمہیں آنے کا خط کب لکھا تھا اور تم اب آرہی ہو‘‘۔

’’میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اصل میں میرا امتحان تھا، اسے مکمل کر کے فوراً آ گئی۔ فریدہ کیسی ہے؟‘‘

’’جاؤ خود ہی مل لو۔ میں تمہارا سامان رکھواتا ہوں اور ناشتہ بھجواتا ہوں‘‘۔

نوشابہ ولی شاہ کے سالے کی بیٹی تھی۔ فریدہ کی سہیلی، افضل کے جانے کے بعد اور

اس کا خط پڑھ کر فریدہ کے دل ودماغ پر عجب اثر ہوا تھا۔ وہ افضل سے کیے ہوئے اپنے رویوں سے خود کو گنہگار سمجھنے لگی تھی۔ نوشابہ نے فریدہ کی آنکھوں پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا۔

"بتاؤ، ہم کون؟"

"نوشابہ"

"کمال ہے میں اتنے دن تم سے دور رہی پھر بھی تم نے میری آواز پہچان لی"۔

"تم نظروں سے دور رہی، دل سے نہیں"۔

"کیا بات ہے، اداس لگتی ہو"۔

"نہیں تو"۔

"اچھا میں تمہیں ایک جوک (Joke) سناتی ہوں"۔

"تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے اور کوئی خبر سناؤ"۔

"ٹھیک ہے، ایک دھماکے دار خبر سناتی ہوں، فوج سے بھاگا ہوا کیپٹن افضل انقلابی تحریک کا سربراہ"۔

"کیا؟"

"جی ہاں۔ آج کے اخبار کی سرخی یہی ہے۔ خبر کے ساتھ افضل کا فوٹو بھی چھپا ہے۔ یہ دیکھو"، فریدہ افضل کی تصویر کو چومنے لگی۔

"کیا پاگل پن ہے، تم تو اس سے شدید نفرت......"

"وہ میری شدید بھول اور شدید گناہ تھا"۔

ولی شاہ نے بھی اخبار کی سرخی کا مطالعہ کر لیا تھا اور بے چینی سے ہال میں ٹہل رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"ولی شاہ"۔

''جناب''

''میں حکومت کا افسر بول رہا ہوں، آپ ابھی پولیس اسٹیشن آ جایئے، میں یہیں بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہوں''۔

''جی بہت اچھا''۔

تھوڑی دیر میں ولی شاہ کی کار پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔

''آیئے ولی شاہ صاحب! آپ کو یہاں یہ بتانے کے لیے زحمت دی گئی ہے کہ وہ جو کالج بنانے کا ٹھیکہ آپ کو دیا گیا تھا......''۔

''جی ہاں''۔

''......وہ آپ سے چھین لیا گیا ہے''۔

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ نے جس تھالی میں کھایا، اسی میں چھید کیا ہے''۔

''جی میں سمجھا نہیں''۔

''آپ کے داماد کیپٹن افضل انقلابی تحریک کے سربراہ ہیں''۔

''لیکن اس کا میرے ساتھ کیا واسطہ ہے؟''

''آپ کے ساتھ واسطہ ہو نہ ہو لیکن حکومت کو لگتا ہے کہ آپ انقلابیوں کا پتہ ٹھکانا جانتے ہیں۔ جا کر کسی انقلابی کو پکڑ لایئے یا ان کا پتہ ہمیں بتا دیجیے۔ ایک کیا آپ کو تین چار ٹھیکے دلوا دوں گا''۔

ولی شاہ کے دل میں انقلابیوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

مایوسی کی حالت میں ولی شاہ گھر واپس آیا اور جمال کو فون کر کے سارے حالات بتائے۔

''فکر نہ کرو۔ میرا ایک پرانا دوست آج کل حکومت میں بہت رسوخ رکھتا ہے۔

وحشی سعید نمبر

اس کو میں نے اپنے گھر بلایا بھی ہے۔ اس کی مدد سے حکومت کو یقین ہو جائے گا کہ آپ کا کسی قسم کا بھی تعلق انقلابی تنظیم سے نہیں ہے''۔

جمال بے صبری سے آنے والے مہمانوں کا ریلوے اسٹیشن پر منتظر تھا۔ گاڑی آ گئی...... ''آ......اجمل......سفر تو اچھا رہا''۔

''ہاں یار۔ ان سے ملو، میری بیوی رضیہ''۔

''رضیہ''، جمال چونک پڑا۔ رضیہ نے بھی جمال کو پہچان لیا۔

''چلئے گھر چلیں''۔

رات کے دس بج رہے تھے، جمال کی آنکھوں سے نیند غائب تھی، وہ اب تک باغیچے میں اکیلے بیٹھے کش پہ کش لگا رہے تھے۔

''رضیہ ہی افضل کی ماں ہے اور مرحوم انور خاں اس کا ناجائز باپ۔ لیکن خون تو خون ہے۔ انور خان بھی انقلابی اور افضل بھی''۔

یکا یک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

''کون؟'' ارے رضیہ آپ......اس وقت......''

''مجھے میرا بیٹا لوٹا دو''۔

''تمہارا بیٹا، اچھا تمہارا ناجائز بیٹا۔ کیا تمہارا شوہر اسے اپنانے کو راضی ہوگا''۔

''وہ کیوں نہ ہوگا، اسے سب معلوم تھا، دس کروڑ روپئے نقد اور دو فیکٹری کے عوض اس نے مجھ سے شادی کی۔ لیکن اولاد سے محروم رہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں کبھی اولاد نہ ہوگی''۔

''اچھا تو تم مجبوری میں اپنے ناجائز بیٹے کو اپنا رہی ہوتا کہ تمہارے گھر میں چراغ جلانے والا کوئی ہو۔ اگر بیٹے کی ممتا جگی نہ ہوتی تو تمہیں اس کا خیال تک نہ آتا۔ تم اس کی ماں نہیں ہوسکتیں، وہ بن ماں کا بچہ ہے، اس کا صرف باپ ہے اور وہ میں ہوں''۔

وحشی سعید نمبر

"میرے حال پر رحم کھاؤ، تمہیں ایک ماں کے آنسوؤں کا واسطہ، مجھے میرا بیٹا لوٹا دو"۔

"تمہارا...... نہیں، میرا بیٹا، قوم کا سربراہ بن گیا ہے۔ قوم اس کے نام پر مرنے کو تیار ہے۔ بالکل اپنے جنم دینے والے باپ انور خاں پر گیا ہے۔ تم نے کیپٹن افضل کا نام تو سنا ہوگا"۔

"کیپٹن افضل...... میرا بیٹا......"

"اجمل ہمارا بیٹا مل گیا"۔

"کیا؟"

"ہاں! کیپٹن افضل ہمارا بیٹا ہے۔ اب ہمیں یہ بات دنیا کو بتانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے باپ کے بارے میں کیا بتائیں گے"۔

"اخبار میں چھپوا دو کہ افضل کے نانا، ہماری شادی کو راضی نہیں تھے، تو ہم نے چپکے سے نکاح کر لیا اور اس کے بعد افضل پیدا ہوا تو اسے جمال کے حوالے کر دیا کہ جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو بچہ واپس لے لیں گے۔ اسی درمیان جمال شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ بعد میں افضل کے نانا راضی ہو گئے اور دنیا کے سامنے ہماری شادی ہوئی لیکن ہمیں دوسرے ملک جانا پڑا۔ کئی سالوں کے بعد واپسی پر ہم نے جمال سے ملاقات کی تو پتہ چلا کہ کیپٹن افضل ہی ہمارا بیٹا ہے"۔

دوسرے دن اخبار والے چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔

"کیپٹن افضل کے ماں باپ مل گئے۔ ایک حیرت انگیز انکشاف"۔

رقیہ، بشیر اور رخسانہ نے جب یہ خبر سنی تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

نوشابہ نے فریدہ سے چیختے ہوئے کہا...... "آج ایٹم بم پھٹ گیا"۔

"کیا بک رہی ہو؟"

''کیپٹن افضل کے ماں باپ مل گئے''۔

''میرا شوہر ناجائز نہیں ہے۔ وہ دن جلدی آئے کہ میں اس کے پیروں پر اپنا سر رکھ کر معافی مانگ سکوں''۔



آزادی کی وہ تحریک جو مکمل مردہ ہونے کے بعد از سرِ نو افضل کے ہاتھوں کی تشکیل پائی تھی، نے اب طوفان کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ اس میں شامل ہو رہے تھے۔ روز کہیں نہ کہیں کوئی سرکاری دفتر تباہ ہوتا، فوجی ہلاک ہوتے۔ سامراجی حکومت دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

افضل نے انقلابیوں کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کی۔

آزادی کے متوالو! وہ دن دور نہیں کہ جب ہم آزاد فضا میں سانس لیں گے۔ یہ جنگ کے آخری مراحل ہیں۔ اب ہمیں وہ کرنا ہے جو سامراجی حکومت کے تابوت میں آخری کیل ثابت۔ اب ہم سکریٹریٹ اور جیل پر حملہ کریں گے۔ سکریٹریٹ جہاں خاکستر کیا جائے گا، وہیں جیل پر حملہ کر کے ہمارے جو بے گناہ قومی بھائی انقلابی ہونے کے شک میں سزا کاٹ رہے ہیں، ان کو آزاد کرایا جائے گا۔

''پہلا کام ناصر اپنی ٹکڑی کے ساتھ کرے گا اور دوسرے میں مَیں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔ آپ لوگوں کے لیے بھی الگ الگ کام طے کر دیئے گئے ہیں۔ آپ لوگ ان کو انجام دیں گے''۔

''انقلاب......زندہ باد!''

دوسرے دن اخبار میں انقلابیوں کا ایک اور کارنامہ چھپا تھا۔

''کیپٹن افضل کی شہر میں آمد، انقلابیوں نے اس کی سربراہی میں حکومت کا پولیس

ہیڈکوارٹر قبضے میں لے لیا''۔

فریدہ نے خبر پڑھ کر ایک سرد آہ بھری۔

''کتنا پاس آگئے ہیں لیکن پھر بھی کتنی دور ہیں''۔

ناصر اپنی ٹکڑی کے ساتھ سکریٹریٹ کے نزدیک پہنچ گیا۔ رات کے وقت بھی سکریٹریٹ کی عمارت بجلی کی روشنی میں نہا رہی تھی۔ چاروں اور سخت پہرہ تھا۔ عمارتوں کے اوپر بھی فوجی جوان مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔

ناصر نے اپنے ساتھیوں سے کہا......

''ہمیں کسی بھی طرح فوجیوں کی نگاہوں سے بچ کر سکریٹریٹ کی عمارت میں بم لگانے ہیں تا کہ ۱۰ منٹ کے بعد جب سارے بم ایک ساتھ پھٹیں گے تب پوری عمارت زمین کے اندر ہوگی''۔

''لیکن پہرے کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ پہرے داروں کی نگاہوں سے بچا جاسکے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے کچھ لوگ ایک طرف سے فائرنگ کرتے رہیں تا کہ پوری فوج اس جانب متوجہ ہو جائے اور باقی ساتھی بم لگانے کے کام میں لگ جائیں''۔ ایک انقلابی نے مشورہ دیا۔

''تجویز مناسب ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

''یہی مناسب ہوگا''۔

''تو پھر چلو جان ہتھیلی پر لے کر، خاک وخون کی سرحدوں کے پار آزادی ہماری منتظر ہے''۔

''انقلاب......زندہ باد!''

فائرنگ شروع ہوگئی۔ عمارت کے اوپر پہرہ دے رہے فوجی بھی تیار تھے، جب انھوں نے دوسری اور سے انقلابیوں کو سکریٹریٹ میں آتے دیکھا تو اوپر سے فائرنگ

وحشی سعید نمبر

شروع کردی۔ انقلابی جوش وجنون سے لبریز تھے، اس لیے مرتے ہوئے بچتے ہوئے چاروں اور بم لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک طرف متواتر فائرنگ کررہے فوجیوں کو الجھائے ہوئے تھے۔ ناصر بم لگانے والوں کے ساتھ اوپر سے فائرنگ کررہے فوجیوں کی گولیوں کا جواب دینے میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ایک گولی اس کے داہنے بازو کو گھائل کرتے ہوئے نکل گئی۔ بازو خون سے بھر گیا۔ ناصر ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے محفوظ مقام کے لیے نکل پڑا۔

بنگلے کی دیوار پھاند کر ناصر ایک برآمدے کے سہارے کمرے میں داخل ہوا۔ بستر پر حسن کی ملکہ سو رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کا ہاتھ گلدان سے جا ٹکرایا۔ حسن کی ملکہ کی نیند ٹوٹ گئی، اس نے بلب جلا دیا۔

''کون ہو تم......؟''

ناصر کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''چپ رہو......فوج میرا پیچھا کررہی ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے آسرا چاہیے''۔

''چوری اور سینہ زوری''۔

''میں چور نہیں ہوں''۔

''تو کیا انقلابی ہو جو فوج تمہارا پیچھا کرے گی۔ جھوٹ مت بولو، آج کل ہر چور خود کو انقلابی کہہ کر گھر میں گھس جاتا ہے اور چوری کر کے فرار ہو جاتا ہے''۔

ناصر مسکرایا...... ''تو تمہیں ثبوت چاہیے، ایک منٹ ٹھہرو''۔

ایک منٹ بعد خوفناک دھماکہ ہوا۔

''کیوں لڑکی ثبوت مل گیا'']۔

''میرا نام نوشابہ ہے، یہ کیا تھا؟''

''تو تم لڑکی نہیں نوشابہ ہو''۔

وحشی سعید نمبر

نوشابہ کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔

''یہ کیسا دھماکہ تھا؟ شاید سکریٹریٹ کے آس پاس تھا''۔

''آس پاس نہیں، اسی میں دھماکہ تھا اور اب سکریٹریٹ زمین کے اوپر نہیں، زمین کے نیچے ہے۔ مجھے کچھ دیر یہاں رکنا پڑے گا''۔

''او.کے!''

ناصر نے پستول جیب میں رکھ لیا...... ''ایک گلاس پانی ملے گا؟''

''ابھی لاتی ہوں''۔

ناصر کے بازو کا زخم اب اثر دکھانے لگا تھا۔ وہ سنبھل کر بیڈ پر بیٹھا کہ اسے غش آ گیا۔

نوشابہ پانی لے کر آئی...... ''اوہ...... آپ کو کیا ہوا؟ اُف یہ زخم میں ابھی چاچا جی کو بلاتی ہوں...... چاچا جی''۔

''کیا ہوا بیٹی!'' فریدہ بھی اس کی آواز سن کر باہر آ گئی۔

''ایک انقلابی زخمی حالت میں میرے کمرے میں آ کر گر گیا ہے، ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے''۔

فریدہ بول پڑی...... ''بالکل چلو''۔

ولی شاہ نے بھی کچھ سوچتے ہوئے کہا...... ''ہاں...... چلو''۔

ناصر کے زخم دھو کر پٹی کی گئی، انجکشن دیا گیا۔ وہ آرام کی نیند سو گیا۔

''زخم گہرا نہیں تھا، جب یہ نیند سے جاگے گا تو اچھا ہوگا، میں نیچے جاتا ہوں، تم دونوں یہیں رہ کر اس کا خیال رکھو''۔

ولی شاہ نیچے آیا، سامراجی افسر کی بات اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔

''افضل نہ سہی، کسی انقلابی کو پکڑ لاؤ، میں ایک کی جگہ تین ٹھیکے دلوا دوں گا''۔

لمحے

وحشی سعید نمبر

''اس سے اچھا موقع دوبارہ نہیں ملے گا''۔

ضمیر سے آواز آئی، لیکن قوم سے غداری...... دولت کے لیے......لیکن دولت سب کچھ ہے۔ دولت سے انقلابیوں کو بھی خریدا جاسکتا ہے۔ فی الحال اس کی گرفتاری ہو جائے تو اس کے ذریعہ کئی انقلابیوں کو خریدا جاسکتا ہے اور سامراجی حکومت کے دل میں جگہ بنا کر کروڑوں، اربوں کمائے جاسکتے ہیں''۔

یہ خیال آتے ہی اس کی کانپتی انگلیوں نے فون پر امرجنسی نمبر ڈائل کیا۔

کمرے میں ناصر چین کی نیند سو رہا تھا، نوشابہ کی نظریں اسے نہار رہی تھیں۔

''تمہاری آنکھیں تمہارے عشق کی چغلی کھا رہی ہیں''۔

''کیا مطلب......نہیں تو......''

''میری جان! جب مجھے میرے شوہر افضل سے سچا عشق ہوا تب سے ان کی تصویر کے آگے میری آنکھیں بھی ایسے ہی جھکتی ہیں جس طرح ابھی تمہاری آنکھیں اس کو دیکھ کر اور پتہ نہیں کیا کیا تصور کر کے شرم وحیا سے جھکی جا رہی ہیں''۔

کمرے کے سامنے تین آفیسر دبے قدموں آ کر کھڑے ہو گئے اور آہستہ سے دروازہ کھولا۔

نوشابہ اور فریدہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ ناصر کو گھیرے میں لینے کے بعد اس کے منہ پر پانی مارا گیا۔ ناصر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''اچھا تو وہ مسکراہٹ دولت کے لیے تھی''۔

نوشابہ اور فریدہ ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگیں۔

''لے چلو اسے''۔

فوجی ناصر کو لے کر چلے گئے اور جاتے جاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں ولی شاہ کو اشارہ کر گئے کہ اس کی خدمت کا سامراجی حکومت بہترین صلہ دے گی۔

وحشی سعید نمبر

''چاچاجی، یہ آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ناصر کو پکڑ وا کر......''۔

''تمہارا ناصر......؟ اچھا تو دونوں سہیلیاں انقلابی کی محبت میں پاگل ہو گئی ہیں جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں''۔

''ابا جان!......وہ موت قوم کو بیچ کر خریدی گئی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ ذلت کی زندگی جس میں دولت کے محل تو ہوں لیکن اس کی بنیاد قوم سے غداری پر ہو۔ قوم کے جیالوں کے خون پر ہوں''۔

''دولت سب سے بڑی چیز ہے، انقلابی کا سسر ہونے کے سبب شک کی بنا پر میرا جو ٹھیکہ مجھ سے چھین لیا گیا تھا، اب اس انقلابی کو پکڑ وانے کے عوض مجھے تین تین ٹھیکے ملیں گے۔ میرا انتقام پورا ہوا''۔

''انتقام کی آگ میں آپ نے اپنی بیٹی کی خوشیاں بھی جلا دیں، مجھے آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے''۔

''چاچاجی! اب میں ایک غدار کے یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتی، میں جا رہی ہوں''۔

''نوشابہ میں بھی تمہارے ساتھ آ رہی ہوں''۔

ولی شاہ چیختا رہا، جیسے وحشی ہو گیا ہو۔

افضل سوچ رہا تھا، ابھی تک ناصر واپس نہیں آیا، کیا بات ہوئی؟

''کیپٹن، ناصر پکڑا گیا''۔

''کیسے، غفار کیسے......؟''

غفار نے سارا حال کہہ سنایا۔

''اچھا......تو اس غدار کو پہلے سزائے موت دوں گا، اس کے بعد جیل پر حملہ ہوگا۔

افضل ولی شاہ کے بنگلے میں داخل ہوا۔ اس کی آہٹ سن کر ولی شاہ نے دل ہی دل میں

کہا...... ''شاید میری بیٹی واپس آ گئی''، اس نے دروازہ کھول دیا۔

''کون ہو تم؟''

افضل نے ہیٹ سے سر اوپر اٹھایا، ولی شاہ چیخ پڑا۔

''نہیں نہیں...... سسر باپ کے برابر ہوتا ہے، مجھے کچھ مت کرنا''۔

''سسر...... باپ...... قوم کے غداروں کی بس ایک سزا ہے، سزائے موت''۔

وہ بے تحاشہ بھاگا، لیکن افضل کی گولی سے نہیں بچ سکا۔

جیل پر سخت پہرہ تھا، گھومنے والا اسٹریٹ لائٹ جیسا بلب گھوم گھوم کر چاروں اور کے حالات دکھا رہا تھا، جیسے ہی بلب افضل اور اس کے ساتھیوں کے قریب آنے لگا۔ سب چھپ گئے، بلب کی روشنی کے آگے جاتے ہی سب نے جیل کو گھیرے میں لے کر حملہ کر دیا۔ یہ نہایت خاموش حملہ تھا۔ ایک ایک کر کے کلوروفارم کے ذریعہ سپاہیوں کو بے ہوش کر کے ان کے منہ اور ہاتھ باندھے جا رہے تھے۔ یکا یک افضل کو جیلر نظر آ گیا۔ جیلر کو قابو میں کر کے افضل نے اس کے کپڑے پہن لیے اور اپنے ایک ساتھی کو سپاہی کی وردی پہنا دی۔ جیلر کے ہیٹ کو اس طرح لگایا کہ چہرے کا کافی حصہ ڈھک گیا۔

جیل کے سپاہی نے دور سے جیلر کو ایک سپاہی کے ساتھ دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔ ایک بار اس نے سوچا کہ جیلر صاحب نے اس طرح ہیٹ کیوں لگایا ہے۔ پھر من ہی من بولا، بڑے لوگوں کا جیسا موڈ...... ان دونوں کے نزدیک آنے پر سپاہی نے سیلوٹ کیا۔ جیلر کے ساتھ والا سپاہی بولا...... ''اس انقلابی نے کچھ بتایا''۔

''نہیں، بڑا ہی سخت جان ہے''۔

''اس کو لے آؤ، اس سے جیلر صاحب خود کمرے میں پوچھ گچھ کریں گے''۔

''جی''۔

وحشی سعید نمبر

جیلر کے کمرے میں افضل نے ناصر کو گلے لگایا۔ اس کو سپاہی کی وردی پہنائی۔ ناصر مسلسل اذیت کے سبب کمزور نظر آ رہا تھا۔ افضل نے سپاہی کی وردی والے انقلابی سے کہا......

''تم دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اپنا مشن پورا کرو، میں ناصر کو لے کر محفوظ جگہ لے جاتا ہوں۔ کل مرکز میں ملاقات ہوگی''۔

افضل اس کو لے کر ریلوے اسٹیشن کی اور چل پڑا۔ مرکز کی جانب جانے والی ٹرین کا ٹکٹ لیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور افضل اور ناصر وردی میں تھے، اس لیے دونوں کی اور کسی نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

ٹرین آٹھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ فریدہ اور نوشابہ اسٹیشن پر بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے ٹرین آ گئی۔ دونوں نے فرسٹ کلاس کے ڈبے پر پاؤں ہی رکھا تھا کہ پیچھے دو وردی پوش آ گئے اور ان کے بعد اسی ڈبے میں سامنے کی دونوں سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

فریدہ اور نوشابہ نے نقاب سے دونوں کی صورتیں دیکھیں تو خوشی اور حیرانی سے بت بنی رہ گئیں۔

''اب کیسی طبیعت ہے ناصر؟''

''پہلے سے بہتر ہوں کیپٹن''۔

نوشابہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا...... ''تو آپ لوگ حکومت کے آفیسر نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہیں، اس لیے کہ آپ جیلر کی وردی میں ہیں اور یہ سپاہی کی وردی والا آپ کو کیپٹن کہہ رہا ہے''۔

''لڑکی! اپنے کام سے مطلب رکھو''۔

''وہی تو کر رہی ہوں، ہمیں جاننے کا پورا حق ہے کہ کہیں آپ برے آدمی تو نہیں

ہیں، آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟''

''تمہارا کہنا درست ہے، ہم حکومت کے نہیں، قوم کے دلوں کے افسر ہیں۔ ان کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ ہم انقلابی ہیں، حکومت کے باغی''۔

''اچھا! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے دلوں پر بھی بادشاہت کرتے ہیں کیونکہ ہم قوم کی بیٹیاں ہیں''۔

''بہت خوب''، افضل کی زبان سے یکا یک نکل پڑا۔

''اچھا آپ لوگ آ کہاں سے رہے ہیں اور یہ قوم کا سپاہی اتنا کمزور اور بیمار کیسے ہو گیا''۔

''ایک دولت کے لالچی غدار کی وجہ سے لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے''۔

''کون؟''

افضل نے سارا واقعہ بیان کیا۔ فریدہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ یہ میری سہیلی دل کی کمزور ہے، کسی بھی حادثے کو سن کر جذباتی ہو جاتی ہے''۔ نوشابہ نے معاملہ سنبھالا۔

''قوم کے سورماؤں کی بیٹیاں دل کی اتنی کمزور نہیں ہوتیں۔ ضرور یہ اس غدار کی کوئی رشتہ دار یا جاننے والی ہے۔ اسے سمجھا دو کہ قوم کی بہادر بیٹیاں غداروں کے مرنے پر جشن مناتی ہیں، چیختی نہیں''۔

مرکز کا اسٹیشن نزدیک آرہا تھا۔ افضل نے ناصر کو سہارا دے کر اٹھایا۔ نوشابہ اور ناصر کی نظریں چار ہوئیں۔

''آپ سے ملنے کا ارادہ ہو تو کہاں ملاقات ہوگی''، نوشابہ نے دریافت کیا اور اس درمیان اس کا نقاب منہ سے سرک گیا۔ اسی درمیان اسٹیشن آگیا اور ٹرین رک گئی۔

''ممکن ہے آزادی کے بعد یوں سامراجی حکومت کے تابوت میں آخری کیل آج ہم نے ٹھونک دی۔ اب اس کی موت میں دیر نہیں''۔ افضل نے کہا اور ناصر کو سنبھالتے ہوئے ٹرین سے اترا۔ ناصر کی آنکھوں نے جب نوشابہ کو دیکھا تو اس کا چہرا غل وغصہ سے سرخ ہو گیا لیکن وہ بھی خاموشی سے نیچے اتر گیا۔



افضل کی بات سچ ثابت ہوئی۔ سامراجی حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے، ملک انقلابیوں کے ہاتھ آ گیا۔ آزاد ملک...... آزاد ملک...... ہم آزاد ہو گئے...... آزادی مبارک...... انقلاب زندہ باد۔

کیپٹن افضل اب قوم کا ہیرو تھا۔ ملک کا سب سے بڑا لیڈر۔ انقلابیوں میں حکومت بن گئی۔

افضل اپنے دفتر میں بیٹھا لوگوں کے مسائل سن رہا تھا کہ دو برقعہ پوش عورتیں داخل ہوئیں...... ''ہمیں آپ کے قریبی ساتھی ناصر سے ملنا ہے۔ ہم ان کے دفتر نہیں جائیں گی، مہربانی کر کے انھیں یہاں ہی بلوا لیجیے۔ ہمیں آپ کے سامنے ہی ان سے کچھ بات کرنی ہے''۔

افضل حیران رہ گیا، اتنی بیباک عورتیں۔ لیکن اس کے لب خاموش رہے، اس نے سکریٹری کو اشارہ کیا۔ کچھ دیر میں ناصر وہاں آ گیا۔

''کیا بات ہے کیپٹن؟''

افضل نے بنا کچھ کہے دونوں عورتوں کی جانب اشارہ کر دیا۔ ان میں سے ایک نے اپنا برقعہ الٹ دیا۔

''تم...... یہاں...... کیا پھر سے دشمنوں سے گرفتار کروانے کا ارادہ ہے، چلی جاؤ

یہاں سے“۔

”میری بات تو سنئے، آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں“۔

”خبردار!...... میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں“۔

”لیکن آپ کو اس کی بات سننی چاہیے، اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کوئی بات نہیں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس دن فوجی اہل کاروں کو ہم نے نہیں، میرے ابا نے بلایا تھا، جسے بعد میں آپ کے کیپٹن نے سزائے موت دی۔ ہمیں تو اس متعلق کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ ہم تو آپ کے کمرے میں تھے، آپ کی دیکھ بھال کے لیے، وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے“۔

”کیا“ دونوں ایک ساتھ بول پڑے۔

فریدہ نے بھی اپنا برقعہ الٹ دیا۔

”اس کے ابا میرے چاچا تھے، جو آپ کے کیپٹن کے سسر بھی تھے“۔

فریدہ بول پڑی۔

”میں تو اپنی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں لیکن آپ کو اس لیے سب کچھ بتا رہی ہوں کہ آپ بھی بعد میں حقیقت جان کر ندامت اور اپنے محبوب کی جدائی کی آگ میں جل کر خود کو مجرم نہ سمجھتے رہیں، یہ بہت اذیت ناک ہوتا ہے، بہت تکلیف دہ۔ میں جانتی ہوں، میں اس اذیت سے گزر رہی ہوں“۔

ناصر سے کچھ کہتے نہ بنا۔ نہ جانے اس کا دل کیوں نوشابہ کی بات پر ایمان لانا چاہتا تھا۔ آخر محبت کی جیت ہوئی اور وہ بے ساختہ نوشابہ سے گلے لگ گیا۔

فریدہ نے افضل کے پیر پکڑ لیے...... ”مجھے معاف کر دیجیے، میں آپ کو سمجھنے میں بھول کی۔ میں تو اس لائق نہیں پھر بھی آپ سے گڑگڑا کر بھیک مانگتی ہوں کہ اپنی شریک حیات ہونے کا حق عطا کیجیے۔ مجھے اپنے دل میں جگہ دیجیے“۔

افضل ایک لمحے کے لیے بت بنا رہا، پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

''آپ جا سکتی ہیں''۔

دونوں واپس چلی گئیں۔

راستے میں ناصر نے افضل سے کہا...... ''کیپٹن! نہ جانے کیوں مجھے نوشابہ کی باتوں میں سچائی نظر آئی اور قدم خود بہ خود آگے بڑھ گئے۔ ہاتھوں نے خود بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ آپ سے کچھ مشورہ اور آپ کی اجازت تک کا انتظار نہیں کیا، آپ خفا تو نہیں''۔

''میرے دوست! سچے عشق میں کسی کے مشورے اور کسی کی اجازت یا حکم نامے کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ میں بہت خوش ہوں اور امید ہے کہ جلد ہی تمہاری بارات لے کر نوشابہ کے گھر جاؤں گا۔ تم دونوں کی جوڑی بنی رہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں''۔

''کیپٹن! اگر آپ خفا نہ ہوں اور اجازت دیں تو آپ سے کچھ عرض کروں''۔

''بالکل''۔

''سچا عشق تو میں نے فریدہ بھابھی کی باتوں میں بھی محسوس کیا''۔

''میرے پیارے یہ معاملہ ابھی یقین اور گمان کے درمیان ہے، ابھی اور ثبوت درکار ہیں''۔

ناصر خاموش ہو گیا۔ کار افضل کے سرکاری بنگلے میں داخل ہو گئی۔

اگلے دن افضل دفتر میں ضروری ہدایات دے کر فارغ ہوا تو یکا یک اسے جمال، رقیہ، رخسانہ اور بشیر یاد آ گئے۔

ابا سے ملے کافی دن ہو گئے۔ ملک کی آزادی کے بعد مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ...... جلد ہی ان سے ملنے جانا چاہیے۔

وحشی سعید نمبر

دروازے پر دستک ہوئی، چپراسی اندر آیا

''سر کچھ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، اپائنٹمنٹ بھی نہیں ہے لیکن پتہ نہیں کیوں ان کو اندر آنے دیا گیا۔ میں نے پرچی پر نام لکھ کر دینے کو کہا تو بھی منع کر دیا۔ کہتے ہیں کیپٹن ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں''۔

''کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں، یہ تو پوچھ کر آؤ''۔

چپراسی دوبارہ اندر آیا...... ''جی وہ جو...... وہ جو...... آپ کے......''

''ہاں ہاں بلا جھجک بتاؤ، ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔

چپراسی نے ہمت جٹاتے ہوئے کہا...... ''وہ جو آپ کے ماں باپ ملنے کی خبر اخبار میں چھپی تھی آزادی سے پہلے، اسی سلسلے میں لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں''۔

''اچھا! ہاں اس وقت چونکہ آزادی کی آخری لڑائی چل رہی تھی، اس لیے میں اس جانب نہ کسی سے بات کر سکا اور نہ کچھ دریافت کر سکا۔ نہ ہی اخبار کی وہ خبر ہی پڑھ سکا کہ اصل میں لکھا کیا تھا۔ بس کچھ لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ میرے ماں باپ مل گئے ہیں۔ بہر حال انھیں اندر بلاؤ''۔

جمال، رقیہ، رضیہ، رخسانہ، اجمل اور بشیر کمرے میں داخل ہوئے۔

''ارے ابا جان آپ''...... افضل دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا۔

جمال نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا...... ''خوش رہ میرے شیر''۔

''آپ کا شیر، آپ کا بیٹا''۔

''بالکل۔ لیکن میں تیری جنم دینے والی ماں کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تیرے والد بھی آئے ہیں، ان سے ملو اور ان کی دعائیں لو''۔

''اتنے برسوں بعد انھیں میری یاد کیسے آ گئی؟''

اجمل نے جو کچھ بھی اخبار میں چھپوایا تھا، وہ سارا قصہ بیان کیا۔ افضل نے جمال

سے کہا...... ''ابا جان! جو آدمی زندگی کی چھوٹی سی مشکل آنے پر اپنی اولاد کو کسی کے حوالے کر دے اور پھر ایک عرصہ تک اسے بھولا رہے اور جب وہ ناجائز بچہ وقت کی اذیتوں کو سہتا ہوا کسی مہربان کے سائے میں پل کر جوان ہو جائے، مشہور ہو جائے اور یہاں تک کہ سماج اور معاشرے کی اہم شخصیت بن جائے، اس وقت اس کے ماں باپ اسے ڈھونڈتے ہوئے آئیں اور اسے ایک کہانی سنائیں، ایسی کہانی سنانے والا کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن آپ کے شیر بیٹے کا باپ نہیں ہوسکتا۔ کہانی کچھ اور ہے''۔

''افضل''۔

رضیہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی لیکن افضل تک آتے آتے اس چیخ کا دم گھٹ گیا۔

''دیکھا ابا جان! میری بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس عورت کی چیخ میں ناجائز بچہ پیدا کرنے کی ہنک تو ہے لیکن اپنی کوکھ سے پیدا ہوئی اولاد کے لیے کوئی رحم، کوئی درد نہیں''۔

رضیہ کا چہرہ ندامت سے جھک گیا۔

''ابا جان! ویسے تو مجھے اب ان رشتوں کی نہ کوئی چاہت ہے اور نہ ضرورت۔ آپ میرے ماں باپ سب کچھ ہیں، میں نے آج تک آپ کا حکم نہیں ٹالا۔ آج بھی نہیں ٹالوں گا، لیکن آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتا ہوں کہ مجھے اصل کہانی، اصل واقعہ، اصل حقیقت بتائیے کہ کیا ہوا تھا؟ میری رگوں میں کس کا خون ہے؟ کن حالات سے مجبور ہو کر مجھے آپ کے سپرد کیا گیا، آپ اپنے شیر بیٹے کا یقین کریں، اگر آپ سے بھی میرے لیے کوئی گناہ ہوا ہوگا، کوئی خطا ہوئی ہوگی تو بھی میں اُف تک نہیں کروں گا، لیکن خدا کے لیے آپ مجھے آج اصل سچائی بتائیے''۔

جمال سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا...... ''میرے اور میرے شیر بیٹے افضل کے علاوہ جتنے لوگ ہیں، سب ہمیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں''، سب لوگ باہر چلے گئے۔

وحشی سعید نمبر

''بیٹا! میں جو کبھی تیرے نانا کا معمولی نوکر ہوا کرتا تھا اور آج ارب پتی ہوں، یہ سب کچھ تیرا صدقہ ہی تو ہے''، اور اس کے بعد اول تا آخر سارا واقعہ بیان کر کے جمال افضل سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔

افضل رنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگا، یکا یک وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور جمال سے کہا ''ابو سب کو بلایئے''۔

سب اندر آ گئے۔ افضل نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہنے لگا...... ''میرے ناجائز نانا نے اپنی جائز بیٹی کو بدنامی سے بچانے اور اس کی تقدیر سنوارنے کے لیے جمال صاحب کی بھی تقدیر سنوار دی اور مجھ سے پیچھا چھڑایا یا یوں کہیے کہ اپنے خاندان سے میرا نام و نشان تک مٹا دیا۔ جمال صاحب کے لیے میں لکی ثابت ہوا کہ وہ مجھے پاکر پل بھر میں مفلس سے دولت مند ہو گئے اور ان کے اس عقیدے نے کہ میرا ان کے لیے لکی ہونا انھیں اور بھی دولت مند بنا دے گا، مجھے زندہ رہنے کا ایک موقع عطا کیا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اگر ان کا عقیدہ رقیہ امی کی طرح ہوتا تو میرا کیا ہوتا؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کو کاروبار میں بہت فائدہ نہ بھی ہوتا اور وہ بہت زیادہ ترقی نہ بھی کرتے تو ان کی فطرت ایسی ہے کہ شاید مجھے اتنا ہی پیار ان سے ملتا جتنا کہ آج تک ملا۔ ہاں اگر کاروبار میں لگاتار نقصان ہوتا تو ان کا رویہ کیا ہوتا؟ ان کا عقیدہ کیا ہوتا؟ اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ مجھے جنم دے کر بھول جانے والی ناجائز ماں رضیہ کو بھی جب قدرت دوبارہ اولاد نہ دی اور یہ طے ہو گیا کہ وہ ہمیشہ اولاد کی نعمت سے محروم رہیں گی تو یکا یک انھیں اپنے اس ناجائز بیٹے کی یاد آئی اور وہ اس کے لیے پل بھر میں جائز ہو گیا۔

اس جائز ناجائز کے چکر نے میری زندگی ہی اجیرن کر دی۔ اب میں اس چکر کو یہیں ختم کر دوں گا۔ آپ لوگ اب زندگی میں کبھی بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

جمال ابو میرے سب کچھ ہیں، وہی میری ماں، وہی میرے باپ ہیں۔ ان کے علاوہ میں کسی رشتے کو نہیں جانتا۔ میں جائز ناجائز جو بھی ہوں، انھیں اولاد ہوں۔ انھیں کی کاوشوں سے میری زندگی میں فریدہ نام کی بہار آئی لیکن جائز ناجائز کے چکر نے اس کی محبت کو بھی مجھ سے دور کر دیا۔ اب سب لوگ چلے جایئے''، یہ کہہ کر افضل نے اپنا چہرا اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

لوگ افضل کے کمرے سے ندامت کے آنسو لے کر رخصت ہو گئے، جمال وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں فریدہ آ گئی۔ فریدہ کو دیکھ کر جمال کے دل میں کچھ خیال آیا اور اس نے فریدہ کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھایا اور کمرے سے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔

فریدہ نے افضل کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ افضل نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ افضل نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس کی آنکھوں سے ندامت اور سچی محبت ٹپک رہی تھی۔ افضل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے اپنا چہرا فریدہ کے سینے کے درمیان رکھ دیا۔ اسے کچھ سکون حاصل ہوا۔ فریدہ نے اس کے چہرے کو اپنے سینے میں زور سے دبایا اور اس کی آنکھوں کے آنسو اپنی آنکھوں میں جذب کر لیے۔

☆☆☆

وحشت محبت

﴿ ۱ ﴾

سفید فلک رسا عمارت پر اس نے سر اٹھا کر نظر ڈالی، شہر کا سب سے بہترین کالج، جہاں اب اسے داخلہ لینا تھا۔ گاؤں کا سیدھا سادہ نوجوان جس کی ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے والد زمیں دار تھے لیکن ان کی خواہش تھی کہ بیٹا بی.اے. پاس کر کے تحصیل دار بن جائے۔ اصغر چاہتا تھا کہ اس کی زندگی گاؤں کی سادگی اور سکون میں ہی بسر ہو جائے لیکن والد کی خواہش کے پیش نظر وہ مجبور ہو گیا۔ آج اس نے شہر میں قدم رکھا جہاں پیچیدہ زندگی تھی، قدم قدم پر فریب اور بے ایمانی کا ڈر تھا۔

وہ کالج کے بڑے میدان میں پہنچا جہاں کونے میں بائیں جانب بنے ایک کمرے کی کھڑکی سے داخلے کی فارم بانٹے جا رہے تھے۔ لڑکے لڑکیاں سب ایک ہی قطار میں کھڑے تھے۔ یہ منظر اصغر کے لیے نیا تھا۔ وہ قطار میں لگ گیا تھا۔ اس کے آگے ایک شہر کی تہذیب یافتہ لڑکی کھڑی تھی جس کے چست کپڑوں سے جسم کا عضو عضو پھوٹ رہا تھا اور دل میں ہوس کی چنگاری کو بھڑکا رہا تھا۔ لڑکی نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی نظروں سے حقارت جھانکنے لگی۔ پیچھے اصغر کھڑا تھا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی یہ گاؤں کا لڑکا ہے۔ اصغر نے ویسے تو کوٹ اور پینٹ پہن رکھا تھا لیکن وہ اس قدر ڈھیلا ڈھالا تھا کہ کرتے، پائجامے کا احساس دلاتا تھا۔

''مسٹر!'' لڑکی اس سے مخاطب ہو گئی۔

''جی......جی'' وہ تھوڑا گھبرا گیا۔

''آپ میری جگہ دیکھتے رہیں گے پلیز، میں ابھی آتی ہوں''۔

''جی ٹھیک ہے''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اصغر کے پیچھے قطار میں لگے ہوئے لڑکے نے کہا......"اس گاؤں والے کی قسمت بھی کیا قسمت ہے، کپڑا پہننے کا شعور نہیں ہے اور دیکھو اتنی خوبصورت لڑکی بات کرتی ہے۔ ابے......تو میرے پیچھے آ جا، تو تو کچھ کرے گا نہیں، میں کم سے کم اس کے جسم کے ابھرے ابھرے حصوں سے حسن کی گرمی حاصل کرلوں گا، چل پیچھے آ جا"۔

اس کے پیچھے کھڑے چار دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

"دیکھئے میں گاؤں سے ضرور آیا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس طرح بدتمیزی کریں"۔

"ابے! گاؤں کا جاہل ہو کر ہم شہر کے تہذیب یافتہ لوگوں کو بدتمیز کہتا ہے"۔

ایک زوردار چانٹا اصغر کے گال پر پڑا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔ اس کی غیرت نے جوش مارا۔

"شہر کے تہذیب دار لونڈے! تجھے اس بدتمیزی کی سزا ملنی چاہیے"۔

اصغر کے زوردار گھونسے سے وہ زمین پر دوہرا ہو کر تڑپنے لگا۔ اس کے دوستوں نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو چاروں ایک ساتھ اصغر سے بھڑ گئے لیکن اصغر کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں سے دھوکہ کھا گئے اور اس میں چھپے اس کے کسرتی بدن کو نہ دیکھ سکے۔ حالانکہ انھوں نے اصغر پر خوب وار کئے۔ اصغر کے ماتھے سے خون بھی نکلنے لگا لیکن وہ اس کے سہی وقت پر چلائے گئے زوردار گھونسوں کی تاب نہ لا سکے اور گرتے پڑتے اپنے ساتھی کو لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

"معاف کیجیے مجھے دیر ہوگئی، وہ لڑکے آپ سے لڑ کیوں رہے تھے، ارے آپ کے ماتھے سے تو خون بہہ رہا ہے"۔

"آپ کی وجہ سے یہ لڑائی ہوئی ہے" آگے قطار میں کھڑے لڑکے نے کہا۔

"میری وجہ سے......کیسے؟"

لڑکے نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''معاف کیجیے میں......''

''اس میں آپ کی کیا غلطی ہے، چھوڑیئے......''

''یہ رومال لیجیے اور اس سے ماتھے کا خون پونچھ لیجیے''۔ لڑکی نے کچھ اس ادا سے کہا کہ اصغر کے دل نے سمجھا کہ لڑکی کے دل میں اس کے پیار کا چراغ جل اٹھا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے رومال لیا اور اس سے ماتھے کا خون پونچھنے لگا۔ محبت کے رومال پر خون کے قطرے بڑے حسین لگ رہے تھے۔ اصغر محبت اور خون کی اس داستان کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کے فارم لینے کا نمبر آیا، اس کے بعد اصغر کا۔ لڑکی نے اصغر سے وداع لی اور چلی گئی۔



اس کے ماتھے پر اچھا خاصا زخم تھا۔ اسے فادر ولسن یاد آ گئے، جب وہ بچپن میں کبھی زخمی ہو جاتا تو فادر ولسن کے پاس چلا جاتا تھا جو اس کی مرہم پٹی کرنے کے بعد اسے مٹھائی بھی دیتے تھے۔

''دو روپے دیجیے''۔

''دو روپے''۔

''جی ہاں! مرہم پٹی کے دو روپے ہوئے''۔

''مہنگا شہر ہے''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے دو روپے ڈاکٹر کو دیئے اور بازار کی جانب چل پڑا۔ شہر کی ایک پرانی گلی میں بوسیدہ مکان کے اندر کرایہ کا ایک کمرہ، دس روپیہ ماہانہ۔ اگر اچھی رہائشی جگہ فلیٹ یا کمرہ لیتا تو کمرے کے لیے کم از کم سو روپے اور فلیٹ کے لیے کم از کم ۳۰۰ روپے ماہانہ درکار تھے۔ یہاں اس کی گاؤں کی عقل کام آئی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

"تعلیم تو ٹھیک ٹھاک کمرے میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں، عیش و آرام سے رہنے نہیں۔ دس روپئے ماہانہ تک کا کمرہ ٹھیک ہے۔ آخر پیسے بھی تو اپنے ہی بچیں گے"۔

آج صبح صبح ہی پچاس روپئے کا منی آرڈر آیا تھا۔ ۱۰۰ روپئے پہلے سے ہی اس کے پاس تھے۔ اس نے خود کھانا بنانے کے لیے اسٹو اور تیل اور کھانے پینے کا مہینے بھر کا راشن خریدا اور واپس کمرے کی اور روانہ ہوا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی گھر کے مالک مولانا بخش نے آواز دی......

"ارے آپ آگئے، اتنا سامان"۔

"جی مہینے بھر کا راشن ہے"۔

"بیٹا تم سے ایک التجا کرنی تھی، اگر تم اگلے مہینے کا کرایہ بھی ایڈوانس میں دے دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یکا یک کچھ ضرورت آن پڑی ہے"۔

مولانا بخش کے پاس دو مکان تھے جس میں سے ایک اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ دس کمروں والے اس مکان میں دس کرائے دار تھے اور یہی اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ بھی تھا۔

"کیا سوچنے لگے بیٹا"، مولانا بخش نے اپنی بوڑھی کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"جی......جی...... کچھ نہیں" اصغر کا خیال منتشر ہو گیا۔

"یہ لیجیے"۔

دس روپئے کا نوٹ ہاتھ میں لیتے ہی بوڑھے کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"بیٹا تم تھکے لگ رہے ہو، اپنے کمرے میں جاؤ، میں چائے بھجواتا ہوں"۔

دس فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا کمرہ، ایک طرف واحد بڑی کھڑکی لیکن روشنی اور ہوا کے لیے مناسب۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

اس نے دروازہ کھولا، باہر ایک لڑکی کھڑی تھی جو اٹھارہ انیس سال کی لگ رہی تھی۔

''چائے''۔

''جی شکریہ، آپ شاید مولانا صاحب کی......''

''بیوی ہوں''۔

''بیوی......''

ابھی کچھ دیر پہلے اس کے خیال نے جو لڑکی کا تصور باندھا تھا، وہ اب گھریلو مجبور کسی عورت کی شکل میں ڈھل گیا۔ چائے ختم ہوئی۔ وہ لڑکی نما مجبور کمسن گھریلو عورت پیالی لے کر چلی گئی۔

''شاید یہ روایت بھی شہر کی تہذیب میں شامل ہے''۔ اس نے دھیرے سے کہا اور آرام کرنے کے لیے پلنگ پر لیٹ گیا۔

شام کو پھر دروازے پر دستک ہوئی۔

''ارے یار تم''، سامنے اس کا پرانا دوست کھڑا تھا جو کہ تحصیل دار کا بیٹا تھا۔

''ہاں یار! میں گاؤں گیا تھا وہاں سنا کہ تم بھی پڑھنے کے لیے شہر آ گئے ہو، تمہارے والد سے تمہارا یہاں کا پتہ لے لیا۔ کالج میں تو ملاقات ہوتی رہے گی سوچا پہلے یہیں تم سے مل لوں''۔

''یار کتنے دنوں کے بعد ملے ہیں، یاد ہے جب گاؤں میں نمائش لگا کرتی تھی تو ہم کئی بار دیکھنے جایا کرتے تھے''، اصغر نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''یار اصغر! یہاں بھی نمائش لگی ہوئی ہے تو کیوں نہ ابھی وہیں چل کر پرانی یادوں کو تازہ کریں''۔

''ضرور''۔

وہ دونوں نمائش گاہ میں گھومتے رہے۔ اسٹوڈیو میں فوٹو کھنچوانے کے لیے بھی

گئے، وہیں اصغر کی نظر اس لڑکی پر پڑی جو اسے کالج میں ملی تھی۔ وہ فوٹو کھنچوا چکی تھی۔

''چلو رانی'' اس کی سہیلیوں نے کہا۔

''رانی، کیا خوبصورت نام ہے''۔

''کس سوچ میں پڑ گئے اصغر''۔

''اونہو...... کچھ نہیں یار......''



دوسرے دن صبح وہ کالج جانے کے لیے تیار ہوا۔ سرسوں اور اخروٹ کے مرکب سے بنا ہوا تیل سر پر لگایا جو اس کے والد نے خاص طور سے دیا تھا اور کہا تھا کہ بیٹا اس سے عمر بھر آدمی کے بال سفید نہیں ہوتے۔ بالوں میں کنگھا کر کے جیسے ہی دروازہ سے نکلا، مولانا بخش کی بیوی نصرت آتی ہوئی دکھائی پڑی۔

''آپ''۔

''آج آپ کے کالج کا پہلا دن ہے، میں شگون کے طور پر آپ کے لیے مٹھائی لائی ہوں، یہ لیجیے''۔

''شکریہ''

باہر آ کر اس نے رکشا لیا اور کالج آ گیا۔ وہاں ہوا میں رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ شوخ قہقہوں نے فضا میں زندگی بھر دی تھی۔ نئی طرز کے ملبوس اور اس کے درمیان اصغر کا پرانی وضع کا لباس۔ کل جو لڑکے اصغر سے پٹے تھے وہ بھی وہاں تھے۔ ایک بار وہ اصغر کو دیکھ کر اس کا مذاق اڑانے کے انداز میں مسکرائے لیکن اصغر سے نظریں ملتے ہی سہم گئے اور وہاں سے کھسک گئے۔ اصغر سمجھ گیا کہ پرانے طرز کے لباس کے ساتھ اس کا کالج میں گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ کلاس میں گیا جہاں لڑکے لڑکیاں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے یہ پسند نہیں آیا، وہ کونے والی کرسی پر تنہا بیٹھ گیا۔

تاریخ کے پروفیسر نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے حالات اور واقعات پر روشنی ڈالی۔ گھنٹہ ختم ہوا تو وہ بھی باہر آ گیا۔ اسے بچپن سے ہی تنہائی پسند تھی، اس لیے کالج کے باغ میں ایک درخت کے نیچے تنہا بیٹھ کر پڑھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔

''ہیلو!'' یہ رانی تھی۔

''رانی...... آپ''۔

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم اور وہ بھی گھر کا''۔

''گھر کا......''

''جی ہاں...... میرا اصلی نام تو صنوبر ہے۔ اچھا آپ نے کسی سہیلی کو میرا گھر والا نام پکارتے ہوئے سن لیا ہوگا''۔

''جی...... جی...... ہاں''۔

''یہ قلم تو بہت خوبصورت ہے، کہاں سے لیا؟''

''کل نمائش گاہ سے''۔

''کل تو میں بھی وہاں گئی تھی، لیکن مجھے یہ دکھائی نہیں دیا، شاید ختم ہو گیا ہوگا''۔

''اگر یہ آپ کو اتنا پسند ہے تو آپ اسے رکھ لیجیے''۔

''نہیں...... نہیں، ایسے کیسے''۔

''کیوں نہیں...... کبھی آپ کی کوئی چیز مجھے اچھی لگی تو وہ میں آپ سے لے لونگا''۔

''اچھا......'' صنوبر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا......

''شکریہ، میں آپ کو پسند آنے والی چیز کی منتظر رہوں گی''، یہ کہہ کر وہ شرماتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔



وحشی سعید نمبر

﴿۴﴾

''آ گئی بیٹی، بڑی خوش نظر آ رہی ہو''۔

''ہاں ماں، آج میں نے اپنے کالج کے ایک لڑکے کو بیوقوف بنایا اور اس سے یہ قلم اڑا لیا''۔

''بیٹی یہ اچھی بات نہیں''۔

''چھوڑو ماں......ہم کون سے اچھے ہیں''، صنوبر کی بات اس کی ماں کے دل پر لگی۔

''تو تم کچھ بھی نہیں بھولی''۔

''ماں زندگی اور اس کے واقعات بھولنے والے نہیں ہوتے۔ مجھے سب یاد ہے، میرا بچپن، تمہاری جوانی؛ میری جوانی، تمہارا بڑھاپا......سب کچھ''۔

ماں ماضی کے اوراق میں کھو گئی۔

طوائف کی بیٹی طوائف خانے کو روشن کر رہی تھی۔

ہر دن گھنگھروؤں کی جھنکار اور ہر رات نئے نئے مردانہ جسموں کا لطف، لیکن وہ کسی ایک کی ہونا چاہتی تھی۔ عورت پن کا یہی تقاضا تھا۔ وہ اس گندھے ماحول سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ آخر کار اس کی دعا نے اثر دکھایا۔ نواب تیمور جنگ ایک دن اس کے پاس آئے اور اس کے سلیقہ مند حسن سے متاثر ہوئے۔

''بولو میری جان کیا چاہیے؟''

''مجھے جو چاہیے وہ آپ مجھے نہیں دے سکتے، نواب صاحب''۔

''مانگ کر دیکھو''۔

''میں صرف آپ کی ہو کر رہنا چاہتی ہوں، کسی بھی طریقے سے۔ میرے جسم کے عضو عضو پر آپ کا حق ہوگا۔ یہ بھری جوانی صرف آپ کی ہوگی، بس مجھے اس زندگی سے دور لے جایئے''۔

وحشی سعید نمبر

نواب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

بولی لگائی گئی۔نواب صاحب نے پوری قیمت ادا کی اور صنوبر کی ماں اس کی داشتہ بن کر زندگی کے دن گزارنے لگی۔نواب نے کچھ جائداد بھی اس کے نام کردی۔ بعد میں جب صنوبر نے جنم لیا تو بھی نواب صاحب اسے بیوی نہ بنا سکے، وہ داشتہ ہی رہی۔لیکن اسے خوشی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم اور اچھی زندگی دے سکتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد نواب صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔ان کی طرف سے آنے والی آمدنی بند ہوگئی لیکن جائداد کے کرائے سے بھی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔

''کہاں کھوگئی ماں......بھوک لگی ہے، کھانا دو''۔بوڑھی چونک پڑی......

''ہاں......ہاں......بیٹی......ابھی لاتی ہوں''۔



آج وہ بہت خوش تھا۔اس کے نئے کپڑے سل کر آگئے تھے۔اس نے ایک پینٹ شرٹ نکالا اور زیب تن کیا۔

''واقعی میں اس نئے طرز کے لباس میں بہت خوبصورت لگتا ہوں''۔

''میں اندر آسکتی ہوں؟''

''ارے تم......آؤ......آؤ''۔روز روز کی ملاقات نے نصرت اور اصغر کے درمیان بے تکلفی پیدا کردی تھی۔

''یہ سج دھج کر کہاں جا رہے ہو''۔

''کالج ہی جا رہا ہوں، تم کیا کہیں باہر سے آرہی ہو''۔

''ہاں......میں درگاہ گئی تھی منت ماننے''۔

''کیسی منت؟''

"وہ......وہ......مولانا صاحب مجھ سے ایک بچہ چاہتے ہیں"، یہ کہہ کر وہ شرماتے ہوئے بھاگ گئی۔

"مولانا صاحب کو اس عمر میں بچہ چاہیے"، اصغر زیرِ لب مسکرایا اور کالج کے لیے چل پڑا۔

"آج آپ بہت خوبصورت لگ رہے ہیں"۔

"آپ بھی ان کپڑوں کے اندر خوبصورتی تلاش کرتی ہیں"۔

"خوبصورتی وہ جس کو دیکھا جا سکے، محسوس کیا جا سکے، اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے، زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکے، جس سے لطف اندوز ہوا جا سکے، جیسے دولت"۔

"دولت"۔

"ہاں دولت، جس سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ جس کی ضرورت ساری ضرورتوں سے بڑھ کر ہے اور جو ساری ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے"۔

اصغر اس کی باتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔



چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ عظمت بھی اپنے پہاڑی والے بنگلے پر جانے والا تھا جو شہر سے پانچ میل دور تھا۔ اصغر اپنے گاؤں جانے والا تھا۔ صنوبر چاہتی تھی کہ کوئی لڑکا یہیں رک جائے جس کے ساتھ وہ ہوٹل کے کھانے اور سینما ہال کا لطف لے سکے، لیکن سب نے کچھ نہ کچھ پروگرام بنایا تھا۔ وہ مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹی تو ماں کو بستر پر پایا۔

"کیا ہوا ماں؟"

"کچھ نہیں بیٹی، ذرا چکر آ گیا"۔

"ذرا چکر نہیں بلڈ پریشر بڑھ گیا ہوگا، میں ڈاکٹر کو لاتی ہوں"۔

وحشی سعید نمبر

وہ ڈاکٹر کو لینے گئی تو راستے میں اسے عظمت ملا۔ صنوبر کی بات سن کر وہ بھی ساتھ چل پڑا۔

لیکن ڈاکٹر آتے آتے بہت دیر ہو چکی تھی۔ ماں دنیائے فانی سے کوچ کر چکی تھی۔

''اب میرا کیا ہوگا ماں؟'' ''اتنی بڑی دنیا میں تنہا کس کے سہارے زندہ رہوں گی''، وہ عظمت کے پہلو میں سمٹ کر رونے لگی۔

عظمت تدفین کا کام مکمل کروانے کے بعد صنوبر کے پاس واپس آیا، وہ اب تک رو رہی تھی۔

''عظمت میرا کیا ہوگا، میں اکیلے یہاں کیسے رہوں گی؟''

''اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں حالانکہ یہ وقت اس قسم کی باتوں کا نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے''۔

''کیا؟''

''میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں، جب سے تمہیں دیکھا ہے، تم پر مرتا ہوں لیکن تمہارا رجحان اصغر کی جانب دیکھ کر میں تم سے پیار کا اظہار نہیں کر پایا۔ اگر تمہارے اور اصغر کے درمیان کچھ نہ ہو تو میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

صنوبر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عظمت امیر باپ کا بیٹا تھا اس کے پاس سب کچھ تھا جس کی صنوبر کو خواہش تھی۔

''اصغر صرف میرا معصوم دوست ہے، کیا تم سچ مچ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''بالکل''۔

''کب؟''

''ابھی، اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلو، ہم امی ابو کے پاس چلیں گے اور ان سے اجازت لے کر شادی کر لیں گے''۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''لیکن اگر تمہارے امی ابو......''

''تم گھبراؤ نہیں، امی ابو میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے''۔

''ٹھیک ہے میں کپڑے لے کر آتی ہوں''۔

اصغر نے جب دو دن تک صنوبر کو کالج میں نہیں دیکھا تو اس کے گھر گیا۔ وہاں تالا لگا تھا۔ پاس کے دوکاندار سے دریافت کیا تو جواب ملا...... ''ارے صاحب، بڑی بے غیرت لڑکی تھی، پرسوں ہی اس کی ماں مری اور جس لڑکے نے اس کی ماں کی تدفین میں مدد کی، اسی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے اسی دن یہاں سے چلی گئی۔ ایک گھنٹہ بھی ماں کا غم نہیں منایا اور خوشی خوشی اس امیر زادے کی آغوش میں سمٹ گئی''۔

''کہاں گئی؟''

''یہ تو معلوم نہیں، اپنی ساری جائداد بھی اس نے فروخت کر دی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی''۔

اصغر ٹوٹ گیا، بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے کی جانب آ رہا تھا کہ راستے میں ایک شرابی ملا جو دنیا سے بے نیاز اپنی دھن میں مست لڑکھڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

''شاید شراب اس وقت مجھے سہارا دے''۔

وہ بار میں گیا اور پوری بوتل پی ڈالی۔ جب کچھ سرور چڑھا تو اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہوا۔ کمرے پر آتے آتے اس پر نشہ پوری طرح طاری ہو چکا تھا۔

''ارے تم لڑکھڑا کیوں رہے ہو؟'' نصرت نے اسے سہارا دیا اور اس کے کمرے لے گئی۔

''تم نے شراب پی، شکر کرو کہ مولانا صاحب گھر میں نہیں ہیں ورنہ بہت برا ہوتا''۔

''جو میرے ساتھ ہوا ہے اس سے برا کیا ہوتا''، یہ کہتے ہوئے وہ پلنگ پر گر پڑا۔ نصرت بھی اس کے اوپر گر پڑی، ہوس کے جذبے جاگ اٹھے۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''تم بہت اچھے ہو، جوان ہو، خوبصورت ہو، کسی بھی عورت کی جنسی خواہش کو پورا کر سکتے ہو''، یہ کہتے ہوئے اس نے اصغر کو اپنی بانہوں میں کھینچ لیا۔ اصغر کے لب جب اس کے گداز سینے ٹکرائے تو وہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ شراب اور شباب کے امتزاج نے ایک نئی عبارت لکھ ڈالی۔

جب اصغر کو ہوش آیا تو اس نے خود کو بستر پر برہنہ پایا۔ پاس ہی نصرت بھی برہنہ پڑی تھی۔

''یہ کیا...... یہ سب کیا ہو گیا......''، نصرت کی آنکھ بھی کھل گئی، اس نے ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا، مولانا صاحب کی دو دن کی گھر سے دوری نے مجھے بھرپور مردانگی کا لطف عطا کیا''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اصغر کے ہونٹوں کو چوم لیا اور اپنے برہنہ سینے کو اس کے برہنہ سینے پر رکھ دیا۔ ہوس کی آگ ایک بار پھر جل اٹھی۔

اصغر نے گاؤں جانے کے لیے اپنا سوٹ کیس اٹھایا تو نصرت نے دبی زبان سے سوال کیا...... ''واپس کب آؤ گے؟''

''چھٹیاں ختم ہونے کے بعد''۔

نصرت مایوسی سے اس سے لپٹ گئی اور اس کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے بولی......

''یہ لو مٹھائی، شگون ہے...... میں انتظار کروں گی''۔

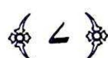
اصغر جب گاؤں واپس آیا تو والد کو بیمار پایا۔ گاؤں میں سہی علاج نہ ہونے سے بیماری آخری مرحلے میں تھی۔ باپ موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''آپ نے مجھے اپنی بیماری کے متعلق خط کیوں نہیں لکھا''۔

''بیٹا! اس سے تیری پڑھائی متاثر ہوتی، میری دلی خواہش تھی کہ تجھے تحصیل دار کی وردی میں دیکھوں، لیکن شاید زندگی باقی نہیں ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو بیٹے کہ تم تحصیل دار

ضرور بنو گے تا کہ میرا جسم نہیں تو میری روح ضرور تمہیں دیکھ سکے کہ میرے بیٹے نے اپنے باپ کی خواہش کو پورا کیا''۔

اصغر سے وعدہ لے کر اس کا باپ دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اب اصغر کے پاس زندگی کا ایک مقصد تھا، تحصیل دار بننا۔ باپ کی خواہش کو پورا کرنا، وہ واپس شہر لوٹ آیا۔



عظمت جب صنوبر کو لے کر گھر آیا تو یہاں معاملہ بالکل اس کی سوچ کے برعکس نکلا۔ اس کے والد اور والدہ نے اختلاف کا طوفان کھڑا کر دیا۔ عظمت ان کی کروڑوں کی جائداد کا اکیلا وارث تھا۔ اس کی شادی اور آئندہ کی زندگی کے متعلق ان کے کئی منصوبے تھے، جو دھرے کے دھرے رہ گئے۔ عظمت صنوبر کے حسن میں اتنا دیوانہ ہو گیا کہ گھر بار زمین جائداد سب چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔ صنوبر بھی جانتی تھی کہ آخر کار والدین کو عظمت کے آگے جھکنا پڑے گا۔ اس لیے وہ بھی ہر طریقے سے عظمت کا ساتھ دے رہی تھی۔ آخر کار ماں باپ کو ہار ماننی پڑی اور دونوں کا نکاح ہو گیا۔ لیکن صنوبر کو کبھی اپنے ساس سسر کا پیار نہیں ملا۔ اس نے بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ آخر بوڑھی بوڑھے کے دن ہی کتنے ہیں۔ آج مرے، کل دوسرا دن۔ اسی امید پر وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ عظمت کی ماں اپنی بوڑھی سہیلیوں میں اکثر کہتی۔

''میں کہتی ہوں کہ اس کا خاندان ہی ایسا ہے جو بھولے بھالے نوجوانوں کو پھنسانے میں ماہر ہے۔ ورنہ کوئی شریف لڑکی اس طرح کسی کے ساتھ آتی ہے۔ وہ معصوم اور مجبور نہیں ہے بلکہ میرے سفید بال کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے گھاٹ گھاٹ کا

پانی پیا ہے“۔

بات بھی کچھ سہی تھی۔ صنوبر کو اکثر اصغر کا خیال آتا رہتا۔ اس کی معصوم مسکراہٹ۔ چونکہ عظمت اسے مل چکا تھا۔ دولت اس کے پاس تھی اس لیے اب اس کا ذہن ادھوری خواہشوں کی تکمیل کا راستہ تلاش کرنے لگا تھا۔ اصغر کی یادیں ہمہ وقت اس کا تعاقت کرتی رہتی تھیں۔

عظمت کاروبار کے سلسلے میں ایک ماہ سے زاید دنوں کے لیے سفر پر جارہا تھا۔ اس نے صنوبر کو بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔

”میری جان۔ مجبوری ہے۔ تم فکر مت کرو۔ کام ختم ہوتے ہی مین فوراً واپس آجاؤں گا۔“

”میں تم کو ایک اچھی خبر سنانے والی تھی لیکن اب تم مجھ سے دور ہورہے ہو، اس لیے......“۔

”کون سی خبر۔“

صنوبر شرما گئی..... ”وہ تم آنا تب بتاؤں گی۔“

”تمہیں میری قسم۔“

صنوبر نے اپنا چہرا اس کے سینے میں چھپاتے ہوئے کہا۔ ”تم باپ بننے والے ہو۔“

”کیا....“ عظمت خوشی سے جھوم اٹھا۔

”دیکھو میری جان۔ تم اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔ واپس آنے کے بعد میں تمہارا خیال رکھوں گا۔“

جب عظمت کے ماں باپ نے یہ خبر سنی تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ اس کی ماں چیخنے لگی۔

”پتہ نہیں کس کا پاپ ہے جو ہمارے خاندان کے گلے مڑھ رہی ہے۔“

وحشی سعید نمبر

عظمت کے جانے کے بعد اس کے ماں باپ کے برتاؤ میں اور تلخی آ گئی لیکن صنوبر کو اب اس کی کچھ پرواہ نہیں تھی۔ اب اس کا بال بھی بانکا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اب اس گھر کا نیا مالک آ رہا تھا۔

ایک ماہ بعد عظمت کا تار آیا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی صنوبر خاص طور پر اپنا خیال رکھنے لگی۔ ایک دن اچانک خبر آئی کہ جس ریل گاڑی سے عظمت واپس آ رہا تھا، وہ حادثے کا شکار ہوگئی اور مرنے والوں کی فہرست میں عظمت کا بھی نام تھا۔ صنوبر کی دنیا اجڑ گئی۔ کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔ ساس سسر کے ظلم اور بڑھ گئے۔ وہ اسے گھر سے نکالنا چاہتے تھے۔ صنوبر نے اپنے پیٹ میں پل رہے عظمت کے بچے کی دہائی دی کہ وہ اس گھر کا چشم و چراغ ہے لیکن سب بے سود۔ اس کی ساس نے چیختے ہوئے کہا۔

''پہلے تو اس گھر کے چشم و چراغ کو پھنسایا، پھر اسے ڈائن بن کر کھا گئی اور اب نہ جانے کس کے پاپ کو اس گھر کا چشم و چراغ کہہ رہی ہے۔ اپنا سامان باندھ اور اپنی پاپ کی گٹھری کو لے کر گھر سے نکل۔ ہم سے ترا کوئی واسطہ نہیں۔''



نصرت اس کے کمرے میں داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں سیب تھا۔ وہ اصغر کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''کیوں مسکرا رہی ہو۔''

''میں سیب کھا رہی ہوں۔ بہت اچھا ہے۔''

''اچھا بہت میٹھا ہے۔''

''نہیں بہت کھٹا لیکن بڑا مزیدار۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شرما کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

وحشی سعید نمبر

اصغر بڑبڑایا۔ ''کھٹا اور بڑا مزیدار۔''

مولانا بخش اس کے کمرے میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وارد ہوئے۔

''کیا بات ہے چاچا۔ بڑے خوش لگ رہے ہو۔''

''ہاں بیٹا...... درگاہ والے بابا نے منت پوری کردی۔ میں باپ بننے والا ہوں۔''

''اچھا......''

''لو مٹھائی کھاؤ اور اپنے کالج کے دوستوں کو بھی کھلانا۔''

''اصغر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بچہ...... نہیں......''

اس کے ضمیر نے اسے اضطراب میں مبتلا کردیا۔ وہ کالج نہ جاسکا۔ اس نے ضمیر کے سوالات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ دن رات ندامت کے سمندر میں گم رہنے لگا۔

''یار کیا بات ہے۔ اچھے تو ہو۔ چار دن سے اسکول نہیں آئے۔ ارے تمہیں تو بخار ہے چلو ڈاکٹر کے پاس۔'' تحصیل دار کے بیٹے نے آتے ہی اسے اٹھایا۔

''کچھ نہیں یار ہلکا بخار ہے۔''

''ایسے کیسے، چلو میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''آپ اپنی صحت کا خیال رکھئے۔ لگتا ہے کہ کوئی غم آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ غموں کو چھوڑیے، خوش رہا کیجیے، میں دوائیں دے دیتا ہوں۔''

''تمہیں کون سا غم لگ گیا یار کہیں صنوبر کا غم......''

''نہیں یار..... بس یہی فکر لگی رہتی ہے کہ امتحان میں اول آؤں گا یا نہیں۔''

''چھوڑو یار...... تم محنت کر رہے ہو۔ ضرور اول آؤ گے۔ میں تو سمجھا کہ تمہیں صنوبر کے عشق کا روگ بیمار کیے ہوئے ہے۔''

وحشی سعید نمبر

''صنوبر.....'' اصغر کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی جو تحصیل دار کے بیٹے نے نہیں سنی۔

اس سے وداع لے کر وہ دوائیوں سمیت کبھی نصرت اور کبھی صنوبر کے خیالوں میں گم کمرے کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

''صنوبر تم..... یہاں..... اس وقت..... میں نے سنا تھا تمہاری شادی ہو گئی۔ تمہارے شوہر کہاں ہیں۔''

''میرے شوہر ریل کے حادثے میں فوت ہو گئے۔ ساس سسر نے گھر سے نکال دیا۔ اب میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔''

''ایسا مت کہو۔ اندر آؤ....'' اصغر کی نظروں میں وہی معصومیت تھی لیکن صنوبر نے اس میں اپنے ذہن کے عناصر تلاش کر لیے۔

''میں حاملہ ہوں.....''

''حاملہ..... پھر تو تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ چلو بستر پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔''

صنوبر پلنگ پر آرام کر رہی تھی۔ اس کا ذہن بار بار اپنی بدحالی کی اور جا رہا تھا۔

''میں جہاں سے چلی تھی، وہیں پھر پہنچ گئی۔ لیکن اب اکیلی نہیں ہوں۔ یہ بچہ.....اس کی اور میری زندگی....'' یکا یک اسے اپنی ماں اور نواب تیمور جنگ کا رشتہ یاد آ گیا۔

''اصغر اب بھی مجھے چاہتا ہے۔ کنوارا بھی ہے۔ اس سے اچھا سہارا نہیں ملے گا۔''

اصغر کھانا لے کر واپس آیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد صنوبر پلنگ پر لیٹ گئی اور اصغر زمین میں اپنا بستر لگانے لگا۔ صنوبر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو۔''

وحشی سعید نمبر

''دیکھ رہی ہوں اس چہرے کی معصومیت، ان نظروں میں اپنے لیے وہی محبت۔''

اصغر اپنے بستر سے اٹھ کر صنوبر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ صنوبر نے اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیے اور اس سے لپٹ گئی۔

''تمہارے ہونٹ جل رہے ہیں بدن بھی تپ رہا ہے.....تم نے دوالی۔''

''ہاں لائی ہیں، وہ رکھی ہیں۔''

''تو ابھی کھا کر سو جاؤ......کل میں اپنی نئی زندگی کے متعلق تم سے بات کروں گی۔''

اصغر صبح صنوبر اور اس کا سامان ساتھ لے کر ایک ہوٹل میں گیا۔

''مجھے آپ کے ہوٹل کا ایک کمرہ ۵۔۴ مہینوں کے لیے چاہیے۔''

''سر.....دوسو روپئے مہینے کا کمرہ مل سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے یہ لیجیے دو ماہ کا ایڈوانس۔۴۰۰ روپئے۔''

''آپ اپنا نام پتہ لکھوا دیجیے۔''

نام پتہ لکھوانے کے بعد اس نے چابی لی۔ بیرے نے سامان اٹھایا اور وہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''تم یہاں آرام سے رہو بچے کی ولادت ہونے تک۔ تمہارا کھانا بھی میں یہیں لے آیا کروں گا۔''

''تم کتنے اچھے ہو۔ میرا ابھی تمہارے سوا کون سہارا ہے۔ اب میں تمہاری ہوں۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔''

اصغر کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اچھا اب تم آرام کرو۔ میں دوپہر میں کھانا لے کر آؤں گا۔''

دن گزرتے گئے۔ صنوبر اور نصرت کے پیٹ بھی بڑھتے گئے۔ آخر کار دونوں کو ایک ساتھ ہی نرسنگ ہوم میں داخل ہونا پڑا۔

وحشی سعید نمبر

''مبارک ہو بیٹا..... میں باپ بن گیا..... نصرت نے میرے بیٹے کو جنم دیا ہے۔''

''آپ کے بیٹے کو.....'' اصغر کے دماغ نے جھٹکا کھایا۔''

''ہاں بیٹا..... اس لڑکی کا کیا ہوا جو بیوہ ہے اور تم نے اسے ہوٹل میں رکھا تھا۔''

''ایک دو دن میں اس کی بھی ڈیلیوری ہو جائے گی۔''

''اچھا جب وقت ملے تو بچے کو دیکھنے ضرور آنا۔ نصرت ابھی ایک ہفتہ یہیں رہے گی۔''

صنوبر کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ وہ رو رہی تھی۔ اصغر اسے دلاسے دے رہا تھا۔ یکا یک صنوبر کے دماغ میں آیا۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ اب وہ آزاد ہے اور نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کر سکتی ہے۔

مولانا بخش اصغر کو زبردستی اپنے بیٹے کو دکھانے کے لیے لے گیا۔ نصرت نے جب اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

''دیکھو اصغر ہمارا بیٹا۔ کیوں نصرت۔''

''جی ہاں''، نصرت نے اصغر کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارا بیٹا۔''

صنوبر ٹھیک ہو گئی۔ اصغر نے ہوٹل چھوڑ دیا اور مولانا بخش کے یہاں اپنے ساتھ والا ایک اور کمرہ کرائے پر لے لیا اور ان کی اجازت سے صنوبر اس کمرے میں رہنے کے لیے آ گئی۔

اصغر کی صحت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔ ایک دن تحصیلدار کا بیٹا اس سے ملنے آیا۔

''ارے تمہاری طبیعت خراب ہے اور تم نے مجھے خبر تک نہیں کی۔ ارے صنوبر تم یہاں کیسے۔ اور تم یکا یک کالج سے کہاں غائب ہو گئی تھی۔''

''میں اپنے ماما کے یہاں چلی گئی تھی۔ آج ہی آئی ہوں۔ اصغر کی طبیعت کے

بارے میں سنا تو اس کا حال چال پوچھنے چلی آئی۔ اب جب تک یہ ٹھیک نہیں ہو جاتا اس کے ساتھ والے کمرے میں ہی رہوں گی۔'' صنوبر کے جھوٹ پر اصغر اور تحصیلدار کا لڑکا دونوں مسکرا دیے۔

''یار تم دوائیں وقت پر لیا کرو۔ ابھی کون سی دوا لینی ہے۔''

''وہ بخار کے ساتھ ساتھ نیند والی۔''

دوا کھا کر اصغر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

''اصغر سو گیا ہے، چلو کہیں باہر گھوم آئیں'' تحصیلدار کے بیٹے نے صنوبر سے کہا۔

''چلو''۔ دونوں ایک ہوٹل کے رستوران میں پہنچے۔

''صنوبر تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک امیر باپ کا بیٹا ہوں۔ میرے والد تحصیل دار ہیں اور آئندہ میرا بھی تحصیل دار بننے کا رادہ ہے۔''

''ہاں..... ہاں۔''

''اچھا ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم اصغر سے پیار کرتی ہو۔''

''نہیں تو...... کیوں.....؟''

''میرا بھی یہی خیال تھا ورنہ تم اسے چھوڑ کر اتنے لمبے عرصہ کے لیے نہ چلی جاتی۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔ میرے پاس دولت ہے۔ خوبصورتی ہے۔ تمہیں چاہنے والا دل ہے۔''

صنوبر سوچ میں پڑ گئی۔ شاندار مستقبل سامنے تھا۔ اسے ایک پل اصغر کا خیال آیا لیکن..... اس نے اپنا ہاتھ تحصیل دار کے بیٹے کے ہاتھ پر رکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ تحصیل دار کا بیٹا خوش ہو گیا اور اس نے صنوبر کو اپنی بانہوں میں کس لیا۔ صنوبر نے بھی بہت دنوں بعد کسی مرد کے جسم کا احساس پایا تو وہ بھی بے قابو ہو گئی۔

اصغر جب سو کر اٹھا تو اس کا دوست اور صنوبر نہیں تھے۔ اس نے صنوبر کو دوسرے

وحشی سعید نمبر

کمرے میں دیکھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ ہی رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مکان کے پاس نظر آئے۔ وہاں رک کر اس کے دوست نے صنوبر کے ہونٹوں پر بھرپور الوداعی بوسہ دیا اور چلا گیا۔

''ارے تم سو کر اٹھ گئے۔ اب طبیعت کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کہاں گئی تھی۔''

''وہ تمہارا دوست ہے نا، اسی کے ساتھ تھوڑا باہر کی سیر کو گئی تھی۔ سوچا اتنی دیر تم بھی آرام کر لو گے۔ تمہارا دوست بہت اچھا لڑکا ہے۔ امیر باپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اس میں گھمنڈ نہیں ہے۔''

''بات دوستی تک ہی رہی یا پھر تمہارے اور اس کے رشتے میں کچھ اضافہ بھی ہوا۔'' اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس قسم کا مذاق بالکل پسند نہیں۔ اگر تم نے مجھ پر شک کیا تو میں تمہارے دوست کے ساتھ ہی شادی کر کے تم سے دور چلی جاؤں گی۔''

اصغر معصومیت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

اصغر کی بیماری روز بہ روز بڑھتی رہی۔ ایک دن سڑک پار کرتے ہوئے وہ چکرا کر گر پڑا۔ راہگیروں نے اسے اسپتال پہنچایا۔

جب اصغر شام تک گھر نہیں آیا تو صنوبر کے دل میں عجیب عجیب خیال آنے لگے۔ انہیں کے درمیان سے یہ خیال بھی نکلا کہ موقع اچھا ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ کیوں نہ یہاں سے بھاگ جایا جائے اور تحصیل دار کے بیٹے کی ہو کر رہا جائے۔

تحصیل دار کا بیٹا دروازہ کھولتے ہی چونک پڑا...... ''ارے صنوبر تم یہاں۔''

''ہاں۔ آج اصغر نے تمہیں بہت برا بھلا کہا۔ ہمارے رشتوں پر الزام لگایا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہوا اور میں اس کو چھوڑ کر تمہارے پاس چلی آئی۔''

''بہت اچھا کیا۔اب ہم ساتھ رہیں گے۔میں تین چار دن میں ہی تم سے شادی کرلوں گا۔''

''سچ۔''

''بالکل۔میں تو آج ابھی تم سے شادی کرتا لیکن دوستوں یاروں، ماں باپ کو بتانے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے۔''

صنوبر اس سے لپٹ گئی۔وہ صنوبر کو پاگلوں کی طرح چومنے لگا۔ہوس کی آگ تیز ہوگئی۔دونوں طوفان میں بہہ گئے۔جب جسم کی آگ بجھ گئی تو صنوبر نے کہا۔

''یہ ہم اچھا نہیں کر رہے ہیں۔شادی سے پہلے۔''

''میری جان شادی تو ایک رسم ہے اصل تو دل سے ماننے والی بات ہے۔سچ بتاؤ کیا تم مجھے دل سے اپنا شوہر قبول نہیں کر چکی ہو۔''

صنوبر اس کے گلے لگ گئی۔

''ہم پرسوں ہی شادی کرلیں گے۔کل تمہیں میرے ساتھ ایک پارٹی میں چلنا ہے جہاں میرے دوست بھی ہوں گے۔وہاں سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور شادی میں شرکت کے لیے سب کو دعوت بھی دے دیں گے۔''

پارٹی بہت شاندار تھی.....دس آدمی لیکن کوئی لڑکی نہیں۔صنوبر اکیلی لڑکی تھی جو اصغر کے ساتھ تھی۔اصغر نے سب کو اس سے ملایا۔شادی کی دعوت دی۔اس پر ایک دوست نے خوش ہوکر کہا۔

''یار تو بہت خوش قسمت ہے کہ جنت کی حور تری آغوش میں ہے۔کاش ہمیں بھی ایسی ہی حور ملتی۔چل اسی خوشی میں دو گھونٹ مار لے اور بھابھی کو بھی دو گھونٹ پلا۔''

نہ.....نہ.....کرتے کرتے بھی زبردستی صنوبر کے منہ میں جام کے قطرے ڈال دیے گئے۔اس پر نشہ طاری ہوگیا۔

وحشی سعید نمبر

''چلو بھائی مال تیار ہے۔اب دھن نکالو۔''

سب لوگ اس کو پیسے دینے لگے،اس کے بعد آپس میں تکرار ہونے لگی۔

''پہلے میں جاؤں گا۔میں نے تین ہزار دیے ہیں۔''

''نہیں سب سے پہلے میں جاؤں گا۔ میں نے سب سے زیادہ پانچ ہزار دیے ہیں۔''

پانچ ہزار والا سرور میں ڈوبی صنوبر کو اٹھا کر ایک کمرے میں لے گیا۔ باقی اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔تحصیل دار کا بیٹا نوٹ گننے میں مصروف تھا۔

جب صنوبر کا نشہ ٹوٹا تو اس نے خود کو ایک نیم اندھیری کوٹھری میں برہنہ پایا۔جسم کا ایک ایک عضو ٹوٹ رہا تھا۔پورا واقعہ یاد کر کے وہ زار وقطار رونے لگی۔خوب رو کر جی ہلکا کرنے کے بعد وہ تڑپتی ہوئی اٹھی اور کسی طرح کپڑے پہنے،آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ دروازے تک آئی ہی تھی کہ مولانا بخش اس کے سامنے آ گیا۔

''آپ۔''

''ہاں میں،اب تم یہاں سے نہیں جا سکتی۔''

''کیوں۔''

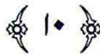
''تمہیں میں نے خرید لیا ہے۔اب تم یہیں رہو گی اور میرے گراہکوں کو خوش کرو گی۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ماری جاؤ گی۔زندہ رہنا ہے تو اس چکلا گھر کو چلاتی رہو۔''

''چکلا گھر۔آپ چکلا چلاتے ہیں۔''

''ہاں۔لیکن یہ بات کوئی نہیں جانتا اور جس نے جاننے کے بعد دوسرے کو بتانے کی کوشش کی وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔''

مولانا بخش کا یہ روپ صنوبر نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا۔ وہ خوف کے

مارے پیچھے ہٹ گئی۔



اصغر کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال کے نرم بستر پر پایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ بہت کمزوری ہے۔ کچھ دن ٹھیک ہونے میں لگیں گے۔ تب تک آپ کو یہیں رہنا پڑے گا۔ ہاں صحت جلدی اچھی ہو جائے اس کے لیے روز صبح سمندر کنارے سیر کو ضرور جائیں تا کہ تازہ ہوا آپ کو فائدہ پہنچائے۔''

اصغر صبح سیر کو جانے لگا۔ طبیعت ٹھیک ہو رہی تھی۔ ایک دن وہ سیر کر رہا تھا کہ ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے قدموں پر گر پڑی۔

''مجھے بچالو، مجھے بچالو۔''

اصغر چونک پڑا۔ آواز مانوس تھی۔ اس نے جب اس کا چہرا دیکھا تو ہوش گم ہو گئے۔ صنوبر سے اس طرح ملنے کی اسے خواب میں بھی امید نہ تھی۔ صنوبر نے جب اسے دیکھا تو بھاگنے لگی۔

''صنوبر تمہارا یہ حال...... کیسے۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''مجھے مولانا بخش سے بچاؤ۔ وہ میرے پیچھے آرہا ہے۔ وہ چکلا چلاتا ہے۔ لڑکیوں کو خریدتا اور بیچتا ہے۔ آج بڑی مشکل سے میں اس کی قید سے بھاگ نکلی لیکن وہ پیچھے آرہا ہے۔ مجھے بچالو، وہ بہت بڑا غنڈہ ہے۔''

اصغر کا سر چکرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ پاتا مولانا بخش وہاں آ گیا۔

''اصغر تم..... اچھا تو اس نے میری اصلیت تمہیں بتا دی۔ میں نے اس کو خریدا ہے۔ اس کو میرے حوالے کر دو اور تم بغیر کسی کو کچھ بتائے اس شہر سے چلے جاؤ ورنہ مجبوراً مجھے تمہارا خون کرنا پڑے گا۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں بہت خطرناک غنڈہ ہوں۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''میں دیکھ رہا ہوں۔ مجبور لڑکیوں کے جسموں کی دلالی کرنے والے دلال، بہت بڑا غنڈہ ہے تو۔ بڑی مردانگی کا کام کر رہا ہے۔ کمینے بھاگ جا یہاں سے۔''

مولانا بخش نے چاقو نکال لیا۔

''مردانگی تو تو نے میری دیکھی ہی ہے۔ اس بڑھاپے میں میں نے لڑکا پیدا کر کے دکھا دیا۔ میں کتنا بڑا اور خطرناک غنڈہ ہوں، یہ میں ابھی تجھے قتل کر کے ثابت کر دوں گا۔''

اصغر کا خون جوش مارنے لگا۔

''اپنا چاقو موڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے۔ گھر جا کر اپنی بیوی کو دے دینا۔ وہ اس سے سبزی کاٹے گی اور رہی مردانگی کی بات تو چاقو دیتے وقت اس سے یہ بھی پوچھ لینا کہ وہ بچہ کس کا ہے۔ تیرا ہے یا اصغر کا۔''

''کیا..... تو جھوٹ بولتا ہے۔ میری پارسا بیوی پر الزام لگاتا ہے..... میں...... میں..... تجھے۔'' مولانا بخش کا ہاتھ لرزنے لگا۔ صنوبر حیرانی سے اصغر کو دیکھ رہی تھی۔

''مجبور عورتوں کے جسموں کی دلالی کھانے والے دلّے۔ جا اپنی بیوی سے پوچھ۔ میں صنوبر کو لے کر وہیں آتا ہوں۔''

مولانا بخش غصے میں نصرت کے پاس پہنچا اور اس کے گلے پر چاقو رکھ دیا۔

''سچ بتا نصرت۔ یہ بچہ کس کا ہے۔ میرا یا اصغر کا۔ اگر مجھے لگا کہ تو جھوٹ بول رہی ہے تو یہ چاقو تیرے جسم کے آر پار کر دوں گا۔ سچ سچ بتا۔''

نصرت نے اس بوڑھے کو اس خطرناک روپ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ جھوٹ نہ بول سکی۔

''اصغر..... کا۔''

مولانا بخش یہ سن کر پاگل ہو گیا اور نصرت کے پیٹ کو رامپوری چاقو سے چیر ڈالا۔

اس نے بچے کو بھی نہیں بخشا۔ پولیس نے ان دونوں کے خون کے الزام میں اسے گرفتار کرلیا۔



اصغر صنوبر کو لے کر مولانا بخش کے گھر اپنے کمرے میں آیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور صنوبر کو لے کر دوسری جگہ کرائے کا کمرہ لے کر رہنے لگا۔ صنوبر اب اس سے سچا پیار کرتی تھی۔ وہ اسے پانا چاہتی تھی لیکن اصغر کے چہرے پر وہی معصوم شرافت تھی۔ صنوبر کے اب تک رویے نے اس سے پیار کرنے کی قوت چھین لی تھی۔ عجب انتشار اس کے دل و دماغ میں گھر کر گیا تھا۔ نہ وہ صنوبر سے دور رہ سکتا تھا نہ اس کے قریب جا سکتا تھا۔ صنوبر بھی اس کی اس کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ اصغر کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ صنوبر کو لگا کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ ابھی جوان تھی، خوبصورت تھی۔ ممکن تھا کہ کچھ دن کی جدوجہد کے بعد اس کی زندگی سنور جائے۔

ایک دن اصغر صبح اٹھا تو اس نے گھر میں صنوبر کو نہیں پایا۔ وہ اسے ڈھونڈنے نکلا۔ سارا شہر چھان مارا لیکن وہ نہیں ملی۔ صبح سے شام ہوگئی۔ اس کے پیٹ میں ایک دانہ نہیں گیا تھا۔

اس سبب سے اس پر غشی طاری ہوئی اور وہ گر پڑا۔

''یہ تو وہی مریض ہے جو سمندر کی سیر کرنے گیا تھا، واپس ہی نہیں آیا تھا۔'' ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو مسٹر میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اپنی صحت کا خیال رکھو، لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ تم پر تپیدق کے مرض نے حملہ کیا ہے۔ اب تم کو زیادہ دن تک اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ اور زیادہ سے زیادہ اپنی صحت کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

صنوبر نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''ماں جی کوئی کام مل سکتا ہے۔ میں بہت دکھیاری ہوں۔ کوئی بھی کام مل جائے میں کروں گی۔ مجھے صرف دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ چاہیے۔''

''نہیں بھائی کوئی کام نہیں ہے۔ چلو جاؤ یہاں سے۔''

اس طرح سینکڑوں دروازوں پر اس نے دستک دی لیکن کہیں کام نہ ملا۔ آخر کار ایک دروازے پر کمزوری سے گر پڑی۔ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا اور اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔

''بابو جی کوئی کام دے دیجیے۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے بہت بھوک لگی ہے۔''

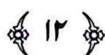
وہ صنوبر کو اندر لے گیا اور کچن سے کھانا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ جب اس کے پیٹ کی آگ بجھ گئی تو اسے کچھ آرام محسوس ہوا۔ وہ آرام کرنے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ نوجوان کی انگلیاں اس کے بدن کے نازک اعضا سے کھیلنے لگیں۔

''یہ کیا کر رہے ہیں بابو جی۔''

''میری جان، میں نے تمہارے پیٹ کی آگ بجھائی۔ تم میرے پیٹ کے نیچے کی آگ بجھا دو۔''

یہ کہہ کر نوجوان اس کے جسم پر زبردستی سوار ہو گیا۔ صنوبر کے اندر بھی احتجاج کی سکت نہ تھی۔ جب جوش ٹھنڈا ہوا تو اس نے صنوبر کو ۵ روپئے دیے اور گھر سے چلتا کر دیا۔ رات ہو گئی تھی۔ صنوبر فٹ پاتھ پر بھکاریوں کے پاس سو گئی۔ رات کے دو بجے جب سڑک بالکل سنسان تھی اور وہ گہری نیند میں سو رہی تھی تو کئی بھکاری ایک ساتھ آئے اور اس کا منہ ہاتھ اور پیر اتنی مضبوطی سے دبایا کہ وہ ہل بھی نہ سکی۔ سب نے

باری باری اس کے جسم کے سمندر میں غوطہ لگایا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے کسی سے کہا تو وہ اس فٹ پاتھ پر بھی نہیں رہ سکے گی۔ صنوبر ڈر گئی۔ اب یہ روزانہ کا معمول ہو گیا تھا کہ دن میں وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گرا ہک تلاشتی اور رات میں فٹ پاتھ پر سونے کے عوض اپنا جسم ان درندوں کے حوالے کرتی جو اسے بھیڑیوں کی طرح نوچتے۔ اس معمول کو بیتے ابھی ۱۵/ دن ہی ہوئے تھے کہ اس کی خوبصورتی بدصورتی میں بدل گئی۔ اب کوئی گرا ہک اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ لیکن رات کو فٹ پاتھ پر بھکاری اسے ضرور نوچتے تھے۔ آخر کار وہ بھی ان میں شامل ہوگئی اور بھیک مانگنے لگی۔ ایک دن بھیک مانگتے مانگتے وہ سڑک پار کر رہی تھی کہ اس کا سر چکرایا اور گر پڑی۔ اتنے میں ایک گاڑی اس کے جسم کے اوپر سے گزر گئی۔



﴿ ۱۲ ﴾

"کیا بات ہے نرس۔ یہ اسپتال میں انتشار کیوں پھیلا ہوا ہے۔"

"وہ ایک بھکارن گاڑی کے نیچے آگئی ہے۔ بے چاری کے سینے کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ کچھ ہی دیر کی مہمان ہے، اس لیے اسپتال کے لوگ ہمدردی میں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے آ، جا رہے ہیں۔"

"تب تو مجھے بھی جانا چاہیے۔"

وہ اٹھا اور بھکارن کو دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچا۔ پورا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں چادر سے باہر تھیں۔ اصغر ان آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ یکا یک اس نے چادر چہرے سے ہٹادی۔

"صنوبر تمہارا یہ حال۔ تم بھکارن.....اوہ یہ کیا ہو گیا۔"

صنوبر نیم مردہ تھی لیکن اصغر کی آواز نے اس میں جیسے زندگی پیدا کر دی۔ اس نے

آنکھیں کھول دیں۔

''اصغر.....''اس کے لب بری طرح کانپ رہے تھے۔

''میں نے رانی بننے کا خواب دیکھا۔اس کے لیے مکروفریب سے کام لیا اور دیکھو اس کا نتیجہ.....کارل مارکس کے فلسفوں میں زندگی تلاش کرنے والی کالج کی طلبہ آج بھکارن بن گئی۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا۔کاش میں گرنے سے پہلے سنبھل جاتی۔ مجھے معاف کردو۔''

''نہیں نہیں کیسی باتیں کررہی ہوتم۔تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں، ڈاکٹر......''

اس کی چیخ میں اتنی شدت تھی کہ اسپتال کے درودیوار ہل گئے۔ڈاکٹر اور نرس بھاگتے ہوئے آئے۔

''ڈاکٹر میری صنوبر کو......کہتے کہتے اصغر کے منھ سے سرخ فوارہ پھوٹ پڑا۔

نرس نے اسے سنبھالا۔ڈاکٹر نے صنوبر کا معائنہ کیا۔وہ اس دنیا سے جاچکی تھی۔اصغر اس کی قبر سے لپٹ کر روتا رہا۔اس کی دنیا ویران ہوگئی تھی۔شہر نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کیا اور چپ چاپ اسپتال سے نکل کر گاؤں جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔صحت خراب ہوتی جارہی تھی۔کھانسی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

گاڑی جب بیلا گاؤں رکی تو وہ اتر گیا۔گرتے پڑتے اپنے گھر پہنچا۔گاؤں کے لوگوں نے اسے پہچان لیا اور اس کو لڑکھڑاتے بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ گھر کی دہلیز تک آتے آتے اس کے منھ سے ایسا سرخ فوارہ چھوٹا جس نے اسے بے دم کردیا۔وہ گر پڑا اور وہیں تڑپنے لگا۔موت کے فرشتے نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز کو چوم سکتا۔

☆☆☆

فطرت.....محبت.....ندامت

(۱)

سورج کو ڈوبے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر نگر کی وحشت گلی میں ایک لمبے قد کا آدمی داخل ہوا۔ خوبصورت چہرا لیکن اتنا بارعب کہ پہلی بار دیکھنے والا وحشت سے چونک پڑے۔ سوٹ میں ملبوس، پاؤں میں انگریزی بوٹ۔ اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔

''مکان نمبر ۲۰۔''

وہ لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا مکان نمبر ۲۰ کے پاس رکا اور دروازے کی گھنٹی بجائی۔

اندر سے ایک آدمی آیا۔

''آپ کا مکان ہے۔''

''ہاں جناب، خاکسار کا ہی ہے۔''

''مجھے انوکھے خان نے بھیجا ہے۔''

''او'' وہ چونک پڑا۔

''تو آپ امین صاحب ہیں۔ معاف کیجیے میں نے آپ کو پوری طرح پہچانا نہیں لیکن آپکا چہرہ کچھ مانوس لگنے کے سبب میں ایک پل کے لیے پرانی یادوں میں کھو گیا''۔

''یادیں..... ہاں دوست۔ یادوں کے سہارے ہی انسان زندہ رہتا ہے۔''

''یہ سوٹ کیس مجھے دیجیے اور اندر چلیئے۔''

دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ پرانے طرز کا مکان۔ ایک باورچی خانہ، ایک ڈرائنگ روم، اور دو بیڈروم۔ مکان چھوٹا مگر صاف ستھرا۔ سامنے ایک چھوٹا سا باغ جس میں رنگ برنگ کے پھول۔ ''مکان پسند آیا۔''

وحشی سعید نمبر

''ہاں.... مجھے بھوک لگی ہے۔تم میرے لیے کچھ کھانے کا انتظام کر سکتے ہو۔''

''ابھی.... ابھی کرتا ہوں جناب، تب تک آپ غسل کر لیں۔''

مکان مالک باہر آیا اور سڑک کی اور مڑا کہ یکا یک اسے کسی نے آواز دی۔

''لالو.....لالو.....''

''کیا بات ہے۔''

''یہ تمہارے مکان میں کون آیا ہے۔''

''وہ......وہ میرا نیا کرائے دار ہے۔''

''لیکن وہ بھلا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔''

''وہ بھلا آدمی ہے لیکن بڑا دکھی ہے۔''

''لیکن اس کے اطوار سے تو ایسا نہیں لگتا۔''

''جب آدمی کے لیے مایوس کن حالات پیدا ہوتے ہیں تب ہر ایک اسے برا ہی سمجھتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔''

''اچھا'' یہ کہتے ہوئے لالو سامنے والے ہوٹل میں گیا اور امین کے لیے کھانا لیا۔

کھانا لے کر گھر آیا اور میز پر لگا دیا۔

امین غسل خانے سے باہر آیا۔

''کھانا۔''

''جی وہ میز پر۔''

''اچھا''

''کھانا بہت اچھا ہے۔''

''شکریہ جناب۔''

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''جی میرا نام تو ویسے جمال ہے لیکن لوگ لالو کہہ کر پکارتے ہیں۔''

جمال کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ ماں باپ گزر چکے تھے۔ شادی بھی نہیں کی تھی۔ تنہا تھا۔ مست اور رنگین طبیعت۔ اس کے باپ نے دو مکان چھوڑے تھے جن کے کمروں کو کرائے پر اٹھا کر وہ اچھی آمدنی کر لیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد امین پلنگ پر آ گیا۔

''صاحب..... میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ مرد کے پیٹ کی جب آگ بجھ جاتی ہے تو اس کے جسم کی آگ جل اٹھتی ہے اور اسے بجھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

''تو''

''تو صاحب..... وہ لال پری ہے، کیا حسن پایا ہے۔ جس نے اس کا قرب حاصل کیا وہ جنت میں پہنچ گیا۔ نام بھی اس کا کسی قدر خوبصورت ہے 'طوائف رانی' اس کی پورے شہر میں دھوم ہے۔''

''جمال..... میں ابھی بہت تھکا ہوا ہوں اور اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے تم ایسا کرو کل شام کو آ جاؤ۔ اس وقت تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ اور ہاں برتن ساتھ لیتے جاؤ۔ یہ لو کھانے کے پیسے۔''

''جی بہت اچھا۔ کل شام کو حاضر ہوتا ہوں۔''

(۲)

جمال مکان میں داخل ہوا۔ امین ابھی تک نیند میں تھا۔ دروازے کی گھنٹی سن کر آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''اٹھئے جناب شام ہو گئی۔''

''ہوں۔''

''ارے لگتا ہے کہ آپ سارا دن سوتے ہی رہے اور دن کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے اس کا احساس تھا اسی لیے کھانا میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں منہ ہاتھ دھولوں۔''

جمال نے امین کے کھلے ہوئے سوٹ کیس کے اوپر ایک کتاب دیکھی۔ اس نے سوچا کہ جب تک امین کھانے سے فارغ ہو، وہ اس کو الٹ پلٹ کر دیکھے۔ لیکن وہ کتاب میں اس قدر کھو گیا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ امین نے کب کھانا ختم کیا۔

''کہاں کھو گئے جناب......جمال۔''

''ہوں.....اچھا تو آپ نے کھانا بھی کھا لیا۔ دراصل یہ کتاب اتنی اچھی اور دلچسپ ہے کہ میں اس میں کھو گیا۔ ہاں.....طوائف رانی کے یہاں چلنا ہے۔ وہاں آج آپ کے لیے گانا ہوگا۔''

''میرے لیے نہیں، میرے پیسوں کے لیے گانا ہوگا۔''

''ایک ہی بات ہے جناب۔ آخر پیسے بھی تو آپ ہی کے ہیں۔''

وہ دونوں شریف گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں ہر مکان میں حسن و جوانی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جمال ایک مکان کے سامنے رک گیا۔

''طوائف رانی کا گھر۔''

''مکان تو اچھا ہے لیکن مجھے طوائف رانی کو دیکھنا ہے۔''

دونوں اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑا کمرہ قالین سے سجا ہوا۔ سات آٹھ تکیے۔ بوڑھی آپا پان چبا رہی تھی۔ جمال نے اسے سلام کیا۔

''یہ میرے مالک امین صاحب ہیں۔''

''آداب۔''

وحشی سعید نمبر

''شاہ خود آئے ہیں آپا۔ تو اب دیر کس بات کی ہے۔''

''اچھا جناب۔ بیٹی باہر آجاؤ، مہمان آ گئے ہیں۔''

طوائف رانی اوپر سے نیچے تک گہنوں میں لدی ہوئی تھی۔ حسن بے پناہ نے اسے چودہویں کا چاند بنا دیا تھا۔ اس نے امین صاحب کے سامنے پان کی گلوری رکھی......

''آداب۔''

امین صاحب حسن سے متاثر ہوئے، اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۱۰۰۔۱۰۰ کے ۲۰ نوٹ رکھے۔ پورے ۲۰۰۰/روپئے۔

''طوائف رانی اپنی اداؤں اور ترنم بھری آواز سے محفل کو مستی کے عالم میں تبدیل کر دیجیے۔''

''جو حکم۔''

اگر یہ حسن میرا پیار کے شعلوں میں ڈھل جائے
تو پھر انسان ہے کیا چیز پتھر بھی پگھل جائے

اس نے دو چار گانے گائے۔ جمال صاحب رات کے کھانے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ بوڑھی آپا نے بھی دونوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔''

''طوائف رانی۔''

''اصلی نام۔''

''اب تو یہی اصلی نام ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو میرا نام شبنم تھا۔''

''شبنم.....'' میں تو پرانی یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں.... لیکن......وہ پھر یاد آ گئی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

(۳)

امین کو پوری طرح نہ تو ماں کا پیار مل سکا اور نہ باپ کا۔ امیر ترین گھرانہ، باپ کو اپنے کاروبار سے فرصت نہیں تھی اور ماں کو اپنی سہیلیوں اور پارٹیوں سے۔ اس کے باپ کا ایک منشی رنگین شاہ تھا۔ اپنے نام کے اعتبار سے ہی رنگین۔ اس کی نظر اپنے مالک کی دولت پر تھی۔ اس نے دوستی بڑھاتے ہوئے امین کے باپ کو شراب اور شباب کی لت لگائی اور اس کی ماں کو بھی اپنے پیار کے جال میں پھانس لیا۔ پھر ایک دوسرے کی مخبری شروع کردی۔ ایک کا رراز دوسرے کو بتانے لگا جس سے گھر کا امن وسکون درہم برہم ہو گیا۔ ایک دن امین کی ماں نے اپنے شوہر کو دوسری لڑکی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ خوب ہنگامہ ہوا۔ امین کے باپ نے اپنی غلطی مان لی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ایک دن امین کے باپ نے اس کی ماں کو غیر مرد کے ساتھ اپنے بستر میں پایا۔ لیکن اس مرد کا چہرا نہ دیکھ سکا۔ چونکہ یہ رنگین شاہ کی سوچی سمجھی چال تھی اس لیے اس نے پہلے ہی پور تیاری کرلی تھی۔ امین کا باپ صرف اس کی ننگی پیٹھ دیکھ سکا اور وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ امین کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دے دیا اور خود شراب اور شباب میں ڈوب کر جلد ہی جہاں فانی سے چلا گیا۔ کاروبار اب امین کے ہاتھ میں تھا اور اسے بھی رنگین شاہ نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ رنگین شاہ پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتا تھا۔ ایک دن امین پرانا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔

"بیٹا، کبھی اپنے دماغ کو آرام بھی دیا کرو۔"

"چچا جان، آرام کام کے بعد۔"

"بیٹا تم میری طرح بوڑھے نہیں ہو، خوبصورت جوان ہو، جوانی کے دن لوٹ کر نہیں آتے۔ تمہارے ابا مرحوم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ زندگی چار دن کی ہے تو کیوں نہ اسے عیش کے عالم میں گزارا جائے، آؤ آج میں تمہیں دنیا کا ایک نرالا کھیل دکھاؤں گا، چلو"۔

''کہاں؟''

''آؤ تو میرے ساتھ۔''

رات کے اندھیرے میں وہ دونوں ایک حویلی میں داخل ہوئے۔

''چچا جان ہم یہاں کیوں آئے؟ یہاں کیا ہے؟''

''بیٹا یہاں وہ آب حیات ہے جس سے تمہاری جنم جنم کی پیاس بجھ جائے گی۔''

حسن کے انمول موتی نے رقص شروع کیا۔ امین کا دل اچھلنے لگا۔ عورت کا سامنا اس طرح پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نازک حسینہ نے جب شراب کا جام پیش کیا تو امین نے کہا۔

''نہیں...... میں...... نہیں...... پیتا۔''

''ارے بیٹا۔ زندگی کا اصل راز تو اسی جام میں چھپا ہوا ہے۔ پی لو اور جنت کی سیر کرلو۔''

''لیکن......''

''میری قسم''، نازک حسینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ جام پی گیا جو بہت تلخ تھا۔ لیکن پھر وہ مستی کے عالم میں ڈوب گیا۔ عورت کے نرم جسم نے اسے جوانی کے انمول ہونے کا احساس دلایا۔ آہستہ آہستہ شراب اور شباب اس کی زندگی کا اہم حصہ بن گئے۔ رنگین شاہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اب امین کی راتیں طوائفوں کے جسموں کے ساتھ ہی گزرتی تھیں۔

(۴)

عمر کے تقاضے انسان کو کبھی کبھی کچھ مسئلے حل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ امین کو بھی ایک ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا۔ رنگین شاہ نے کہا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''شادی تمہیں کرنی پڑے گی۔''

''لیکن میں شادی کرنا نہیں چاہتا۔''

''دیکھو بیٹے شادی انسانی زندگی کا اہم جز ہے۔ انسان کی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ہمیں سماج میں رہنا ہے۔ہم اس سماج کا حصہ ہیں تو عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے کچھ سماجی روایتوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی نبھانا پڑتا ہے۔تمہارا بھی کوئی نام لیوا ہونا چاہیے۔ہم سب کو ایک دن اس فانی دنیا سے جانا ہے لیکن کیا خاندان کا نام مٹا کر جاؤ گے۔اور پھر نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا ہے۔''

''نادر موقع......؟ کیا مطلب؟''

''ایک حسین ترین لڑکی ہے۔اونچا خاندان اور سب سے اچھی بات کہ وہ جہیز میں تیس ہزار روپئے نقد دے رہے ہیں۔''

''روپئے کی بات نہیں۔لڑکی کیسی ہے۔''

''ارے بھائی حسین لڑکی ہے،خوبصورت۔اسکے ساتھ دولت بھی مل رہی ہے''۔

''مجھے دولت کی پرواہ نہیں۔''

''نہیں بیٹے، دولت کی پرواہ ہونی چاہیے۔اس سے انسان کی سماج میں عزت اور مقام ہے۔جس کے پاس دولت نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ دبتا رہتا ہے۔''

''لیکن میں لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کروں گا۔''

ٹھیک ہے۔کل تم کو شاہ دین کے یہاں دعوت پر جانا ہے۔وہاں وہ بھی آئے گی۔ وہیں ملاقات کا بندوبست کرتے ہیں۔

(۵)

امین شاہ دین کے یہاں جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ رنگین شاہ نے کہا۔

لمحے

وحشی سعید نمبر

''بیٹے میں نے مغلانی کو کہا ہے کہ ٹھیک سات بجے وہ شاہ دین کی حویلی کے پیچھے والے باغ میں شبنم بیٹی کو لائے۔ وہاں آپ بھی جائیں اور اسے جی بھر کر دیکھ لیں۔''

امین شاہ دین کے یہاں دعوت میں جاتے ہوئے راستے میں نہ جانے کیوں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اب تک بہت سے پھولوں کا رس چوسا تھا لیکن شبنم کے لیے نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ دین کی حویلی جگمگا رہی تھی۔ روشنی نے رات کو دن میں بدل دیا تھا۔

مغلانی عورتوں کی محفل میں داخل ہوتی ہوئی شبنم کے پاس جا پہنچی۔

''شبنم۔''

''جی۔''

''یہاں تو بڑی گرمی ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو باغ میں ہم چہل قدمی کر آتے ہیں، تا کہ دماغ تازہ ہو جائے۔''

''لیکن وہاں تو آدمی ہوں گے۔''

''ارے بی بی، وہاں کوئی نہیں ہے۔ اس طرف آدمیوں کا آنا جانا بند کیا گیا ہے۔ آؤ بھی۔''

''لیکن......''

مغلانی اسے تقریباً کھینچتے ہوئے باغ میں لے آئی۔

''میں نے سنا ہے تری شادی ہو رہی ہے''۔

''ہاں''۔

''تم نے دولہے کو دیکھا، تمہیں پسند ہے۔''

''ماں باپ کی پسند ہی میری پسند ہو گی۔ مجھے دولہا دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ماں باپ جس کے ساتھ ہاتھ پکڑا دیں گے چلی جاؤں گی۔''

وحشی سعید نمبر

امین درخت کے پیچھے سے شبنم کو دیکھ رہا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ وہ اس نازک حسینہ کا ہونے والا خاوند تھا۔ اس کے باغ سے باہر آنے پر رنگین شاہ نے پوچھا۔

''کیوں.... دیکھ لیا، لڑکی پسند آئی۔''

''ہاں چاچا۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی ذہین بھی ہے۔ آپ جلدی رشتہ پکہ کیجیے اور ہاں نقدی کا بھی خیال رکھئے گا۔''

''ہوں..... بیٹا اب عقلمند ہو گیا ہے۔''

(۶)

اکبر خاں کی بڑی حویلی کے سامنے ایک باغ تھا۔ پورے شہر میں یہ سب سے اچھا اور خوبصورت مانا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا نام لوگوں نے دلفریب رکھا تھا۔

رنگین شاہ نے حویلی کے اندر داخل ہوتے ہوئے اکبر خاں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ آیئے، رنگین شاہ صاحب۔ فرمایئے۔''

''جی حضور میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ جو بات ہمارے درمیان ہوئی تھی، اسے آگے بڑھایا جا سکے۔''

''تو آپ نے امین صاحب سے بات چیت کی۔''

''جی ہاں۔ بڑا فرمانبردار لڑکا ہے۔ مان گیا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

''ہمارے آپ کے درمیان ایک اور بات ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔ ۳۰ / ہزار روپۓ کی۔ آپ اس کے لیے بے فکر رہیں۔''

''تو پھر جمعہ کے دن منگنی کر دیتے ہیں اور اگلے ماہ شادی۔''

''آپ امین صاحب سے مشورہ کر لیجیے۔''

''آپ سمجھ لیجیے کہ یہ امین صاحب کی ہی بات ہے۔''
''تو پھر ٹھیک ہے۔ایک ماہ کے اندر ہم بھی شادی کی اچھی طرح تیاری کر سکتے ہیں''۔

(۷)

سگائی کے اخراجات ایک عام آدمی کی شادی کے اخراجات کے برابر تھے۔ دونوں اور سے دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔اس کا فائدہ اٹھا کر رنگین شاہ کافی پیسے بچا رہا تھا لیکن اکبر خان بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا۔

دلہن کے گھر میں دولہے کا شاندار استقبال ہوا۔اسے بہترین مسند پر بٹھایا گیا، نکاح ہوا۔امین کے قریبی دوست انور بیگ نے کہا۔

''یار آج وہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔''

''کیوں۔''

''یہ روایت ہے۔دلہن کو اس دن صرف گھر لایا جاتا ہے۔سہاگ کا کمرہ دوسری رات ملتا ہے، وجہ شاید یہ ہے کہ دلہن، دولہا بہت تھکے ہوتے ہیں۔''

''اف.....میرا دل چاہتا ہے کہ ابھی اس باریک پردے کو کاٹ دوں جس کے پیچھے دلہن ہے اور اسی وقت سہاگ رات منالوں.....خیر.....''

''دلہن کو ڈولے میں سوار کیا گیا۔وہ اپنے ماں باپ سبھی رشتہ داروں کو چھوڑ کر شوہر کے گھر چلی آئی۔'' یہاں بھی گانا بجانا ہوتا رہا۔

دوسرے دن رات کو امین نے شبنم کا گھونگھٹ اٹھایا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

''اف اس قدر حسن۔''

اس نے نرم آواز میں پکارا۔

''شبنم۔''

شبنم نے ڈر اور شرم کے ملے جلے لہجے میں اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں کی معصومیت نے امین کو گھیرے میں لے لیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔

(۸)

یہ سچ ہے کہ کسی شریر بچے کو کوئی نیا حسین کھلونا مل جائے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے بہل جاتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اسی شرارت پر اتر آتا ہے اور ادھر ادھر دوسرے کھلونوں کی جانب بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ امین کی شرارت بھی کچھ دنوں تک شبنم نامی کھلونے سے بہلی رہی۔ لیکن اس کی گندی فطرت نے پھر کروٹ لی اور اس کا ہر روز رات دیر سے آنا شروع ہو گیا۔ ایک دن شبنم نے شکایت کی۔

"آپ ہر دن دیر سے آتے ہیں۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔"

"کیا کروں بیگم۔ میرے دوست ضدی ہیں وہ محفل جمانے کے بعد مجھے اٹھنے ہی نہیں دیتے۔"

"لیکن آج کل جلدی آجایا کیجیے، میری طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔"

"کیا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

شبنم کی آنکھوں میں شرم اور ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔

"ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں، آپ باپ بننے والے ہیں۔"

امین خوشی سے ناچ اٹھا۔ شبنم کو بانہوں میں بھر لیا۔

"آپ وعدہ کیجیے کہ اب دیر سے نہیں آئیں گے۔ محفل سے تھوڑا جلدی ہی اٹھ جائیں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

(۹)

شبنم نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ امین لڑکا چاہتا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اس کے لڑکے کا باپ بننے کا خواب پاش پاش ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ لیکن وہ شبنم سے کیے ہوئے وعدہ کو برقرار نہ رکھ سکا۔ آخر شرابی کے وعدہ کا بھی کیا بھروسہ۔

دو سال اسی طرح بیت گئے۔ شبنم دوبارہ ماں بننے والی تھی، اس بار امین نے کہا۔

''دیکھو بیگم۔ اس بار ہمیں بیٹا چاہیے۔''

''جو خدا کو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔''

''تم دعا کرو خدا تمہاری دعا سے لڑکی کو لڑکے میں تبدیل کر دے گا۔ خدا نیک بندوں کی سنتا ہے۔ بیگم تم بھی نیک ہو۔ تمہاری دعائیں ضرور قبول کرے گا۔''

دو ماہ بعد شبنم کو لڑکا ہوا۔ امین خوشی سے جھوم اٹھا، اس نے لڑکے کو ہاتھ میں لے کر پیار کیا اور ایک قیمتی لاکٹ اس کے گلے میں ڈال دیا۔

''آپ نے اتنا قیمتی لاکٹ اس چھوٹے سے بچے کو پہنایا ابھی تو......''

''ارے بیگم یہ بھی تو دیکھو کہ بیٹا کس کا ہے۔''

رات کو امین کی حویلی میں ناچ گانا ہوا۔ کچھ دوستوں نے ضد کر کے پلائی۔ کچھ وہ خود بھی خوشی میں پی گیا۔ بہکے قدم.... نشے میں ڈوبی آواز.....

''آپ..... آپ نے شراب پی لی۔'' شبنم کے چہرے پر نفرت اور حقارت پھیل گئی۔

''بس بیگم آج اتنی خوشی کا دن تھا کہ دوستوں نے پینے کے لیے مجبور کر دیا۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔

(۱۰)

دوستوں کی محفلیں اب حویلی کے اندر بھی جمنے لگیں۔ دھیرے دھیرے یہ روزانہ کا کام ہو گیا۔ نئی نئی کمسن لڑکیاں حویلی میں آتی تھیں۔ شبنم اس نئی حالت کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اس نے جب بھی احتجاج کیا امین نے موٹے موٹے آنسوؤں سے اس کو رام کر دیا۔ لیکن کب تک۔ جلد ہی شبنم نے تیسرے بچے کو جنم دیا۔ چونکہ امین کا لڑکے کا باپ بننے کا خواب پورا ہو چکا تھا اس لیے اس نے اس جانب کوئی توجہ نہ کی۔ وہ اس رات بھی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہا۔ گھر کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ شبنم اپنے بچوں کی تربیت ایسے گندے ماحول میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن آخری فیصلہ کر کے وہ امین کی غیر موجودگی میں اپنے بچوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر کے لیے نکل پڑی۔ ملازموں نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود۔ وہ ریل گاڑی میں سوار ہوئی۔ راستے میں ایک بڑا پل پڑتا تھا۔ ریل اس پر سے گزر رہی تھی کہ پل ٹوٹ گیا۔ ریل کے ٹکڑے ہو گئے۔ دوسری سواریوں کی طرح شبنم بھی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ کہاں گئی، پتہ نہ چلا۔

(۱۱)

امین شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ شبنم اور بچوں کو نہ پا کر اس نے ملازم کو بلایا۔

''کیوں بے..... مالکن کہاں ہیں؟''

''جناب وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئیں۔''

''کیوں....؟''

''آپ کا یہ رنگ ڈھنگ وہ برداشت نہ کر سکیں۔''

وحشی سعید نمبر

امین کا نشہ کافور ہو گیا۔

''ابے کم عقل۔تم نے جانے کیوں دیا۔اب کیا ہوگا۔چلو ہم ابھی چلتے ہیں اور اکبر صاحب سے کوئی بہانہ بنا کر منت سماجت کر کے ان کو واپس لائیں گے۔جلدی چلو۔''

وہ دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ٹکٹ کھڑکی پر امین نے کہا۔

''سولن کی دو ٹکٹیں۔''

''سولن کی.....کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سولن کا پل ٹوٹ گیا ہے اور صبح جو گاڑی سولن جا رہی تھی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔''

''کیا.....اور.....اور.....ان میں جو سواریاں تھیں، ان کا کیا ہوا؟''

''ابھی تک پتہ نہیں کہ کتنے مرے اور کتنے زندہ ہیں۔''

''نہیں......شبنم......میرے بچے....''

دوسرے دن وہ حادثے کے مقام پر پہنچا۔لاشیں نکالی جا رہی تھیں اور شناخت کروائی جا رہی تھی۔امین کی حالت غیر معمولی طور پر تبدیل تھی۔بال بکھرے، داڑھی بڑھی ہوئی۔وہ اس وقت ٹوٹ گیا جب شبنم اور اس کے چھوٹے بیٹے کی لاش ملی۔بیٹی اور بڑے بیٹے کا کچھ پتہ نہ تھا۔شبنم اور بچے کو سپرد خاک کیا گیا۔اس پر آسمان ٹوٹ پڑا۔اس کا دوست انوکھے خان اسے دلاسہ دینے لگا۔

''زندگی تو مصیبتوں کا مجموعہ ہے۔وقت کے ساتھ زخم بھر جاتے ہیں۔''

''نہیں یار.....میں نے اپنی بیوی کی قدر نہ کی جو ہر وقت مجھ پر سب کچھ فدا کرنے کو تیار رہتی تھی۔میں وہی عیاشی کا کیڑا رہا۔نہ جانے میری بیٹی اور بیٹے کا کیا حال ہوگا۔''

''جہاں بھی ہوں گے اچھے ہی ہوں گے۔تم کوئی غلط خیال دماغ میں نہ لاؤ۔بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم ہوا پانی بدل دو۔ایسا کرتے ہیں کہ سمندر نگر میں میرا ایک

دوست ہے۔ اس کے دو مکان ہیں جن کو وہ کرائے پر چلاتا ہے۔ میں اسے کل خط لکھ دیتا ہوں۔ وہ ایک مکان تمہیں کرائے پر دے دے گا۔ تم جب تک چاہو، وہاں رہنا۔ پھر آ جانا۔''

امین نے کچھ سوچتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور سمندر نگر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

(۱۲)

''کس سوچ میں ڈوب گئے۔'' شبنم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' امین یادوں کی دنیا سے باہر آیا اور شبنم کے حسن کو نہارنے لگا۔ اس کی بیوی شبنم خواب تھی، اس کی نظروں کے سامنے جو شبنم تھی وہ حقیقت۔ ایک بار پھر اس کی گندی فطرت نے انگڑائی لی اور وہ سب کچھ بھول کر طوائف رانی کے نرم جسم کی سیر میں ڈوب گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے کپڑے پہنے۔ باہر نکل ہی رہا تھا کہ جمال آ گیا۔

''آخر آپ پر بھی طوائف رانی کا جادو چل ہی گیا۔''

''جمال تم بہت باتیں کرنے لگے ہو۔'' طوائف رانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جمال آؤ چلیں۔''

''آپ چلیے حضور میں ابھی آتا ہوں۔''

''آپا۔ ہماری جیب آج کل سرد ہے۔''

''ابھی گرم کیے دیتی ہوں۔ لیکن یہ تبھی گرم رہ سکے گی جب امین جیسے قدردان آتے رہیں ورنہ اپنی جیب کو سرد رکھنے کی عادت ڈال لو۔''

دولت دولت کو کھینچتی ہے۔ امین نے دیکھا کہ سمندر نگر میں روئی بوئی جاتی ہے تو اس کے دماغ میں کپڑے کا کارخانہ لگانے کا خیال آیا۔ اس نے احمد خان کو بلایا اور

سمندر نگر میں کارخانے کے لیے اچھی زمین تلاش کرنے کے کام پر لگا دیا۔ کچھ دنوں بعد احمد خاں واپس آیا۔

''کیا ہوا احمد خاں۔''

''صاحب آپ کے کہنے کے مطابق ۲۰ کنال زمین کا سودا ہو گیا ہے۔ آپ کاغذات دیکھ کر اسے خرید سکتے ہیں۔''

''ہاں۔ مجھے بھی اس کاروبار میں بڑا منافع سمجھ میں آرہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اپنا سارا روپیہ اسی میں لگا دوں جس سے کہ یہ ملک کا سب سے بڑا کارخانہ بن جائے اور بہت منافع ہو۔''

''جی۔''

(۱۳)

کارخانے کی ابتدا کے دن اس نے ایک بڑی تقریب رکھی اور سمندر نگر کے لوگوں کو بھی اس میں مدعو کیا۔ امین نے اپنی تقریر میں کہا۔

''بھائیوں۔ میں نے آپ لوگوں کی مالی حالت کو مضبوط کرنے کی غرض سے یہ کارخانہ کھولا ہے۔ یہاں مزدور مالک سب برابر ہوں گے۔ مل کر کام کریں گے اور ملک کے اس سب سے بڑے کارخانے کو بلندی پر پہنچائیں گے۔''

امین کی اس عیاری نے لوگوں کا من جیت لیا۔ لوگ زبردست محنت سے اس کے کارخانے کو بلندی پر لے جانے لگے۔ لیکن جلد ہی اس کی گندی فطرت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ مزدور جب تک اس کی عیاری مکاری سمجھتے، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا۔

وحشی سعید نمبر

(۱۴)

''امی حضور۔ ایک دوست نے خط لکھا ہے کہ تم سمندر نگر چلے آؤ تو میں تمہیں نوکری دلوادوں گا۔''

''میرے لال کیا تواپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر کوسوں دور نوکری کرنے جائے گا۔''

''ایک جگہ بیٹھنے، چھوٹا موٹا کام کرنے سے ہماری مفلسی دور نہیں ہوگی امی۔ بڑی جگہوں پر بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ دوست نے لکھا ہے کہ ملک کا سب سے بڑا کپڑے کا کارخانہ ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بڑے امکانات ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔ میری دعائیں ترے ساتھ ہیں۔ کب جانا ہے۔''

''کل! امی آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کی رحمت اور آپ کی دعائیں مرے ساتھ ہیں۔ جلد ہی میں آپ کو وہاں بلالوں گا۔''

دوسرے دن رقیہ نے بھاری من سے اپنے بیٹے کو وداع کیا۔ بہت دیر تک دروازے پر کھڑے ہوکر اس کو دیکھتی رہی۔ اور وہ جب آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو وہ ماضی کی یادوں میں کھوگئی۔ جب وہ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھی اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا۔ تنہائی اور افلاس سے لڑتے لڑتے وہ نہ جانے کب خود کو ختم کرلیتی اگر اقبال علی اسے اپنے بچپن میں ندی کے کنارے ریت پر بے ہوش پڑا نہ ملتا۔ معصوم بچہ۔ لگتا تھا کہ کسی رئیس گھرانے کا ہے۔ لیکن اب تو قدرت نے اسے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ رقیہ کو جینے کا سہارا مل گیا تھا اور اسی کے بھروسے اس نے جوانی سے بڑھاپے تک کے دن افلاس سے جدوجہد میں کاٹ دیے۔

(۱۵)

دو دن کے سفر کے بعد اس کی ریل گاڑی سمندر نگر کے اسٹیشن پر پہنچی۔ وہاں اس کا

دوست شوکت موجود تھا۔

''کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔لیکن تم کچھ دبلے پتلے دکھائی دے رہے ہو۔''

''کچھ نہیں یار یہ سب افلاس اور بے روزگاری کی نشانی ہے۔''

''فکر نہ کرو.... مجھے پورا یقین ہے کہ تمہیں یہاں ضرور نوکری مل جائیگی۔لیکن مالک تھوڑا ٹیڑھا ہے۔اسکی ہاں میں ہاں ملانا اور اسکے سامنے خود کو کمتر سمجھنا۔کسی کے بہکاوے میں آکر کوئی ایسی حرکت،کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ نوکری پر بن آئے''۔

''مجھے کسی سے کیا مطلب۔ مالک کا حکم بجانا، اپنا کام ایمانداری سے کرنا، یہی میری زندگی کا اصول ہے۔''

امین فائلوں میں غرق تھا کہ جمال کمرے میں داخل ہوا۔

''کہو جمال کیسے آئے۔''

''حضور آپ نے طوائف رانی جیسی کتنی ہی جوانیوں کو بڑھاپے میں بدل دیا لیکن خود اب تک جوان ہیں۔اس لیے آپ کے لیے ایک بالکل نئی کلی منگائی گئی ہے۔ وہ نازنین.....مہ جبیں.....''

''اتنا قصیدہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''حضور وہ صیاد شاہ جو آپ کا پاسنگ بھی نہیں،اس کلی کا رس چوسنے کو اکثر چکر لگاتا ہے لیکن ابھی تک منی بائی نے گلنار کو سیپ میں بند موتی کی طرح محفوظ رکھا ہے کہ حضور پہلی بار اس کی گرہ کھول دیں تو آگے کا رستہ طے ہو۔''

''اس بھکاری صیاد شاہ کی یہ مجال۔اس کی اوقات ہی میرے سامنے کیا ہے۔اس کے جیسے سینکڑوں میرے ملازم ہیں۔میرے جوتے کے نیچے ہیں۔تم جاؤ اور دیکھو کہ وہ گلنار کو حاصل نہ کرنے پائے۔ یہ کچھ روپئے بھی لیتے جاؤ۔منی بائی سے کہنا روپیوں

کی پرواہ نہ کرے۔''

''جی بہت اچھا۔''

''اب تم جاسکتے ہو۔''

جمال باہر آیا اور اقبال امین کے کمرے میں داخل ہوا۔ دفتر کی سجاوٹ دیکھ کر اقبال حیرت زدہ رہ گیا۔ قیمتی قالین، چھاڑ فانوس، قیمتی تصویریں، قیمتی فرنیچر۔ اس نے اس سے قبل اتنا شاندار کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ امین اس کی درخواست دیکھ رہا تھا۔

''تو تمہارا نام اقبال ہے۔ بی. اے. پاس ہو۔''

''جی ہاں۔''

''ٹائپ بھی کرنا جانتے ہو۔''

''جی ہاں۔''

''اس سے پہلے کہیں کام کیا ہے۔''

''جی نہیں۔''

''دیکھو ڈیڑھ سو روپئے کی نوکری تمہیں مل سکتی ہے۔''

''میں تیار ہوں۔''

''ہماری کمپنی کا اصول ایمانداری سے کام کرنا ہے۔ تم جانتے ہو۔''

''جی ہاں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

وہ باہر آیا۔

''کام مل گیا۔''

''ہاں۔''

''مبارک ہو یار۔ اب اپنی ماں کو یہیں بلالو۔''

''ہاں یار۔ آج ہی خط لکھ دیتا ہوں۔''

خط ملتے ہی رقیہ دوسرے دن سمندر نگر کے لیے روانہ ہوگئی۔ وہاں پہنچنے پر اقبال نے اسے اسٹیشن سے لیا اور گھر آ گیا، جو اسے کمپنی کی اور سے رہنے کو ملا تھا۔

''یہ ہمارا گھر ہے امی۔ اب ہم سکھ سے رہیں گے۔''

''بیٹا مجھے سکھ تو تب ملے گا جب اس گھر میں ایک چاند سی بہو آئے گی۔''

''ابھی تو امی اپنی تنخواہ ڈیڑھ سو روپئے ہے۔ اتنے میں شادی.....''

''بیٹا جب تمہاری شادی ہوگی تو بہو بھی اپنی قسمت سے روزی لائے گی۔''

(۱۹)

''شاہ آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔''

''کیا کروں منی بائی اب کام بہت رہتا ہے۔ اچھا اس لڑکی کو بلاؤ۔''

اس نے گلنار کو آواز دی۔ گلنار چھم چھم کرتی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پاندان تھا، اس نے امین کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آداب''

گلنار حسن کی بجلی تھی۔ امین نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''واقعی تم گلنار ہو۔''

اس نے دس ہزار روپئے گلنار کے ہاتھ میں رکھے اور اس کو اپنے بازو میں کھینچنے ہی والا تھا کہ کارخانے کا منشی دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا بات ہے۔ یہاں کیوں آ گئے۔''

''حضور بات ہی کچھ ایسی ہے۔ جس پارٹی نے آپ سے پانچ لاکھ کا کپڑا لینے کی بات کی تھی وہ اچانک آ گئی ہے۔ پیسے بھی ساتھ لائی ہے۔ اسے صبح ہی جانا ہے۔ اس لیے سودا ابھی کرنا ہے۔ صبح چار بجے ہی اس کی ریل گاڑی ہے۔ اس لیے آج کی رات

میں ہی سودا پکا کرنا بڑی مجبوری ہے ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''اوہو..... یہ کاروبار بھی نا....''

حالانکہ امین وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ منشی کو واپس کر دے۔ لیکن تجارتی دماغ نے عیاش دل پر قابو پایا۔ دماغ نے کہا کہ گلنار تو اپنی ہے ہی۔ آج نہیں تو کل۔ لیکن پارٹی ایک بار چلی گئی تو اس نقصان کے ساتھ ساتھ آئندہ کے کاروبار سے ہونے والے فائدے پر بھی روک لگ جائے گی۔ اس لیے دانش مندی اسی میں ہے کہ آج چلا جائے۔ گلنار تو اپنے ہاتھ کا مال ہے ہی۔

''منشی کل کا کیا پروگرام ہے۔''

''حضور کل تو آپ کو شہر سے باہر جانا ہے۔''

''اوہ۔ اچھا واپسی کب ہوگی۔''

''جی پورن ماشی کے دن۔''

''تو ٹھیک ہے منی بائی۔ ہم پورن ماشی کے دن آئیں گے۔ تب تک گلنار تمہارے پاس ہماری امانت ہے۔''

(۲۰)

''امی میں آ گیا۔''

''بیٹے میں چائے لاتی ہوں۔''

اقبال چائے پینے لگا تو رقیہ نے بات چھیڑی۔

''آج صبح ہی اپنی بستی سے آدم آیا تھا۔''

''کون آدم۔''

''بیٹے وہ تمہارے لیے رشتہ لایا تھا۔''

وحشی سعید نمبر

''امی۔آپ تو میری شادی کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔''

''بیٹا میں بوڑھی ہو چکی ہوں، نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے اور تمہارا سہرا دیکھنے کی تمنا دل میں ہی رہ جائے۔''

''امی آپ ایسی باتیں مت کیجیے۔آپ سو سال جئیں۔ دیکھئے ابھی نئی نئی نوکری ہے۔ ہمارے گھر سے ابھی ابھی مفلسی دور ہوئی ہے۔تو کم سے کم ایک سال کا وقت تو چاہیے تا کہ آنے والے مستقبل کے لیے تیاری کی جائے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔ بات تو تیری بالکل صحیح ہے۔لیکن یہ جو تیرے رشتے آتے رہتے ہیں ان کا میں کیا کروں۔''

''امی جان۔آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ہم شادی کے متعلق کم از کم ایک سال کے بعد سوچیں گے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔''

(۲۱)

''محمود کیا بات ہے۔''

اقبال نے مزدوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو جمع ہوتے دیکھا تو پوچھا۔

''ارے یار یہ ہے نا اپنا امین سیٹھ، یہ اس سال بھی بونس نہیں دے گا۔اس کا خازن کہہ رہا تھا کہ اس سال بھی کمپنی کو نقصان ہوا ہے۔جھوٹا، مکار، سالا''۔

''تو مالک سے بات کریں۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔وہ بوڑھا بلہ تو شہر سے باہر ہے۔یہ تیسرا سال ہے جب ہمارا بونس ہڑپ کیا گیا ہے۔اب تو صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔''

''تو......''

''آج ایک میٹنگ بلاتے ہیں۔وہیں آگے کے بارے میں فیصلہ ہو گا۔''

وحشی سعید نمبر

(۲۲)

''کیا بات ہے بیٹا۔ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔''

''سوچتا ہوں امی کہ غریب کی قسمت میں سکھ شانتی تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے نئی نئی مصیبتیں اس کا تعقب کرتی رہتی ہیں۔''

''کیا ہوا۔''

''ہمارا مالک ۳ سال سے بونس نہیں دے رہا ہے۔ مزدوروں نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے کمر کس لی ہے۔ آج رات کو اس سلسلے میں میٹنگ ہے۔ مجھے وہاں جانا پڑے گا۔''

''نہیں تم وہاں مت جاؤ۔ ٹھیک ٹھاک زندگی گزر رہی ہے۔ تمہیں اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا امی۔ آخر مجھے اپنے مزدور ساتھیوں کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ اور ان کا مطالبہ بھی ناجائز نہیں ہے۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ کمپنی بہت منافع میں ہے ورنہ دن بہ دن نئے نئے ملازم کیوں بھرتی کیے جا رہے ہیں اور مشینیں کیوں بڑھائی جا رہی ہیں۔ زمینیں کیوں خریدی جا رہی ہیں۔ میرا ضمیر بھی نہیں مانتا کہ میں اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دوں۔''

''ضمیر کی آواز کو دبانا نہیں چاہیے بیٹا۔ تم جو مناسب سمجھو کرو۔''

(۲۳)

''دوستوں۔ ہم دن رات محنت کر کے اپنے سیٹھ کی تجوریاں بھر رہے ہیں لیکن وہ ہم سے لگاتار تین سال سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کمپنی منافع میں چل رہی ہے۔ پھر بھی دو سال ہم نے ضبط کر کے سیٹھ کے جھوٹ کو نظر انداز کیا

لیکن ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اگر ہم اب بھی اپنے حق کے لیے ایک نہ ہوئے اور مطالبہ نہیں کیا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ بونس نام کی چیز اس کارخانے سے ختم کر دی جائے گی۔''

''دوستو۔ بونس ہمارا حق ہے۔ ہمارے خون پسینے کی کمائی ہے۔ کل سے ہڑتال شروع ہوگی اور دو دن تک چلے گی تا کہ مالک کو ہمارے مسئلے کی سنجیدگی سے واقفیت ہو۔ اور وہ اس پر غور کر کے ہمارے حق میں فیصلہ کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو دو دن بعد آگے کا پروگرام بنایا جائے گا۔''

یہ کل چالیس مزدوروں کی میٹنگ تھی جس میں محمود نے تقریر کی۔ محمود کو مزدوروں نے اپنا قائد چن لیا۔ حالانکہ کارخانے میں پندرہ سو سے زائد ملازم کام کرتے تھے۔ لیکن سب کے مسئلے ایک ہونے کے سبب ان کے ایک ہونے کا پورا امکان تھا۔

(۲۴)

''اقبال جب گھر آیا تو ماں کو بیمار پایا۔''

''چاچی کیا ہوا امی کو۔''

''کچھ نہیں بیٹا۔ پتہ نہیں کیوں بے ہوش ہو گئیں۔ تم جا کر ذرا ڈاکٹر کو لے آؤ۔''

''جی۔''

وہ بھاگتا ہوا گیا اور ڈاکٹر کو لے آیا۔

''شاید کمزوری سے بے ہوش ہو گئیں ہیں۔ میں انجکشن دے دیتا ہوں۔ کل آپ انہیں ضرور اسپتال لے جا کر ان کا اکسرے کروالیں۔''

''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔''

''یہ تو اکسرے دیکھنے کے بعد ہی بتایا جا سکے گا۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

انجکشن کے کچھ دیر بعد رقیہ ہوش میں آ گئی۔

''امی۔ خدا کا شکر ہے آپ ہوش میں آ گئیں۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''

''زندگی، موت تو خدا کے ہاتھ ہے بیٹا۔ جب بلاوا آ جائے گا۔ جانا ہی پڑے گا۔''

''ابھی نہیں امی۔ ابھی مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کے بغیر میں بالکل تنہا ہو جاؤں گا۔''

رات کو دیر تک جاگنے کے سبب وہ صبح دیر سے اٹھا۔ اٹھتے ہی اسے اسپتال کا خیال آیا۔ وہ تانگہ لینے باہر بھاگا۔ دوڑ، دھوپ میں وہ ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

''اندھے ہو کیا۔''

''معاف کرنا بہن۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکا۔ میں ذرا پریشان ہوں۔''

''بہن..... تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں۔ میں طوائف ہوں۔''

''تو کیا ہوا۔ طوائف بھی تو انسان ہوتی ہے۔ کسی کی بہن بیٹی ہوتی ہے۔''

''تو یہ جان کر بھی کہ میں طوائف ہوں تمہیں مجھ سے کراہت محسوس نہیں ہوتی۔''

''بالکل نہیں۔ جب میں نے تمہیں بہن کہہ دیا تو واقعی تم میری بہن ہو۔''

''تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے ہو۔''

''میرا نام اقبال ہے اور میں کھولی والی گلی میں رہتا ہوں۔''

''میں تم سے ملنے آؤں گی۔ آ سکتی ہوں نا۔''

''بالکل بلا کسی ڈر خوف کے۔''

''میرا نام گلنار ہے اور میرا ٹھکانہ پورے شہر کو معلوم ہے۔ میں شریف گلی میں رہتی ہوں۔''

''بہن میں تم سے ملنے آتا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہاں لوگ بھائی بہن کے رشتے پر شک کریں گے۔''

''میں جانتی ہوں بھیا۔لیکن میں تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔''

''بالکل آنا......ارے معاف کرنا۔ماں بیمار ہے، مجھے سواری لینی ہے۔میں چلتا ہوں۔''

''خدا حافظ بھیا۔''

(۲۵)

ڈاکٹر اکبر کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی امی کو ہرنیا ہے۔اس کا آپریشن جتنی جلد ہو جائے، اچھا ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب آپریشن بڑا تو نہیں۔''

''بالکل نہیں۔بہت چھوٹا اور آسان آپریشن ہے۔''

''ٹھیک ہے میں دو دن کے بعد پھر امی کو اسپتال لا کر بھرتی کر دیتا ہوں۔''

''اب کیسا لگ رہا ہے امی۔''

''طبیعت تو اچھی ہے بیٹا۔''

''خدا کا شکر ہے۔امی پرسوں آپ کو پھر اسپتال لا کر بھرتی کرانا ہے۔ایک چھوٹا سا معمولی آپریشن ہے۔اس کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے''، رقیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا۔آپریشن پھر بھی آپریشن ہے۔''

(۲۶)

گلنار کھولی گلی میں اقبال کے گھر میں داخل ہوئی۔

''اقبال بھائی کا گھر یہی ہے۔''

''ہاں یہی ہے۔تم کون ہو بیٹی۔''

''جی میں اقبال بھائی کی منہ بولی بہن ہوں۔آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہوں بیٹی، اقبال کہہ رہا تھا کہ پرسوں پھر اسپتال جانا ہے، چھوٹا آپریشن ہے''۔

''میں اس فکر میں ہوں کہ میرے اسپتال جانے کے بعد اسکے کھانے پینے کا کیا ہوگا۔''

''اقبال بھائی کہاں ہیں۔''

''پاس میں اپنے دوست کے یہاں گیا ہے۔'' اتنے میں اقبال آ گیا۔

''اچھا گلنار بہن کیسی ہو۔''

''اچھی ہوں بھیا۔ ماں کو دیکھنے آئی تھی۔ اب میں چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی۔''

''ایسا کیا کہ ابھی آئی، ابھی چلی۔ کچھ کھا پی لو۔ ذرا دم لے لو۔''

''نہیں امی اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''جیسی تمہاری مرضی بیٹی۔ اقبال جاؤ اپنی بہن کو چھوڑ آؤ۔''

وہ دونوں شریف گلی کی اور چل پڑے۔

''امی کہہ رہی تھیں کہ وہ دو دن اسپتال میں رہیں گی تو تمہارے کھانے پینے کا کیا ہوگا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ان دنوں میں گھر آ جاؤں، تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھنے کے لیے۔''

مناسب کی کیا بات ہے بہن۔ تمہارا گھر ہے جب آؤ جتنے دن رہو۔ یہاں کوئی بات نہیں ہے لیکن اس سے تمہارے گھر والوں کو......''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔''

''پھر بھی۔''

''دیکھو میں تمہاری بڑی بہن ہوں نا۔ بڑوں کا حکم نہیں ٹالا کرتے۔''

اقبال امی کو لے کر اسپتال گیا۔گلنار بھی ساتھ تھی۔بھرتی میں دیر تھی۔اقبال نے کہا۔
''کیا یہ ممکن ہے بہن کہ تم اس گلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کے گھر آجاؤ۔''

''اس بارے میں پھر بات کریں گے بھیا، پہلے امی کو ٹھیک ہو جانے دو۔''

امی کو اسپتال میں داخل کر کے گلنار اقبال کے گھر آ گئی۔

دوسرے دن صبح اقبال نے نہا کر کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔
''بہن وہ میز پر میرا لاکٹ ہوگا، میں نے نہاتے وقت اتار دیا تھا، ذرا اسے لے آؤ''۔

گلنار نے لاکٹ کو اٹھایا تو اسے وہ مانوس لگا۔وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔
''یہ تو میرا لاکٹ ہے۔یہاں کیسے......؟ ارے میرا لاکٹ تو میرے پاس ہے۔ بالکل ہو بہو میرے جیسا لاکٹ۔''

''بھیا یہ لاکٹ تم نے کہاں سے خریدا؟''

''میں نے اسے نہیں خریدا بلکہ یہ تو بچپن سے ہی مرے گلے میں ہے۔''

''کمال ہے، منی بائی نے مجھے بتایا تھا کہ جب میں اسے ریل کے حادثے کے بعد ملی تھی تو اس وقت یہ لاکٹ میرے گلے میں تھا۔شاید یہ میرے ماں باپ کی نشانی ہے''۔

''ارے یہ تو میرے جیسا ہو بہو لاکٹ ہے۔مجھے امی سے پوچھنا پڑے گا کہ یہ لاکٹ اس نے کہاں سے خریدا ہے۔شاید تمہارے ماں باپ کا پتہ لگ جائے۔چلو اسپتال چلتے ہیں۔''

''امی جیسا لاکٹ میرے پاس بچپن سے ہے، اسی طرح کا لاکٹ بہن کے پاس بھی بچپن سے ہے۔کیا آپ کو یاد ہے کہ میرا لاکٹ آپ نے کہاں سے خریدا تھا۔شاید بہن کے ماں باپ کا کچھ پتہ لگ جائے کیونکہ اس کو پالنے والی نے بتایا کہ یہ اس کو

ریل حادثے والے دن ندی کے کنارے ملی تھی اوراس کے گلے میں یہ لاکٹ تھا۔''

''بیٹا۔ میں نے بھی تو تمہیں ریل کے حادثے والے دن ندی کے کنارے ریت پر ہی پایا تھا۔''

''کیا۔اس کا مطلب تم میری اصلی ماں نہیں ہو۔''

''نہیں بیٹا۔تو مجھ بے کس لاچار کو خدا کا دیا ہوا وہ عطیہ تھا کہ ترے ملنے کے بعد میری زندگی میں جینے کی تمنا جاگی۔ ورنہ اس بھری دنیا کی تنہائی میں تو میں کب کی مر چکی ہوتی۔''اس کے بعد رقیہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ماں باپ شاید ہمیں لے کر ریل گاڑی سے کہیں جارہے تھے کہ راستے میں یہ حادثہ پیش آیا۔شاید ہمارے ماں، باپ، کوئی بھائی، بہن ہواور وہ زندہ ہوں۔ یا نہ ہوں۔''

''خدا بڑا کریم ہے بھیا اس نے اتنے سالوں بعد مجھے میرے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملا دیا ورنہ نہ جانے میرا کیا ہوتا۔''

رقیہ اور اقبال نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

(۲۸)

اقبال پہلی بار شریف گلی میں داخل ہو رہا تھا۔گلنار اس کے ساتھ تھی۔

''اری بیٹی۔تو تو کچھ دن بعد آنے والی تھی.....اور یہ کون ہے؟''

''یہ میرا چھوٹا بھائی اقبال ہے آپا جی جو بچپن میں بچھڑ گیا تھا۔ہم دونوں ہی ریل کے حادثے میں جدا ہو گئے تھے۔ ہمارے گلے میں ایک ہی قسم کا لاکٹ ہے۔ یہ دیکھئے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا بیٹی۔''

''آپا جی۔ میرا بھائی مجھے اس دنیا سے دور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''

''بیٹی۔ جب ایک بار کوئی لڑکی یہاں آجاتی ہے تو اس کے گھر والے بھی اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے جو زمانے سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ورنہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو گھر والوں کو لے جاتے اور پھر ذلت کے ساتھ لڑکیوں کو ہمیشہ کے لیے یہاں آتے دیکھا ہے۔''

''آپ یقین مانئے آپا جی۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے چاہے مجھے یہ شہر چھوڑ کر جانا ہی کیوں نہ پڑے، کتنی ہی مصیبتیں آئیں لیکن میں اپنی بہن کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اس کو ایک شرافت کی زندگی دوں گا۔ اس کی شریف گھر میں شادی کر کے اپنا فرض ادا کروں گا۔''

''مجھے تمہاری باتوں میں سچائی محسوس ہوتی ہے۔ جاؤ گلنار اپنے بھائی کے ساتھ جاؤ۔ تم آزاد ہو۔''

''آپ بہت نیک عورت ہیں آپا۔''

''بیٹی ہم عورتیں جن مجبوریوں میں اس پیشے میں قدم رکھتی ہیں اور زبردستی دھکیل دی جاتی ہیں۔ وہ تم بخوبی جانتی ہو۔ تمہیں یہاں سے آزاد کر کے میں سمجھوں گی کہ میں نے کوئی بڑا نیک کام کیا ہے۔ جاؤ اب جلدی یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنے کپڑے، سامان وغیرہ سمیٹ لو۔ جلدی کرو۔''

''خدا حافظ آپا جی۔''

''خدا تمہیں سلامت رکھے اور عزت کی زندگی عطا فرمائے۔''

(۲۹)

پورن ماشی کی رات آگئی۔ امین نے منی بائی کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''لاؤ منی بائی۔ میری امانت مرے حوالے کرو۔''

''آپ کے پیسے میں نے پہلے ہی میز پر رکھ دیے تھے امین صاحب۔ وہ رکھے ہیں۔گلنار یہاں سے چلی گئی۔''

''اچھا......اور تم نے اسے جانے دیا۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ کسی رئیس زادے نے تمہیں زیادہ پیسوں میں خرید لیا اور تم نے بے ایمانی کی۔''

''نہیں امین صاحب۔ کچھ جذبات، کچھ نیکیاں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ ساری دنیا کی دولت مل کر بھی اس کو نہیں خرید سکتی۔گلنار کا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔اس کے گلے میں بھی وہی لاکٹ تھا جو ریل حادثے کے دوران مجھے ملی،گلنار کے گلے میں تھا۔''

''ریل حادثہ.....''امین کے دماغ پر ایک جھٹکا لگا۔اور وہ منی بائی سے بنا کچھ کہے بغیر روپۓ اٹھائے انتشار کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔

(۳۰)

''امی آپ اچھی ہو کر گھر واپس آ گئیں،بہن بھی آ گئی۔اب میں کام پر جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔خدا کا شکر ہے کہ تمہیں تمہاری بہن مل گئی۔''

''اور مجھے ماں اور بھائی۔'' گلنار نے رقیہ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

اقبال کے گھر کے مسئلوں میں مصروف ہو جانے کے سبب محمود اکیلا پڑ گیا۔اور چالیس کے علاوہ دوسرے لوگ اس سے نہ جڑ سکے۔اگر یہ مہم ناکام ہو جاتی تو محمود کا اور ان چالیس مزدوروں کا کام سے نکالا جانا طے تھا۔اقبال اب اپنے ضمیر کو دبا نہیں سکا۔ محمود تقریر کر رہا تھا کہ اقبال نے اسے پیچھے ہٹا کر خود بولنا شروع کیا۔

''بزدلوں۔کیا زندگی بھر یوں ہی مر مر کے جیتے رہو گے۔کمر توڑ محنت کرنے کے بعد بھی آدھا پیٹ کھاؤ گے اور اپنے بال بچوں کو بھوکا رکھو گے۔ان کی شادی بیاہ کے

لیے لوگوں سے بھیک مانگتے پھرو گے۔ کم ظرفوں، اکتالیس مزدور تمہارے حق کے لیے، اپنے حق کے لیے سرمایہ داری سے لڑ رہے ہیں اور تم ان کا ساتھ دینے کی بجائے مالکوں کے پٹھو بنے ہوئے ہو۔ اس طرح کب تک زندہ رہ سکو گے اور مسائل سے لڑ سکو گے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تمہیں اپنے بیٹیوں اور بہنوں کو بھی اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ان سرمایہ داروں کی عیاشی کے لیے گروی رکھنا پڑے گا۔ یاد رکھو۔"

اقبال پڑھا لکھا تھا اور اب تک اس مہم سے دور تھا۔ لیکن اس کی تقریر میں اتنا جوش تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے مزدور اکٹھا ہو گئے اور آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ ایک مزدور نے جذبات میں چیخ کر کہا۔

"آپ پڑھے لکھے ہیں۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔"

"بالکل میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مرتے دم تک۔"

"تو ہم آپ کو اپنا لیڈر مانتے ہیں، کیوں بھائیوں؟" چاروں اور سے 'ہمیں منظور ہے، ہمیں منظور ہے' کی فلک شگاف صدائیں بلند ہوئیں۔

"بھائیوں! میں آپ کا لیڈر نہیں، آپ کا بھائی ہوں۔ ایک مزدور ہوں اور آپ سے التجا کرتا ہوں کہ محمود کو ہی لیڈر مانیں کیونکہ سب سے پہلے اسی نے ہماری مظلومیت کے خلاف نارۂ احتجاج بلند کیا تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ محمود کو سارے لوگ لیڈر تسلیم کریں اور آپسی مشورے سے جو بھی پروگرام آگے بنے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

"ہمیں منظور ہے۔"

(۳۱)

ہڑتال شروع ہو گئی۔ امین کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے منشی کو بلایا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''یہ سب کیا ہے۔''

''حضور مزدور بونس کی مانگ کر رہے ہیں۔''

''اوفو.....تو ان کے لیڈر کو خرید کر ہڑتال ختم کرادو۔''

''ابھی ایسا ممکن نہیں ہے حضور۔ میں سوچتا ہوں پہلے آپ معاملے کو سمجھ لیں۔ اس کے لیڈر کے تیور بھانپ لیں۔''

''اچھا۔ کون ہے ان کا لیڈر۔''

''لیڈر تو ان کا محمود ہے لیکن وہ ان پڑھ ہے۔ اس کے پیچھے اقبال کا دماغ کام کر رہا ہے جو کہ بی.اے. پاس ہے۔''

''تو پھر بات کس سے کرنی چاہیے۔''

''میرے خیال سے اقبال کو ہی بلا کر بات کرنی چاہیے۔''

''دیکھو اقبال۔ میں سمجھتا ہوں تم میرے آدمی ہو۔ میں نے تمہاری قابلیت دیکھ کر تمہیں نوکری دی۔ لیکن تم میرے خلاف ہو گئے۔ تمہیں انکا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔ تمہاری کوئی ذاتی پریشانی ہو تو تم مجھے بتاؤ۔''

''پریشانی تو میری وہی ہے سر جو سارے مزدوروں کی پریشانی ہے۔ بونس نہیں۔ اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں۔''

''تو تنخواہ لے لو۔ کون تمہاری تنخواہ دباتا ہے۔ ابھی تنخواہ لو اور کام پر آجاؤ۔''

''نہیں سر۔ تنخواہ نہیں دبائی جا رہی ہے بلکہ بونس کی شکل میں ہمارا حق دبایا جا رہا ہے۔ اب تو بونس اور تنخواہ ایک ساتھ ہی لیں گے۔''

''تم جا سکتے ہو۔''

اقبال نے باہر جا کر مزدوروں کو اندر کا واقعہ کہہ سنایا۔ اقبال کی ایمانداری سے مزدوروں میں مزید جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے انقلاب زندہ باد کا ایسا زور کا نعرہ لگایا

کہ امین کے دفتر کے درو دیوار ہل گئے۔

''میں اس کو ختم کرا دوں گا۔''

''کس کو سرکار۔''

''اسی کتے اقبال کو جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتا ہے اور.......''

''سرکار عقل سے کام لیجیے، ایک اقبال مرے گا تو یہ سارے ۱۵۰۰ سے زیادہ مزدور اس کی جگہ لے لیں گے۔اس کو مارنا ہے تو اس کی ضرورت سے ماریئے، یہ خود بہ خود مر جائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سرکار۔اس کی ایک جوان بہن ہے جس کی شادی کے لیے یقیناً اسے اچھے خاصے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ سبھی مزدوروں کی طرح اس کے گھر میں بھی آج کل تنگ دستی چل رہی ہے۔اس متعلق اس سے بات کی جائے تو پوری امید ہے کہ وہ پگھل جائے گا کیونکہ اس قسم کی ضرورت کے آگے بڑے بڑے پتھر دل پگھل جاتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں۔''

(۳۲)

اقبال اپنے گھر میں داخل ہوا۔گلنار اس کی منتظر تھی۔

''بھائی۔بستی میں شور ہے کہ کارخانہ بند ہے اور مزدوروں نے ہڑتال کی ہے۔''

''ہاں بہن۔ہم لوگ اپنے حق کے لیے لڑ رہے ہیں۔خود اپنا پیٹ جلا رہے ہیں اور مالک کا صرف مالی نقصان ہو رہا ہے۔خیر ہم حق پر ہیں، جیت ہماری ہوگی۔کھانے میں کیا ہے؟''

''بھیا۔کچھ دنوں میں راشن کی ضرورت پڑے گی۔''

''کوئی بات نہیں بہن۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

اقبال کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''منشی جی آپ! اس وقت۔''

''ہاں۔ آپ کو مالک نے اس وقت حویلی پر بلایا ہے۔ بہت خاص کام ہے۔''

''اس وقت..... اچھا چلو۔''

وہ امین کی بڑی حویلی میں داخل ہوا۔

''آؤ، اقبال۔ بھئی تم نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔''

''ایک آپ ہی تو اپنے ہیں سر۔ آپ ہماری بات مان لیں۔ ہمارا حق دے دیں۔ ہم کمپنی کو پھر سے اپنی محنت سے عروج پر لے جائیں گے اور آپ کا اس وقت کمپنی بند ہونے سے جو گھاٹا ہوا ہے، وہ بھی ہم اپنی بھرپور محنت سے پورا کر دیں گے۔''

''وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ تم ابھی نئے آئے ہو، محنتی ہو۔ تمہیں اس سے کیا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے گھر میں آج کل تنگ دستی ہے اور تمہاری بہن کی شادی کے لیے بھی روپئے چاہئیں۔ دیکھو تم تو ابھی نئے آئے ہو تین سال کے بونس سے تمہارا کوئی مطلب تو ہے نہیں۔ اور پھر تم تو مزدور بھی نہیں ہو، پڑھے لکھے کلرک ہو جو آگے بہت ترقی کر سکتا ہے۔''

''اسی طرح کی باتوں سے سرمایہ داری آج کل حاوی ہے جناب۔ بیدار ذہنوں کو خرید کر، ان کو اپنی طرح آسائشیں دے کر ان کو اپنے گروہ میں شامل کر کے مظلوموں کو اکیلا کر دیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے سر کہ میں کسی بھی حال میں اپنے مزدور بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔''

امین اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا اور اقبال وہاں سے واپس آ گیا۔

(۳۳)

منشی بھاگتا ہوا امین کی حویلی میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے۔ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''حضور سرکاری افسر آیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے سرکار تک بھی ہڑتال والی بات پہنچ گئی۔''

''کوئی بات نہیں حضور، میں تو آپ سے یہ کہنے کے لیے پہلے ہی دوڑتا ہوا آیا ہوں کہ آپ کچھ روپئے نکال لیں۔ جتنا زیادہ روپیوں کا وزن ہوگا یہ افسر اتنی ہی ہلکی رپورٹ آپ کے خلاف بنائے گا۔ یا پھر ادھر ادھر کر کے معاملے کو پوری طرح رفع دفع ہی کر دے گا۔''

''ہوں۔''

سرکاری افسر اندر داخل ہوا۔

''آیئے حضور۔ تشریف رکھئے۔''

''امین صاحب۔ آپ کی کمپنی میں شاید کچھ ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔ مزدوروں نے ہڑتال کی ہے۔ مجھے سارے واقعے کی رپورٹ سرکار کو بھیجنی ہے۔ اس لیے.......''

افسر اپنے جملے پورے بھی نہ کر پایا تھا کہ امین نے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ افسر انہیں کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔

''دراصل جناب یہ مزدور بڑے مفت خور ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے کارخانہ گھاٹے میں ہے۔ اگر ایک کو نکالو تو سارے ایک ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ظلم مجھ پر ہو رہا ہے۔ کارخانہ بند ہے گھاٹے پر گھاٹا۔ بتایئے میں کہاں جاؤں اپنی فریاد لے کر۔ پولیس، کورٹ میں جاؤں تو انہیں تکلیف ہوگی۔ ان کی تکلیف دیکھ کر مجھے تکلیف ہوگی۔ آخر ہیں تو یہ سب میرے ہی پالے ہوئے۔ آپ سمجھ گئے نا۔'' امین نے نوٹوں کی گڈی کو

آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔افسر نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ درست فرماتے ہیں امین صاحب۔ یہ مزدور قوم ہوتی ہی کام چور ہے۔ جب مصیبت میں ہوتے ہیں تو ہاتھ پیر جوڑ کر نوکری مانگتے ہیں اور جب پیٹ کچھ بھرنے لگتا ہے تو اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔اچھا میں چلتا ہوں۔آپ فکر نہ کریں۔ میری رپورٹ آپ ہی کی حمایت میں جائے گی۔

(۳۴)

''دوستو! ہم نے ہڑتال کر کے دیکھ لی۔لیکن مالک نے کسی بھی طرح ہمارا ساتھ نہیں دیا۔اس لیے ہمیں بھوک ہڑتال کے لیے مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔کل سے بھوک ہڑتال شروع ہوگی۔''

سرکاری افسر نے امین سے کہا۔

''امین صاحب! مزدوروں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔شہر میں چاروں اور اس کا چرچا ہے۔ حکومت کو خوف ہے کہ بھوک ہڑتال کے دوران فساد نہ پھیل جائے۔قانونی نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔آپ کو کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ ہڑتال ختم ہو۔ کیونکہ عام ہمدردیاں بھی مزدوروں کے ساتھ ہوتی جا رہی ہیں۔سیاسی جماعتیں بھی اپنا ووٹ بڑھانے کے لیے ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔شہر بھر کے امیروں کے خیالات بھی آپ کے خلاف ہیں کہ آپ مسئلے کو سہی طرح سلجھا نہیں پا رہے ہیں اور اس طرح ان کے ملازمین کو بھی بہک جانے کا خطرہ ہے۔میں کیا کروں۔''

امین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔منشی نے اشارہ کیا اور سمجھایا۔

امین نے ہنستے ہوئے کہا ''جناب آپ کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ حکومت کے کان بھرے۔اب آپ اس مسئلے کو اور اس کے متعلق شہر کے لوگوں کے

خیالات کو اتنا سمجھتے ہیں تو اس کا حل بھی اگر آپ کی نظر میں کوئی ہو تو تجویز کریں۔ پیسوں کی فکر نہ کریں۔''

''کام مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کافی رقم خرچ ہوگی تقریباً ۲۰؍ہزار روپئے۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوئی ایسا راستہ سوچتا ہوں کہ جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

(۳۵)

اقبال بھوک ہڑتال پر بیٹھ گیا۔ محمود باہر لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی طرح تین دن بیت گئے۔ مسئلہ حل نہ ہوا۔ اقبال کی طبیعت بگڑنے لگی۔

''اقبال سب ٹھیک تو ہے۔''

''ہاں محمود۔ لیکن سر میں درد ہو رہا ہے اور کچھ چکر بھی آ رہا ہے، شاید کمزوری کے سبب۔''

''اچھا۔ تب تو تمہیں گھر جانا چاہیے۔ ہڑتال تو تم وہاں بھی جاری رکھ سکتے ہو۔''

''نہیں یار گھر گیا تو ماں اور بہن پریشان ہو جائیں گی اور ممکن ہے محبت میں آ کر مجھے ہڑتال توڑنے کو کہیں۔''

''اچھا..... تو ایسا کرتے ہیں تم میرے جھونپڑے میں چلو، وہاں تمہیں آرام ملے گا۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ محمود کی بہن رضیہ نے دروازہ کھولا۔

''رضیہ یہ میرے دوست اقبال ہیں جو کہ بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ انہیں آرام کرنا ہے۔ تم ان کی دیکھ بھال کرو۔ تب تک میں

ہڑتال والی جگہ جا کر مزدوروں سے آگے کے پروگرام کے متعلق مشورہ کرتا ہوں۔"

رضیہ نے سہارا دے کر اقبال کو چارپائی پر لٹایا۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے مل گئے۔ محبت کی کونپل پھوٹی۔ رضیہ شرما گئی۔ اقبال کے دل میں بھی کچھ ہوا۔ رضیہ اس کا سر دبانے لگی۔ اقبال اس کی نگاہوں اور اس کی خوبصورتی میں گم ہو گیا۔ نگاہوں اور دلوں نے کتنے ہی وعدے ارادے کیے۔

"رضیہ تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے۔ میرا سر درد کم ہو گیا۔ چکر کا اثر بھی نہیں رہا۔"

"آپ سلامت رہیں۔ آپکی زندگی سارے مزدوروں کے لیے بڑی قیمتی ہے۔"

"اور تمہارے لیے" اقبال نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔"

"اس کے لیے آپ کو بھائی جان سے بات کرنی پڑے گی۔ میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔"

وہ شرما کر کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اٹھ گئی۔ اقبال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

رقیہ اور گلنار تک یہ خبر پہنچ گئی کہ اقبال کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ دونوں بھاگی ہوئی ہڑتال کی جگہ پہنچیں۔ وہاں محمود سے ملاقات ہوئی۔

"بیٹا اقبال کہاں ہے۔ کیسا ہے؟"

"آپ فکر نہ کریں امی، وہ میرے گھر پر ہے اور اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔ چلئے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔"

راستہ اونچا نیچا تھا۔ یکا یک گلنار کا پھیر پھسلا۔ وہ گرنے والی تھی کہ محمود نے اسے اپنی بانہوں کا سہارا دیا۔ گلنار تو سنبھل گئی لیکن دل بے قابو ہو گیا۔ دو جوان جسموں کے لمس نے دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری پیدا کر دی۔

"سنبھل کر بیٹی۔"

"جی.....جی امی۔"

''ارے امی، بہن آپ..... یہاں'' اقبال نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ محمود باہر چلا گیا۔

''لیٹے رہو بیٹا کیسی طبیعت ہے۔''

''ٹھیک ہوں امی۔ گلنار بہن ان سے ملو یہ رضیہ ہے۔ محمود کی بہن۔''

دونوں گلے ملیں۔ گلنار نے رضیہ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ رضیہ کھانا بنانے لگی تو گلنار نے پورے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ جس سے جھونپڑا چمک اٹھا۔ رضیہ نے آواز لگائی کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔

''بہن ذرا محمود کو بلا لاؤ۔ سب ساتھ مل کر کھانا کھالو۔ میں تو ہڑتال پر ہوں، کم سے کم آپ لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر ہی تسلی کر لوں گا''، اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان آپ کو بلا رہے ہیں کھانے کے لیے۔''

''آپ لوگ کھا لیجیے میں یہاں مزدوروں میں تھوڑی دیر بیٹھوں گا۔ شام کو آؤں گا''۔

گلنار کھڑی رہی۔

''آپ جائیے اور کھانا کھا لیجیے۔'' محمود نے بڑے پیار سے کہا۔ گلنار کے منہ سے یکا یک نکل پڑا۔

''آپ کے بغیر مجھ سے کیسے کھایا جائے گا۔''

دل کی بات کو دل نے محسوس کیا۔ محمود نے کہا۔

''اچھا چلیے۔ راستے میں گلنار نے دوبارہ ڈگمگانے کے ڈر سے محمود کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح چلنے لگی جیسے زندگی بھر کا سہارا مانگ رہی ہو۔ محمود نے بھی اس کو اسی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ گھر کے پاس دونوں الگ ہو گئے۔ محمود جب گھر کے اندر آیا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ارے واہ! یہ اپنا ہی گھر ہے، رضیہ تم نے کیا صفائی کی ہے، بالکل چمک گیا ہے''۔

''بھائی جان یہ میں نے نہیں گلنار نے کیا ہے۔ ہیں تو کھانا بنا رہی تھی۔ چلئے سب لوگ کھانا کھاتے ہیں۔''

کھانے کے بعد گلنار زبردستی جوٹھے برتنوں کو دھونے بیٹھ گئی۔ رضیہ نے منع کیا تو بولی...... ''میرا ہی تو گھر ہے'' رضیہ مسکرائی۔ محمود نے بھی سنا اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔

''امی اب میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میں ہڑتال کی جگہ پر مزدوروں کے پاس جاتا ہوں۔ محمود! تم امی اور گلنار بہن کو گھر چھوڑ کر وہیں آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم اکیلے مت جاؤ۔ رضیہ! اقبال کو سہارا دے کر کمپنی باغ ہڑتال والی جگہ تک لے جاؤ۔''

راستے میں امی ذرا پیچھے رہ گئیں تو محمود نے گلنار سے کہا۔

''آپ نے صفائی کر کے میرے گھر کو بالکل چمکا دیا۔''

''آپ کو پسند آیا۔''

''اتنا پسند آیا کہ جی چاہتا ہے ان صفائی کرنے والے ہاتھوں اور اس چاند کے چہرے کو چوم لوں۔ اسے اپنے گھر میں رکھ لوں اور زندگی بھر اپنے سے جدا نہ کروں۔''

''اس کے لیے آپ کو امی سے بات کرنی پڑے گی۔''

(۳۶)

بھوک ہڑتال کے بعد بھی مالک کی طرف سے کوئی بات چیت نہ ہونے سے مزدور مشتعل ہو اٹھے۔ انہوں نے سیٹھ کی حویلی تک جلوس نکالنے کا ارادہ کیا۔ آناً فاناً ۱۵۰۰ سے زائد مزدوروں کا جلوس تیار ہوا اور حویلی تک آ پہنچا۔

''سیٹھ مردہ باد۔ مزدوروں پر ظلم بند کرو۔ ہمیں ہمارا حق دو۔ انقلاب زندہ باد۔''

اندر سے کوئی آواز نہ آنے پر مزدوروں کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ ایک مزدور نے

آواز لگائی۔

''ظلم کی حد ہوتی ہے۔ اگر سیٹھ یہی چاہتا ہے کہ ہم لوگ بھوکے مرجائیں تو ٹھیک ہے۔ ہم بھی سیٹھ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چلو بھائیوں سیٹھ کی حویلی میں آگ لگا دو اور سیٹھ کو زندہ جلا دو۔ وہ بھی دیکھ لے کہ جب مزدور بغاوت پر آتا ہے تو سرمایہ دار کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

منشی دوڑتا ہوا آیا۔ امین اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

''صاحب.... صاحب.... فوراً یہاں سے بھاگ جائیے۔ مزدوروں کے دلوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آگ کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ حویلی میں آگ لگا رہے ہیں۔ آپ فوراً یہاں سے فرار ہو جائیے ورنہ اگر وہ آپ کو دیکھ لیں گے تو پکڑ کر زندہ جلا دیں گے۔''

امین کے ہوش اڑ گئے۔ یہ کیا ہو گیا۔ اس کا گمان تو اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ وہ بدحواس پیچھے کے دروازے سے نکل بھاگا۔ حویلی میں آگ لگا دی گئی۔

امین بھاگتا بھاگتا اقبال کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اب اس میں اور بھاگنے کی سکت نہ تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے گلنار نے دروازہ کھولا۔

''تم!'' گلنار کو وہاں دیکھ امین بھی حیران تھا لیکن یہ وقت حیران ہونے کا نہیں تھا۔

''گلنار مجھے بچالو۔''

''تمہیں بچالوں۔ جس نے میرے بھائی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ تو انسان نہیں درندہ ہے۔ جو غریبوں کا لہو پیتا ہے۔ میں ابھی تیرا انتظام کرتی ہوں۔ تو نے میرے بھائی اقبال اور مزدوروں کو بھو..........''

گلنار نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امین نے اس کے منہ پر کس کر ہاتھ رکھ دیا۔ گلنار تڑپنے لگی لیکن امین نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ گلنار بے ہوش ہو گی۔ امین نے اس کو

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

آہستہ سے دیوار سے لگایا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں گلنار کے گلے کا لاکٹ آ گیا۔ امین اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''یہ تو ویسا ہی لاکٹ ہے جیسا میں نے اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالا تھا اور بعد میں شبنم نے ویسا ہی بیٹی اور چھوٹے بچے کو بھی پہنا دیا تھا''۔ پھر اسے منی بائی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔

اس کا مطلب گلنار میری بیٹی اور اقبال میرا بیٹا ہے۔ اف..... خدایا..... اسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

وکیل کے دروازے پر دیر رات دستک ہوئی، وکیل نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا...... ''ارے امین صاحب..... اس وقت''۔

''ہاں وکیل صاحب۔ معاف کیجیے۔ اتنی رات کو آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں۔''

''اتنی رات کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔''

''میں ابھی ابھی شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑا آرام کروں گا۔''

''اچھا بولئے کیا وصیت کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں اپنی ساری جائداد آدھی آدھی اقبال اور گلنار کے نام کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ اقبال تو وہی ہے نا جو آپ کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھا ہے اور یہ گلنار کون ہے؟''

''ہاں اقبال وہی ہے اور گلنار میری...... میرا مطلب ہے اس کی بہن ہے۔''

وصیت پر دستخط کرنے کے بعد امین بے نام، بے سمت منزل کی جانب چل پڑا۔ اس کا ضمیر پھر اسے کتوچ رہا تھا اور اب اس میں ضمیر کو سلا دینے یا دھوکہ دینے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔

(۴۷)

حویلی میں جیسے ہی آگ لگائی گئی۔ اسی وقت پولیس اور آگ بجھانے والا عملہ پہنچ گیا اور آگ پر فوراً قابو پالیا گیا۔ معمولی سا نقصان ہوا۔ اقبال اور محمود چیخ چیخ کر مزدوروں کو روک رہے تھے کہ اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوگا لیکن مزدور اس قدر مشتعل تھے کہ ان کی چیخوں پر بھی توجہ نہ کی آخر کار پولیس کارروائی سے معاملہ قابو میں آ گیا۔
امین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس افسر نے کہا۔

''مسٹر اقبال۔ آپ فکر نہ کیجیے۔ آپ لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔ دراصل ایک سرکاری افسر رشوت لے کر سرکار کو غلط رپورٹیں دے رہا تھا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے اور جیل میں ہے۔ اس کی گواہی پر ہی ہم امین سیٹھ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

''جناب میرا کبھی ارادہ نہ تھا کہ ہمارے سیٹھ کو کوئی نقصان پہنچے۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ ہمیں ہمارا حق مل جائے۔ یہ سب جو کچھ بھی ہوا، حالات کی مجبوری کے تحت ہوا۔ آخر بھوکے ننگے لوگ کب تک ضبط کرتے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جب پیٹ میں آگ لگی ہو اور کوئی راستہ نہ سوجھ رہا ہو تو پتھر سے پتھر دل ضبط کا بند توڑ دیتا ہے۔ یہ تو فطرت ہے۔ آپ پر اور آپ کے مزدور بھائیوں پر کوئی مقدمہ صادر نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ بس انہیں کہیں کہ جیسے اتنا صبر کیا ہے۔ ویسے کچھ دن اور اگر امین سیٹھ فرار بھی ہو گیا تو اس کی جائداد بکوا کر سرکار آپ لوگوں کا حق آپ کو دے گی۔''

اتنے میں وکیل وہاں آ گیا اور اس نے اقبال کو وصیت دیتے ہوئے رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔

''اب آپ اور آپ کی بہن گلنار اس ساری جائداد کے آدھے آدھے مالک ہیں۔''

اقبال کچھ سوچتا رہا۔ پھر مزدوروں کو اکٹھا کر کے ان سے مخاطب ہوا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''دیکھا ساتھیو! جب انسان کا ضمیر جاگتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ ہم شاید اپنے سیٹھ کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ جب بھی واپس آئیں گے ہم سب ان سے معافی مانگیں گے اور ان کی جائداد انہیں واپس کریں گے۔''

''لیکن تب تک تو آپ ہی مالک ہیں۔ جب تک سیٹھ واپس نہیں آجاتے آپ ان کی جگہ حویلی میں رہ کر ان کا کاروبار چلائیں۔'' محمود کے اس مشورے پر سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

رقیہ، اقبال اور گلنار حویلی میں آگئے۔ اگلے دن محمود اپنی بہن رضیہ کے ساتھ ان سے ملنے آیا۔

''ارے آؤ بیٹے محمود، بیٹی رضیہ۔ ارے اقبال، گلنار، دیکھو تو کون آیا ہے۔''

اقبال اور گلنار نے محمود اور رضیہ کو دیکھا تو دونوں کے دل کھل اٹھے۔ اقبال اور محمود اور رضیہ اور گلنار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ سارا دن سب ایک ساتھ رہے۔ لیکن اقبال اور رضیہ اور گلنار اور محمود زیادہ سے زیادہ تنہائی کی تلاش میں رہے اور وقت ملتے ہی ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال دیتے۔ ساتھ جینے مرنے کے وعدہ ہونے لگتے۔ بوڑھی رقیہ کی آنکھوں نے بھی سب کچھ دیکھ لیا اور سارا معاملہ بھانپ لیا۔ جب رات کو سب کھانے پر اکٹھا تھے تو رقیہ نے بات چھیڑی۔

''بیٹا میں چاہتی ہوں کہ اب جبکہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو تمہاری اور گلنار کی شادی کردی جائے۔''

اقبال نے کہا...... ''ارے امی.....''

''نہیں بیٹا۔ اب میں تمہاری ایک بھی نہیں سنوں گی۔''

''لیکن امی..... گلنار میری بڑی بہن ہے۔ پہلے اس کی شادی کرلوں اس کے بعد اپنی شادی۔''

''کیوں نہ دونوں کی شادی ایک ساتھ ہو جائے۔''

''کیسے؟''

''تمہاری رضیہ سے اور گلنار کی محمود سے۔ کیوں گلنار، رضیہ، محمود میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا''۔

سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور پھر ایک ساتھ امی سے لپٹ گئے۔

اقبال کی شادی رضیہ اور گلنار کی شادی محمود سے ہو گئی۔

(۳۸)

ڈاکٹر عتیق اپنے اسپتال جو کہ جادو نگر میں تھا، کے لیے نکلا ہی تھا کہ راستے میں ایک ضعیف العمر شخص جو کہ بے ہوش پڑا ہوا تھا، کو دیکھ کر اپنی کار رکوائی، اسے ساتھ لیا اور اسپتال لایا۔

''نرس لگتا ہے کہ یہ کمزوری سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ان کو دیکھو۔''

شام کو ڈاکٹر عتیق بوڑھے شخص سے ملنے گیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے بابا۔''

''ٹھیک ہوں بیٹا۔ میں یہاں کیسے آیا۔ میں تو شاید سڑک پر بے ہوش.......''

''جی ہاں۔ میں آپ کو یہاں لایا ہوں۔ اب آپ اپنے گھر کا پتہ دیجیے تو میں آپ کو وہاں بھجوا دوں۔''

''میرا کوئی نہیں ہے بیٹا۔''

''اچھا تو پھر اس بڑھاپے میں آپ کہاں جائیں گے۔ یہیں رہ جایئے۔ یہ ایک چیرٹی اسپتال ہے، یہاں مریضوں کی خدمت کیجیے۔ آپ کو ثواب بھی ملے گا اور یہاں آرام سے رہ سکتے ہیں۔''

لمحے

وحشی سعید نمبر

امین نے سوچا کہ یہی اس کے گناہوں کا ازالہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان جیسے غریبوں، مظلوموں اور بے سہاروں جن کا اس نے خون چوس چوس کر کے اتنی بڑی جائداد بنالی تھی کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دے۔

"ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔ جو خدا کی مرضی۔"

وہ بوڑھا شخص دن رات مریضوں کی خدمت میں جٹ گیا۔ ایک دن ڈاکٹر نے اس سے کہا...... "بابا! آپ اس قدر جنون سے ان مریضوں کی خدمت میں لگ گئے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ کو بہت ثواب کمانے کی جلدی ہے یا پھر اپنے گذشتہ گناہوں کا ازالہ کر رہے ہیں۔"

"دونوں ہی باتیں ہیں بیٹا۔"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا بابا میں تو یوں ہی آپ سے دل لگی کر رہا تھا"۔

بہت دنوں بعد بوڑھے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اسی وقت ایک نرس ڈاکٹر کے پاس آئی "سر کوئی بھی اسٹاف ہمارے ساتھ چلنے کے لیے راضی نہیں ہے"۔

"لیکن تم نے بتایا نہ کہ ماسک پہن لینے سے ہیضہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"بتایا لیکن پھر بھی سب خوفزدہ ہیں۔"

"اوہو...... یہ تو بہت برا ہوا۔ اگر ایک اسٹاف بھی جانے کو راضی ہوتا تو ہم تین بھی اس گاؤں میں پہنچ کر بہت کچھ کر سکتے تھے۔"

"کیا بات ہے بیٹا..... گاؤں...... ہیضہ....."

"کچھ نہیں بابا۔ یہاں سے ۴۰ کیلومیٹر دور ایک گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہے۔ میں نے اسٹاف سے کہا کہ ماسک پہن کر چلیں۔ کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور مریضوں کی خدمت بھی ہو جائے گی لیکن ......"

"میں چلتا ہوں بیٹا۔"

''بابا آپ بوڑھے ہیں۔ وہاں دوڑ دھوپ والا کام ہے میں چاہتا تھا کہ کوئی نوجوان....آپ رہنے دیں میں کچھ......''

''کیا بات کرتے ہو بیٹا۔ ابھی تم نے جنون کی بات کی۔ کیا تم بھول گئے کہ خدمت کا جنون مجھ سے وہ کام بھی کرا سکتا ہے جو کہ جوان بھی نہیں کر سکتے۔''

''بابا زندہ باد۔ نرس چلنے کی تیاری کرو۔''

(۳۹)

کافی دن ہو گئے لیکن امین سیٹھ لوٹ کر نہیں آئے۔ اقبال کو بڑی فکر ہوئی، اس نے امی، گلنار، رضیہ اور محمود سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے تھی کہ اب اخبار میں اشتہار دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے اخبار میں گمشدگی اور گھر واپس چلے آنے کا اشتہار دے دیا گیا۔

بوڑھے نے گاؤں جا کر ہیضہ کے مریضوں کی وہ خدمت کی کہ ڈاکٹر عتیق حیرت زدہ رہ گیا۔ بوڑھا خود میں ایک تنظیم تھا اور جس طرح وہ خدمت کا کام انجام دے رہا تھا وہ نوجوانوں کی ایک پوری تنظیم کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر کھو جاتا کہ اس کی ماسک لگانے اور نہ لگانے پر بھی توجہ نہیں رہتی۔ ڈاکٹر عتیق نے کئی بار اس سے کہا۔

''بابا۔ ماسک لگانے کا خیال رکھا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان بیماروں کو ٹھیک کرتے ہوئے تم خود اس بیماری کی زد میں نہ آ جاؤ۔ خود کو بچانے کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے''۔

لیکن بوڑھے کو ہوش کہاں تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پورا گاؤں تو ہیضے کی زد سے بچا لیا گیا لیکن بوڑھا اس کی شدید زد میں آ گیا۔ اسے اسپتال میں داخل کیا گیا۔

وحشی سعید نمبر

ڈاکٹر عتیق گھر پر صبح صبح اخبار دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کی نظر اخبار کے اشتہار پر پڑی جس پر بوڑھے بابا کی تصویر بھی لگی تھی۔

''ہمارے امین سیٹھ صاحب۔آپ کہاں ہیں۔مہربانی کر کے واپس آجایئے اور اپنا اتنا بڑا کاروبار اور جائداد سنبھالیے۔ہمیں معاف کر دیجیے۔ہم نے آپ کو غلط سمجھا اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ سے کوئی گناہ ہوا تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجیے۔آپ کو یہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔سب آپ سے معافی کے طلب گار اور آپ کے منتظر ہیں۔''

اقبال
منیجر

ڈاکٹر عتیق غور وفکر میں ڈوب گیا۔اتنا بڑا آدمی جو مجھ جیسی حیثیت والے سینکڑوں کو خرید سکتا ہے۔میرا ملازم بنا ہوا ہے۔آج اس سے پوچھتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔

(۴۰)

''بابا۔کیسی طبیعت ہے۔''

''لگتا ہے جانے کا وقت آگیا ہے بیٹا۔''

''بابا آپ مجھے اپنا بیٹا کہتے ہی ہیں یا واقعی بیٹا مانتے بھی ہیں۔''

''کیا کہتے ہو بیٹا۔ جب میں بے ہوش پڑا زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ زندگی بے مقصد، بے معنی ہوگئی تھی۔تو تم نے مجھے بچایا۔زندگی کا ایک عظیم مقصد دیا۔ جس سے مجھے اپنے پچھلے گناہوں کی کچھ حد تک تلافی کا موقع نصیب ہوا..... بوڑھا جذبات کی رو میں بہہ گیا۔''

''دیکھو بابا۔اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں کچھ حد تک جان گیا ہوں کہ

وحشی سعید نمبر

آپ کون ہیں۔ آپ سمندر نگر کے سب سے بڑے رئیس امین سیٹھ ہیں جو اس ملک کے سب سے بڑے کپڑے کے کارخانے کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی اتنی جائدادیں ہیں کہ نسلوں کی نسلیں بیٹھ کر کھائیں تو بھی ختم ہونے میں عرصہ لگ جائے۔ میں پوری بات جاننا چاہتا ہوں۔ شروع سے آخر تک۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔ بیٹا کہا ہے تو اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بولنا۔''

امین مجبور ہو گیا۔ اس نے اول تا آخر سارا واقعہ کہہ سنایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''بیٹا میں بہت بڑا گنہگار ہوں۔ اپنی بیوی بچوں کا، مزدوروں کا..... سب کا۔''

''نہیں بابا۔ آپ اب گنہگار نہیں رہے۔ آپ کی خدمت خلق نے آپ کے سارے گناہوں کا ازالہ کر دیا۔ پوری امید ہے کہ خدا بھی آپ کو معاف کر دے گا۔ کیونکہ آپ کے بچوں اور مزدوروں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ یہ دیکھئے۔'' اخبار سے اشتہار والا صفحہ کھول کر اس نے امین کے آگے رکھ دیا۔

''خدا تیرا شکر ہے۔ لیکن بیٹا میں یہاں سے سیدھا اب مالک حقیقی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اب میں گھر بار، دھن دولت کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بس یہیں مریضوں کی خدمت کرتے ہوئے مر جانا چاہتا ہوں۔''

''جیسی آپ کی مرضی بابا۔ لیکن آپ کے بچوں کو اطلاع تو دے دوں کہ آپ یہاں ہیں۔''

''بیٹا پھر شاید میں بچوں کی محبت میں پھنس کر اس عظیم مقصد کو چھوڑ بیٹھوں۔ میرا ضمیر بڑا لچکدار ہے۔ زندہ، مردہ ہوتا رہتا ہے۔ تم بچوں کو اطلاع دے کر مجھے اس عظیم مقصد سے دور مت کرو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ بچوں کو نہیں لیکن منیجر کو تو اس کے مالک کی اطلاع دے سکتا

ہوں۔ان کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ آپ کے بچے ہیں۔آپ ان سے مل کر دل کو ٹھنڈا بھی کر لیجیے گا اور ان سے کہہ بھی دیجیے گا کہ آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ کاروبار وہ سنبھالیں اور یہاں آتے جاتے رہیں۔اس طرح آپ کا دل بھی ٹھنڈا رہے گا اور آپ کا عظیم مقصد بھی پورا ہوتا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔''

(۴۱)

''منیجر صاحب.....'' منشی دوڑتا ہوا آیا۔''مالک کی خبر مل گئی۔ جادونگر کے ایک اسپتال سے تار آیا ہے۔''

''جلدی دکھاؤ۔''

تار پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں خوشی سے نم ہوئی جارہی تھیں لیکن آخری سطر نے اس کے خوشی کے آنسوؤں کو غم کے آنسوؤں میں تبدیل کر دیا۔

''ان پر ہیضہ کا شدید اثر ہے۔جتنی جلد ممکن ہو آجایئے۔''

رقیہ، گلنار، رضیہ اور محمود کو ساتھ لے کر اقبال اسی وقت جادونگر کے لیے روانہ ہو گیا۔اسپتال پہنچ کر نرس سے دریافت کیا۔

''امین سیٹھ کس نمبر کے کمرے میں ہیں۔''

''کمرہ نمبر ۱۰ میں لیکن......''

نرس کے جملے کو ادھورا چھوڑتے ہوئے اقبال بھاگتا ہوا امین کے کمرے میں داخل ہوا۔وہاں سناٹا تھا۔امین مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ڈاکٹر عتیق خاموش کھڑا تھا۔اس نے اقبال سے کہا۔

''آپ نے آنے میں تھوڑی دیر کر دی۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

رقیہ،گلنار،رضیہ،محمود بھی اندر آ گئے۔وہ سب امین کے جسم سے لپٹ کر رونے لگے۔

اقبال نے خوب رو کر دل ہلکا کرنے کے بعد ڈاکٹر سے کہا۔

''ڈاکٹر یہ ہمارے مالک ہیں۔ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔کیا ہم ان کے جسد خاکی کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔''

''بالکل لے جاسکتے ہیں جناب اور چونکہ یہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور حقیقت کو اب کھل بھی جانا چاہیے تو میں آپ کو بتادوں کہ ان کے وارث بھی موجود ہیں۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔''

''کیا.....کہاں ہیں۔ہم ان کے والد کی ساری جائداد انہیں سونپ دیں گے۔''

''آپ کو ان کی جائداد کسی کو سونپنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ ان کے بیٹے اور گلناران کی بیٹی ہے۔''اور پھر ڈاکٹر نے ساراواقعہ کہہ سنایا۔

اقبال اور گلنار زار و قطار رونے لگے۔روتے روتے اقبال نے امین کے سر سے چادر ہٹائی تو اسے یوں لگا جیسے کہ ان لوگوں کے طویل انتظار کے بعد ان کے والد کی آنکھیں بند ہوئی ہوں۔چہرے پر عجیب دلکش سکون تھا۔اقبال کو یوں لگا جیسے اس کے والد کے مردہ چہرے کے نور سے پورا کمرہ روشن ہو گیا ہو۔

☆☆☆

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

قحط

(۱)

ارشد آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ اکبر نے کھیت میں داخل ہوتے ہوئے کہا......

''کاکا، بارش ہوسکتی ہے۔''

ارشد اور اکبر کی عمر میں کوئی خاص فرق نہیں تھا لیکن ارشد کی گاؤں میں بڑی عزت تھی اور اس لیے احتراماً اسے تقریباً تمام ہم عمر کاکا کہتے تھے۔

''انشاءاللہ بارش ہوگی۔''

''جب بارش ہوگی تو فصل اچھی ہوگی لیکن خون ہم بہائیں، دعاؤں کے لیے ہاتھ ہم اٹھائیں، اپنے پسینے کو خون بنا کر کھیتوں کو ہم سینچیں اور جب فصل ہو تو جاگیردار اپنے گھوڑے پر ڈنڈے برساتا ہوا آئے اور ہماری محنت سے پیدا کیے ہوئے اناج سے تین چوتھائی لے جائے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''اکبر ہر زمانے میں امیر ہمارے سر پر رہا ہے۔ کبھی جاگیردار کی صورت میں، کبھی زمیندار کی صورت میں، کبھی کسی اور صورت میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایسا انقلاب آنا چاہیے جس سے امیری اور غریبی کا فرق مٹ جائے۔ دراصل امیر ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن امیرانہ ذہنیت بری شئے ہے جو اپنے جیسے مفلس انسانوں کو انسان نہیں سمجھتی بلکہ انہیں اپنا غلام سمجھتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے اور جاگیردار صاحب کے تعلقات کیسے چل رہے ہیں۔''

''کیا بتاؤں کاکا، جاگیردار صاحب سے گزارش کی تھی کہ میری تنخواہ بڑھا دیجیے۔ لیکن انہوں نے الٹے مجھے ہی چار باتیں سنا دیں۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ تمہارا بیٹا انور کیسا ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''ارے وہ تو تمہارے بیٹے کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا ہے۔ سچ بتاؤں دوست تو رقیہ کے مرنے کے بعد میری زندگی کے بس جاوید ہی ایک سہارا رہ گیا ہے۔ یہی آس ہے کہ ایک دن اس کا ستارہ چمکے گا اور میں اس کی روشنی میں زندگی کے الجھے ہوئے پلوں کو سلجھاؤں گا۔''

''ہاں اکبر۔ میں نے بھی یہی امید اپنے بیٹے جاوید سے باندھی ہے۔ اس کی ماں اس کو بڑا آدمی بنانا چاہتی ہے۔ دیکھتے ہیں، یہ ہاتھ کب تک ساتھ دیتے ہیں۔''

اتنے میں جاوید اور انور ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے دکھائی دیئے۔

''کہاں جا رہے ہو بچوں؟''

''ہم جاگیردار پارک کھیلنے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن جلدی لوٹ آنا۔''

''جی اچھا۔''

جاگیردار پارک میں جاگیردار کی چھوٹی سی پری جیسی بیٹی نسرین بھی کھیل رہی تھی۔

''ارے جاوید اور انور تم آ گئے۔ چلو کھیلتے ہیں۔''

جاوید نے کہا۔

''لیکن نسرین تمہیں تو انور کے ساتھ کھیلنا زیادہ پسند ہے۔ مجھے کھیل کے بیچ میں چھوڑ کر تم اور انور اتنے مگن ہو جاتے ہو کہ مجھے لگتا ہے میں کھیل میں ہوں ہی نہیں۔''

(۲)

کھیتوں کی رانی اپنے بچوں پر مہربان تھی۔ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ شاید اس سال قدرت کو رحم آ گیا تھا۔ پچھلے سال کے قحط نے کسانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ابکہ فصل نے ان کو زندگی کی کچھ آس بندھائی تھی۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

جاگیردار گھوڑے پر سوار چابک لہراتے ہوئے اپنا حصہ وصول کرنے نکلا۔ ارشد کے کھیت پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''فصل تو کافی اچھی ہوئی ہے کاکا۔''

''جی جاگیردار صاحب۔''

''کاکا۔ تم نے مجھ سے کچھ روپئے قرض لیے تھے۔''

''جی ہاں جاگیردار صاحب۔ چالیس روپئے لیے تھے۔''

''اس چالیس روپیوں کی شالی چھوڑ دینا۔''

''جاگیردار صاحب میں وہ روپئے آپ کو نقد لوٹا دوں گا۔''

''کیسے؟''

''منڈی میں فصل فروخت کر کے۔''

''اچھا تو اب فصل منڈی میں فروخت ہوگی، لیکن کاکا میں تو تب تک انتظار نہیں کرسکتا۔''

''اس سے پہلے کہاں ممکن ہے جاگیردار صاحب۔''

جاگیردار کے ماتھے پر بل پڑ گئے، لیکن اس نے اپنے غصے پر قابو کرتے ہوئے کہا:

''ممکن نہیں ہے تو کیوں نہیں چالیس روپئے کا اناج دے کر حساب ختم کر دیتے۔''

''دراصل جاگیردار صاحب یہاں جتنا اناج آپ کو چالیس روپئے کے عوض دینا پڑے گا، اتنا منڈی میں فروخت کرنے پر اسی روپئے تک مل جائیں گے۔ اور اس طرح میرا چالیس روپئے کا نقصان ہو جائے گا جو کہ میرے لیے بڑی رقم ہے۔ آپ کچھ دن رک جائیے۔ آپ کے پاس کیا کمی ہے۔''

''ہماری کمی بیشی کا حساب تم مت لگاؤ کاکا۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں۔'' جاگیردار کا لہجہ تلخ تھا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''لیکن جاگیردار صاحب۔ ہماری چھوٹی چھوٹی حیثیتوں نے ہی تو آپ کو اس حیثیت کا بنایا ہے کہ آپ کے سامنے ہماری حیثیت کچھ بھی نہیں۔''

''زبان کو لگام دو کاکا'' جاگیردار آپے سے باہر ہو گیا۔ ''تم نے مجھ سے اناج اگانے کے لیے روپئے لیے تھے، اس لیے میں اناج ہی لوں گا۔''

''جاگیردار صاحب یہ جو فصل ہے پوری فصل کی قیمت ہی ۱۳۰۔۱۲۰ روپئے ہوگی۔ اگر اس میں سے منڈی کی قیمت کے اعتبار سے ۸۰ روپئے کی فصل آپ کو دے دوں گا تو میرے پاس اگلی فصل تک کچھ بھی نہیں بچے گا۔ میرے گھر کے لوگ بھوکے مر جائیں گے، یا پھر مجھے ان کو زندہ رکھنے کے لیے آپ سے دوبارہ قرض لینا پڑے گا۔''

''تمہارے گھر والوں کا ذمہ میں نے نہیں لیا، وہ مرتے ہیں تو میں کیا کروں، مجھے چالیس روپئے کی شالی دے دو ورنہ......''

''حد سے آگے مت بڑھئے جاگیردار صاحب! تاریخ گواہ ہے کہ جب جب کسانوں پر ظلم حد سے بڑھا ہے، ان کے صبر کا باندھ ٹوٹا ہے اور جاگیرداروں کی نسلوں کی نسلیں ختم ہو گئی ہیں۔ منڈی میں اناج بیچتے ہی سب سے پہلے آپ کے چالیس روپئے لوٹاؤں گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔''

اتنی دیر کی گفتگو سے آس پاس کے کسان بھی جمع ہو گئے تھے۔ جاگیردار نے ماحول کا اندازہ لگایا اور اپنے گھوڑے کو تیز دوڑاتے ہوئے وہاں سے ہوا ہو گیا۔

''اجمل کو بلاؤ۔''

''جی جاگیردار صاحب۔''

اجمل جب ہال میں داخل ہوا تو جاگیردار صاحب کو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پایا۔

''جی مالک۔''

''تمہیں اتنی رات گئے اس لیے بلایا ہے اجمل کہ اسی وقت اپنے ساتھیوں کو اکٹھا

وحشی سعید نمبر

کرواور چپ چاپ جا کرارشد کے گھرمیں آگ لگا دو، کسی کو کان وکان خبر نہ ہو۔"

"کا کا کے گھرمیں آگ......مگر وہ تو بڑا شریف آدمی ہے مالک! اس نے کہا......"

"اجمل اگر اس قسم کے شریف لوگ سر اٹھانے لگے تو ہماری جاگیرداری نہیں رہے گی اور جب ہماری جاگیرداری نہیں رہے گی تو تمہاری غنڈہ گردی کس کام کی۔ تمہیں بھی کسانوں کی طرح خون پسینہ بہا کر بھی دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرنا مشکل ہو جائے گا، کیا تم یہی چاہتے ہو۔"

"نہ نہ......نہیں مالک۔"

"تو پھر جو کہا ہے، کرو۔"

یہ سب باتیں اکبر دروازے کے پیچھے سن رہا تھا۔ وہ اپنے دوست ارشد کو ہشیار کرنے کے لیے بھاگا۔

"ارے اکبر! رات کے ایک بجے تم یہاں؟ کیا بات ہے؟ اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"جاگیردار نے......جاگیردار نے اجمل غنڈے کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ تمہارا گھر جلانے کے لیے بھیج دیا ہے، تم اپنے بال بچوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"کیا......اس کمینے کی یہ جرأت۔ مجھے بزدل سمجھتا ہے۔ میں ابھی گاؤں والوں کو اکٹھا کرتا ہوں اور اجمل اور اس کے غنڈوں کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہوں۔"

"اتنا وقت نہیں ہے میرے دوست۔ تمہارا گھر بستی سے دور ہے۔ یہاں سے تو تمہاری آواز بھی بستی تک نہیں پہنچے گی اور ہم بستی جا بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ لوگ بستی سے آگے تمہارے گھر کی طرف آ چکے ہوں گے۔"

"لیکن میں بزدلوں کی طرح یہاں سے نہیں جاؤں گا، بھلے مجھے کچھ بھی ہو جائے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، لیکن بھابھی اور بچے کو یہاں سے فوراً نکالو۔ میں بھی تمہارے

ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا۔''

''نہیں اکبر۔ میرے دوست، تم رقیہ اور بچے کو لے کر یہاں سے دس میل دور سندر بنی میں بہ حفاظت چھوڑ کر آؤ۔ وہاں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ میری مدد کے لیے آ گئے تو اچھا ہے۔ تب تک میں انہیں روکتا ہوں۔''

رقیہ نے احتجاج کیا۔ ''نہیں میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ جاوید کو اکبر کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔''

''نہیں تمہارا جاوید کے ساتھ جانا ضروری ہے۔ تمہیں میری اور جاوید کی قسم۔ اب دیر نہ کرو۔ اکبر انہیں یہاں سے لے جاؤ۔''

جاوید بھی والد کے پیروں سے لپٹ گیا۔ لیکن اکبر تقریباً اسے کھینچتا ہوں وہاں سے لے گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ سب ارشد کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ارشد اجمل اور اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔

''ارشد کے گھر میں بالکل خاموشی ہے۔ لگتا ہے سب سو رہے ہیں۔ چاروں طرف سے گھر میں آگ لگا دو۔ پورا گھر سوتے سوتے ہی جنت پہنچ جائے گا اور گاؤں والے سمجھیں گے کہ حادثے میں پورا گھر راکھ ہو گیا۔''

''کسی کی مجال ہے جو میرے گھر میں آگ لگائے۔'' ارشد کی رعب دار آواز اندھیرے میں گونجی۔''

''ارے یہ تو جاگ رہا ہے۔ چلو ساتھیوں تم سب ایک ساتھ کا کا پر ٹوٹ پڑو۔ میں اس کے گھر کو آگ لگا تا ہوں۔''

اجمل کے ساتھی لاٹھی، ڈنڈوں اور تلواروں سے لیس تھے۔ ارشد کے پاس صرف ایک لاٹھی تھی۔ لیکن وہ بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے لگا۔ لیکن صرف لاٹھی بھلا لوہے کے ہتھیاروں کے مقابلہ کہاں تک کرتی۔ ارشد کو چاروں اور سے گھیر کر

پکڑ لیا گیا اور اسے پیٹا جانے لگا۔ ادھر گھر جلا دینے کے سبب آگ کے شعلے فضا میں اٹھتے ہوئے دیکھ کر گاؤں کے لوگ شور مچاتے ہوئے اس طرف دوڑے۔ یکا یک لوگوں کا ہجوم اپنی جانب آتے دیکھ کر اجمل اور اس کے ساتھی گھبرا گئے اور ایک دوسرے کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی توجہ اپنی طرف نہ پا کر ارشد نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور تیزی سے جنگل میں بھاگ گیا۔ اجمل اور اس کے ساتھی بھی دوسری طرف سے بھاگ نکلے۔ ارشد ایک میل جنگل کو پار کر کے پہاڑی کے نیچے والی سڑک پر آ گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اسے ایک بیل گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔

''گاڑی وان۔ مجھے سندر بنی جانا ہے۔''

''بابو رات کے ڈھائی بجے ہیں۔ ابھی کون جائے گا۔ صبح چلیں گے۔''

''میرے پاس دس روپئے ہیں۔ وہ سب تمہارے۔''

''اچھا بیٹھ جاؤ۔''

ارشد شدید زخمی تھا۔ اس لیے نیم بے ہوشی میں ڈوب گیا۔

''بابو.....او بابو.....اٹھو.....سندر بنی آ گیا۔''

''آں.....آ گیا.....یہ لو.....دس روپئے۔''

وہ لڑکھڑاتے ہوئے اترا اور اپنے رشتہ دار کے گھر کی جانب چل پڑا۔ اس کی بیوی اور دوست دروازے کے باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ غش کھا کر گرنے ہی والا تھا کہ اکبر نے اسے اپنی بانہوں میں سنبھال کر نیچے لٹایا۔

''گھبراؤ نہیں کاکا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے، میں ابھی وید کو لے کر آتا ہوں۔''

''نہیں دوست میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں اسے دھیان سے سنو اور وعدہ کرو کہ پورا کرو گے۔''

''تم کہو تو۔''

''پہلی بات تو یہ کہ تم گاؤں میں کسی سے نہیں کہو گے کہ میرا گھر جلانے کا سبب کیا تھا۔ گاؤں والوں نے آگ کے شعلے دیکھے تو گھر کی اور دوڑے تھے۔ شاید گاؤں میں یہ خبر پھیلے کہ یکایک میرے گھر میں آگ لگ گئی اور میں اسی میں جل گیا۔ تم جب گاؤں جانا تو یہی بتانا کہ بیوی بچے کو بچاتے بچاتے ارشد خود آگ کی لپٹوں میں گھر گیا اور زندہ نہ نکل سکا۔ تم میرے کھیت پر ہل چلاؤ گے۔ میرے زمین جائیداد تم سنبھالو گے۔ دوسری بات یہ کہ میرے بعد تم رقیہ سے نکاح کرلو گے۔ تم جانتے ہو یہ دنیا کتنی ظالم ہے، وہ اکیلے یتیم بچے کے ساتھ عزت و آبرو کے ساتھ نہیں رہ سکے گی۔ وعدہ کرو......وعدہ کرو......''۔

اکبر کے کچھ بولنے سے پہلے رقیہ بول پڑی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے آپکی بیوہ ہونا منظور ہے لیکن کسی اور کی بیوی بننا نہیں۔''

''ہاں یار میں ایسے بھی بھابھی اور بچے کا پورا خیال رکھوں گا۔''

''نہیں......نہیں..... جب گاؤں والے تم سے پوچھیں گے کہ تمہارا رشتہ کیا ہے تو تمہارے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوں گے۔ طرح طرح کی باتیں ہوں گی.....تم دونوں وعدہ کرو.....وعدہ کرو۔ میری سانس رک رہی ہے۔ تم دونوں اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو.....جلدی......''

ان دونوں نے اپنا اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے ان دونوں کے ہاتھوں کو ملا دیا اور اسی وقت اس کی روح پرواز کرگئی۔

(۳)

اکبر اور رقیہ کی شادی ہوگئی۔ اب جاوید اور انور ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ رقیہ نے ارشد کی ساری جائداد فروخت کردی۔ اکبر نے بھی یہی کیا۔ انہوں نے کسی کو

وحشی سعید نمبر

پورے واقعے کی خبر نہ ہونے دی اور پھر سندر بن میں ہی رہنے لگے۔ یہاں اکبر نے ایک چھوٹی سی میوے کی دوکان کھولی۔ انور اکثر جاگیردار کی بیٹی کی کمی کو محسوس کرتا تھا۔ جب بھی جاوید اور انور کھیلتے انور کو جاگیردار کی بیٹی یاد آجاتی۔

رقیہ کو بچہ ہونے والا تھا، اسی لیے وہ چڑ چڑی ہوگئی تھی۔ بات بات پر دونوں بچوں کو ڈانٹتی۔ اکبر بھی رقیہ اور ہونے والے بچے کے پیار میں اس قدر دیوانہ ہوگیا تھا کہ بچوں کی جانب اس کی توجہ بھی کم ہوگئی تھی وہ ہر چیز اپنی بیوی کی آنکھ سے ہی دیکھنے لگا تھا۔ رقیہ کو بیٹا ہوا۔ اکبر اور رقیہ کا بیٹا۔ اس کی محبت میں اکبر اپنی بیوی کے بچے اور رقیہ اپنے شوہر کے بچے کو بھول چکے تھے۔ ایک دن تو حد ہوگئی۔ دونوں منا کو کھلا رہے تھے کہ منا رونے لگا۔

"کیا اسے مار ڈالو گے۔" اکبر نے دونوں کو ڈانٹا۔

"ہاں ہاں مار ہی ڈالیں گے۔ دونوں سوتیلے ہیں نا" رقیہ نے یہ کہتے ہوئے دونوں کے گال پر ایک ایک تھپڑ جڑ دیا۔

دونوں کے جملوں نے جاوید اور انور کے معصوم دلوں میں آگ لگا دی اور رقیہ کے تھپڑ نے آگ میں گھی کا کام کیا۔ دونوں ریلوے اسٹیشن آگئے اور ایک ریل میں سوار ہوگئے۔ ریل چل پڑی۔ کچھ دیر بعد جاوید کو بھوک لگی۔ انور کے پاس کچھ پیسے تھے۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی اور اسے چنے والا دکھائی پڑا۔ انور چنے خرید ہی رہا تھا کہ ریل چل پڑی۔ پلیٹ فارم پر ٹی ٹی ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی نظر اس پر پڑی اور دونوں خاموش رہ گئے۔ جاوید ریل کے ساتھ چلا گیا اور انور پلیٹ فارم پر دیکھتا رہ گیا۔

"ارے بیٹا تم یہاں۔"

"رفیق چاچا آپ۔"

"ہاں۔ اب میں یہیں رہتا ہوں۔ لیکن تم....."

وحشی سعید نمبر

''ہم نے ماں باپ کے ظلم سے تنگ آ کر گھر چھوڑ دیا ہے۔ جاوید ریل کے ساتھ چلا گیا۔''

''ارے تمہارے ماں باپ پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''نہیں چاچا میں وہاں نہیں جاؤں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے تم میرے ساتھ رہنا۔ چلو میرے گھر۔''

ریل اپنے آخری اسٹیشن پر رکی۔ جاوید نے پاس کے آدمی سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ گلاب نگر ہے۔ یہ ٹرین اس کے آگے نہیں جائے گی۔ تمہیں کہاں جانا ہے۔''

''مجھے..... مجھے بھی یہیں اترنا ہے۔''

اس کی جیب میں ایک آنہ تھا۔ اس سے اس نے پیٹ کی آگ بجھائی اور کچھ دیر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ رات ہوگئی تو سڑک کے کنارے ایک جگہ سو گیا۔ آدھی رات کو کسی نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

''اٹھ بے..... کیا باپ کا پھٹ پاتھ سمجھ رکھا ہے۔''

''کیا ہوا جناب۔''

''جناب..... ابے مجھے یہاں لوگ استاد بولتے ہیں۔ لگتا ہے باہر سے آیا ہے۔ یہاں کیوں سو رہا تھا؟''

''خالی جگہ تھی۔ آس پاس اور لوگ بھی سوئیں ہیں تو میں بھی یہیں سو گیا۔''

''تجھے معلوم ہے یہاں سونے کا کرایہ لگتا ہے۔ چل نکال دو آنے۔''

''دو آنے.... ابھی تو میرے پاس ایک بھی پیسہ نہیں ہے، کل دے دوں گا استاد۔''

''استاد...... واہ تیری یہ ادا پسند آئی، لیکن کل کہاں سے دے گا بے للو۔''

''کل کوئی کام ڈھونڈ لوں گا اور آپ کو پیسے دے دوں گا۔''

وحشی سعید نمبر

''کام..... ہاہاہا...ابے کام کر کے بھی کوئی آج تک پیسہ کما پایا ہے جو تو کمائے گا۔ ابے زندگی اسی پٹ پاتھ پہ ایڑی رگڑتے گزر جائے گی۔ مجھے دیکھ میں بی.اے. پاس ہوں۔ جب مجھے نوکری نہیں ملی تو مجبوری میں دادا بننا پڑا۔ محنت مزدوری سے تو کیا کھائے گا اور کیا بچائے گا...... بات کرتا ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں استاد؟''

''چل آ جا میرے ساتھ میں تجھے بتاتا ہوں کہ دنیا کی گردن پر پاؤں رکھ کر کس طرح جیا جاتا ہے۔''

''استاد یہ تو چوری ہے.....میں یہ کام......''

''ابے دنیا میں کون چور نہیں ہے..... بیٹا یہی ایک راستہ ہے جس سے اچھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔''

''نہیں استاد.....کوئی محنت کا کام ہو تو دے دو.....''

''ابے تو کیا سمجھتا ہے۔ چوری کرنے میں محنت نہیں لگتی۔''

''نہیں استاد میرا ضمیر نہیں مانتا، میں محنت مزدوری کر کے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''تو مر سالے۔ جا چلا جا یہاں سے۔ جب ضمیر مر جائے تو استاد کو یاد کرتے ہوئے آ جانا۔ چل بھاگ یہاں سے۔''

جاوید کافی دور چلتا رہا۔ آخر کار بھوک سے نڈھال ہو کر ایک جھونپڑی کے آگے غش کھا کر گر گیا۔

''میں کہاں ہوں.....تم کون ہو ماں۔''

''ماں.....ارے مجھے ماں مت کہو۔ میں بڑی ابھاگن ہوں.....تم لیٹے رہو تمہیں تیز بخار تھا۔ ابھی ابھی اترا ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

بوڑھی کے آنسوؤں سے جاوید کا چہرا بھیگ گیا۔ وہ اسے حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بوڑھی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں بھی جینے کی تمنا جاگ اٹھی۔

وحشی سعید نمبر

(۴)

حکیم نے مریض کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''گہرا صدمہ لگا ہے شاید۔ دوا ہی دے دیتا ہوں لیکن .....آپ اپنی بیوی کے پاس ہی رہیے......خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں چلتا ہوں۔''

حکیم کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اکبر سمجھ گیا۔ وہ حکیم کو دروازے تک چھوڑ کر واپس آیا۔

''سب اپنی کرنی کا پھل ہے۔ کسے خبر تھی کہ دونوں معصوم بچوں کی آہیں ہمیں برباد کر دیں گی۔ کاروبار بیٹھ گیا۔ رقیہ ایسی بیمار پڑی کہ بس.....بسا بسایا گھر اجڑ گیا۔'' اکبر بڑبڑاتے ہوئے واپس رقیہ کے پاس آیا۔

''میرا بچہ آگیا۔''

''تم ٹھیک ہو جاؤ، ہم بچوں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''میں تمہارے نہیں اپنے بچے کی بات کر رہی ہوں۔ کیا میں ان دونوں پر..... اپنے تن سے جنے ہوئے بچے پر اتنا ظلم کیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ دونوں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔'' رقیہ پتہ نہیں کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔ اکبر سر جھکا کے سنتا رہا۔ یکا یک رقیہ کی آواز ڈوبنے لگی۔

''میرا بیٹا مجھے بلا رہا ہے.....میں.....جا رہی ہوں.....'' اور رقیہ چلی گئی۔ اکبر چیختا ہی رہ گیا۔ تدفین کو دو دن گزر گئے۔ وہ اپنے معصوم بیٹے کے لیے بیزاری کی زندگی جینے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن میں وہ اپنے بیٹے کو دودھ پلا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آپ اکبر خان صاحب۔''

''جی ہاں لیکن آپ......''

وحشی سعید نمبر

''شکر ہے کہ آپ مل گئے۔ میں عظیم خاں کا پرسنل سکریٹری کرامت علی ہوں۔''

''عظیم خان......وہ میرے پچیرے بھائی.....''

''جی ہاں آپ کے پچیرے بھائی جو کہ بہت امیر تھے۔''

''تھے......کیا مطلب......''

''جی ان کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے اور وہ اپنی ساری جائداد اور اپنی معصوم بچی کا آپ کو سرپرست بنا گئے ہیں۔ ان کی وصیت کے مطابق آپ کو گلاب نگر چلنا ہوگا اور ان کی معصوم بیٹی جو کہ اب یتیم، اس کے بالغ ہونے تک ان کے کاروبار اور بیٹی کی سرپرستی کرنی ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھئے سر کہ انگنت نمک خواروں کے درمیان انہیں نہ جانے کیا سوجھی کہ آپ کو اپنی بیٹی اور جائداد کا سرپرست بنایا۔''

اکبر کا دماغ چکرا گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عظیم خان کی بچی سے بھی وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اسے پرانے دن یاد آنے لگے۔

''لیکن میں تو اپنے دونوں یتیم بچوں کی سرپرستی بھی نہیں کر سکا۔'' وہ من ہی من بڑبڑایا۔

''کیا سوچنے لگے سر......''

''قدرت کو سوچ رہا ہوں۔ میں کیا چاہتا تھا اور قدرت کیا چاہتی ہے۔ چلئے کب چلنا ہے۔ ممکن ہے قدرت نے اپنے گناہوں کا ازالہ کرنے کا وقت دیا ہو۔''

''کیسا گناہ......سر''

''کچھ نہیں.....آپ نہیں سمجھیں گے چلئے کب چلنا ہے۔''

''ابھی چلیں تو۔''

''چلئے۔''

اکبر نے اپنے معصوم بچے کو گود میں اٹھایا اور کرامت علی کے ساتھ چل پڑا۔

رحمت اللہ انور کو سمجھا رہا تھا۔

''بیٹا ایک بار ماں باپ سے ملنے میں کیا حرج ہے، ہوسکتا ہے وہ تمہارے لیے فکر مند ہوں اور اپنے کیے پر پچھتا رہے ہوں۔ اچھا اگر تمہارا دل چاہے تو تم وہاں رکنا نہیں تو ہم واپس آجائیں گے۔ اب ٹھیک ہے۔''

''یہ کیا بار بار میرے بیٹے کو مجھ سے دور کرنے کی بات کرتے ہو۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔''

رحمت اللہ اپنی بیوی کو کونے میں لے گیا اور دھیمے سے بولا۔

''بیگم۔ خدا کا خوف کھاؤ۔ یہ کسی کی امانت ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارا کوئی اولاد نہ ہونے کا درد لیکن خدا پر یقین رکھو۔ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی کریں گے تو خدا ہماری نیکی کا صلہ ہم کو دے گا۔''

رحمت اللہ کی بیوی نے دکھے ہوئے دل سے انہیں وداع کیا اور خدا سے فریاد کرنے لگی۔ رحمت اللہ جب انور کو لے کر اکبر خان کے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا ملا۔

''اتنی رات گئے کون ہوسکتا ہے۔ کون؟''

''میں ہوں بیگم۔''

''کیا ہوا۔ اتنی جلدی.....''

بیگم کی نظر انور پر پڑی۔ انور دوڑ کر اسے لپٹ گیا۔ رحمت اللہ کی بیوی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

اکبر خان اب رئیسوں کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ یہ بات نہیں بھولا تھا کہ وہ محض اس دولت کا سرپرست ہے۔ کبھی کبھی اسے یہ ڈر بھی ستاتا کہ شادی کے بعد کہیں زرینہ اور اس کا شوہر اسے اور اس کے بیٹے اقبال کو ان کی نوکر والی حیثیت نہ دے دیں۔ اس وقت وہ مالک تھا اور مالک سے نوکر بننے کا تصور کر کے ہی لرز اٹھتا تھا۔

اپنے مالک بنے رہنے کا طریقہ اس نے یہ سوچا تھا کہ اس کے بیٹے اقبال اور زرینہ کی شادی ہو جائے تو اس عیش و آرام میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔

''چچا جان میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ فٹ بال میچ دیکھنے جاؤں۔''

''ضرور جاؤ بیٹی لیکن کل کہیں نہیں جانا۔ تمہیں پتہ ہے نا کہ کل اقبال ولایت جا رہا ہے۔''

''جی بالکل۔''

اکبر اور زرینہ اقبال کو ہوائی اڈہ رخصت کرنے کے بعد واپس آئے تو نکہت زرینہ کا انتظار کر رہی تھی۔

''ارے نکہت تم۔''

''ہاں۔ آج تم کالج کیوں نہیں آئی۔''

''وہ اقبال بھائی ولایت جا رہے تھے نہ اس لیے ان کو چھوڑنے ہوائی اڈہ جانا پڑ گیا۔''

''اچھا کل کالج میں مشاعرہ ہے۔ سب سے دلکش غزل پر انعام بھی ملے گا۔ تمہارا نام شاعروں کی فہرست میں ہے۔ اس لیے ایک بہترین غزل لکھ ڈالو۔''

''ٹھیک ہے بابا..... لیکن پہلے اندر چل۔ مجھے تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

(۵)

مشاعرہ گاہ میں جم غفیر تھا۔ صدر صاحب کے آتے ہی اعلان ہوا۔

''حضرات جیسا کہ آپ سب واقف ہیں کہ اس مشاعرے میں شہر کے مشہور کالجوں کے دو دو طلبہ حصہ لے رہے ہیں۔ ۱۰ کالجوں کے ۲۰ طلبہ و طالبات کی غزلوں میں سے ۳ بہترین غزلوں کو اول، دوم اور سوم انعام دیا جائے گا۔ سب سے پہلے میں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

میڈیکل کالج کے مسٹر ڈاکٹر احمد روانی کو آواز دیتا ہوں کہ اسٹیج پر تشریف لائیں اور اپنا کلام پیش کریں۔

''غزل کچھ اچھی نہ تھی۔'' زرینہ نے نکہت سے کہا۔

''غزل لکھنے کے لیے خون جگر کو صفحات پر اتارنا پڑتا ہے۔ سائنس والوں کے بس کا یہ کام نہیں۔ انہیں اپنے اور غزل سننے والوں کے وقت کا خیال کرتے ہوئے لیبارٹیری میں جا کر آکسیجن اور نائٹروجن کا تجربہ کرنا چاہیے۔ مشاعرہ کوئی کیمیائی عمل نہیں ہے۔''

جاوید آگے والی سیٹ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے اپنے ساتھی کی بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ان دونوں کو گھور کر دیکھا۔ اور زرینہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک کے بعد طلبہ و طالبات آتے رہے اور اپنا کلام سناتے رہے۔ زرینہ کی بھی باری آئی۔ اس کی مترنم آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ''مکرر'' اور تالیوں سے پورا حال گونج اٹھا۔ اس کے بعد بھی جو طلبہ و طالبات نے کلام سنایا ان میں کوئی بھی زرینہ کے معیار تک نہیں پہنچ سکا۔ آخر میں میڈیکل کالج کے جاوید کا نام پکارا گیا۔ میڈیکل کالج کا نام سنتے ہی زرینہ نے مان لیا کہ سونے کا تمغہ اس کا ہو گیا۔ نکہت نے زرینہ سے کہا۔

''یہ وہی لڑکا ہے جو میڈیکل کالج کے تمہارے تبصرے کو سن کر تمہیں بری طرح گھور رہا تھا۔''

''اونھ۔ برا لگ گیا ہوگا۔''

جاوید نے آتے ہی مائک پر سب کو سلام کرنے کے بعد کہا۔

''دوستو! ہمارے کچھ شاعر دوست سمجھتے ہیں کہ صرف ادب کا طالب علم ہی اچھی غزل کہہ سکتا ہے جبکہ میرا یہ خیال ہے جو بھی ادب کے متعلق گہرا ذوق اور مطالعہ رکھتا

ہے اور بہترین طریقے سے فن کو برتنا جانتا ہے، وہ بہترین شاعر ہوسکتا ہے۔اس کے لیے فن پر قدرت درکار ہے۔صرف ادب کا طالب علم ہونا اس کے لیے مخصوص نہیں ہے۔اب میں آپ کے سامنے اپنی غزل پیش کرتا ہوں۔''

جاوید احمد تنویر نے اپنی مترنم آواز میں جو غزل شروع کی تو پورا ہال حیرت اور جوش کے عالم میں ڈوب گیا۔خود زرینہ بھی حیرت زدہ رہ گئی۔اسے قطعی گمان نہیں تھا کہ میڈیکل کا طالب علم اتنا بہترین شاعر بھی ہوسکتا ہے۔جاوید کے مقطع کے شعر پر تو سامعین نے پورا ہال سر پر اٹھالیا۔صدر صاحب بھی کرسی سے اچھل کر داد دینے کو مجبور ہوگئے۔مقطع تھا۔

تنویر زیست وہ نہیں جو ہو بغیر غم
کچھ خود کو، کچھ رقیب کو ترسا کے پی گیا

نتیجہ کا اعلان کیا گیا۔

''صدر صاحب کے فیصلے کے مطابق پہلا انعام جاوید احمد تنویر کو دوسرا زرینہ عظیم کو اور تیسرا انعام اقبال احمد صدیقی کو دیا جاتا ہے۔''

زرینہ مایوس تھی۔نکہت نے کہا۔

''بہت اچھا شاعر ہے جاوید احمد تنویر۔''

''شٹ اپ۔''

''ارے یار چھوڑ بھی۔اس کی غزل تجھ سے اچھی تھی اس لیے وہ پہلے انعام کا یقیناً حقدار تھا۔کیا مقطع تھا۔

تنویر زیست وہ نہیں جو ہو بغیر غم
کچھ خود کو، کچھ رقیب کو ترسا کے پی گیا

''اوہ۔نون سینس۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

(۶)

زرینہ سوچ رہی تھی کہ اگر جاوید احمد تنویر نہ ہوتا تو پہلا انعام اسے ہی ملتا۔غزل سنانے کے پہلے کے جاوید کے جملے اس کے دل میں نشتر چبھو رہے تھے۔

''یہ ادب کے طالب علم سمجھتے کیا ہیں......'' میں اس بے عزتی کا بدلہ لوں گی، ضرور لوں گی۔

نکہت نے جاوید سے کہا۔

''زرینہ آپ کی شاعری سے بہت متاثر ہے اور وہ آپ سے میرن کلب میں ملنا چاہتی ہے۔''

''میرن کلب بہت مہنگی جگہ ہے۔میرے بس سے باہر.......''

''دراصل آپ سمجھے نہیں۔ وہ کل اس کی سال گرہ ہے اور وہ اپنے کچھ مخصوص دوستوں کو پارٹی دے رہی ہے۔اس نے کہا ہے کہ اگر آپ صرف ایک گلاب کا پھول ہی لے کر بھی آجائیں گے تو وہی اس کے لیے سالگرہ کا سب سے قیمتی تحفہ ہوگا۔''

''لیکن میں......''

''دیکھئے انکار نہ کیجیے گا۔اس نے کہا ہے کہ اگر آپ نہیں آئیں گے تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔آپ شام کو ضرور آیئے۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔جاوید سوچتا رہ گیا۔

''کیا کروں۔چلو چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں کہ امیروں کی پارٹی کیسی ہوتی ہے۔اور پھر اس نے اتنے خلوص سے بلایا ہے تو اخلاقی فرض بھی ہے کہ جانا چاہیے۔''

لیکن وہاں اس کی مفلسی کا خوب مزاق اڑایا گیا۔نکہت نے احتجاج کیا لیکن اس کی آواز دبا دی گئی۔بڑی بے عزتی کے ساتھ جاوید بغیر کھائے پئے گھر لوٹا۔

''اب جا کر مجھے سکون ملا۔بچو کو پتہ چل گیا ہوگا کہ کسی امیر لڑکی سے ٹکرانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

وحشی سعید نمبر

''ہاں اور آج مجھے بھی پتہ چل گیا کہ تم اپنے غرور کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہو۔''

''دیکھو نکہت میں کب سے تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔ تمہیں جاوید سے اتنی ہمدردی کیسے ہوگئی۔ تم میری سہیلی ہو اس لیے......''

''سہیلی.....! کون سی سہیلی۔ میں تمہاری سہیلی تھی۔ اب مجھے بھول جانا.....'' یہ کہہ کر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ زرینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

دوسرے دن صبح صبح زرینہ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ اسے نکہت دکھائی پڑی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نکہت سے بات کرے کہ نکہت ایک طرف تیزی سے چلنے لگی۔ زرینہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔ نکہت جاوید کے پاس جا کر رک گئی۔

''مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کی اتنی بے عزتی ہوئی۔ میں نے ہی آپ کو دعوت پر بلایا لیکن یقین کیجیے مجھے معلوم نہیں تھا...... میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔''

''اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں..... دراصل میں ہی دیکھنا چاہتا تھا کہ امیروں کی پارٹی کیسی ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہاں اپنے غرور کی تسکین کے لیے غریبوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔''

زرینہ ان کی باتیں سن کر من ہی من افسوس کرنے لگی۔

(۷)

رحمت اللہ کندھے پر جھولا لٹکائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

''لو بیگم گھر کا راشن لے آیا۔ آپ کے صاحب زادے کہاں ہیں۔''

''ارے یہیں کہیں گیا ہوگا کھیلنے۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''جس عمر میں بیٹا باپ کا سہارا بنتا ہے۔ شادی بیاہ کی سوچتا ہے، میٹرک پاس کر کے اس عمر میں آوازہ گردی کر رہے ہیں۔ تم نے انور کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ بہت بگڑ گیا ہے۔''

''دیکھو جی۔ میرے لاڈلے کو ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ بچہ ہی تو ہے۔''

ادھر انور آوارہ گردوں کے ایک مجمع کو سمجھا رہا تھا۔

''پڑھائی لکھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود بہت ضروری ہے اور میں سمجھتا ہوں کھیل کود زیادہ ضروری ہے۔ لیکن بغیر پڑھائی لکھائی کے یہ بھی بے کار ہے اس لیے تم سب کو پڑھنا نہایت ضروری ہے اور اس میں سائنس پڑھنے سے آج کی دنیا میں زیادہ ترقی کی جا سکتی ہے۔ میں نے خود سائنس میں میٹرک کیا ہے۔ اس لیے میں تم کو سائنس کا کچھ سبق پڑھاتا ہوں۔''

سائنس کے کچھ سبق پڑھانے کے بعد وہ دریا کی جانب نکل پڑا۔ دریا کے کنارے ایک خوبصورت حسن کی ملکہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''او حسن کی ملکہ۔ گل گلزار، جان بہار۔ تمہیں دیکھ کے روح خوش ہو جاتی ہے۔ میں اس دن کو سوچ کر مسرت میں ڈوب جاتا ہوں جب ہماری شادی ہوگی اور تمہارا یہ نشیلا حسن صرف میرا ہوگا۔''

''لیکن اب جلدی کرنی ہوگی کیونکہ اس حسن کو دوسرے کی بانہوں میں دینے کی کوششیں حویلی میں کی جا رہی ہیں۔''

''ایسی کیا بات ہے جان من۔ چلو ابھی تمہارے والد صاحب سے تمہارا ہاتھ مانگ لیتے ہیں۔''

''میرے والد صاحب جب تم سے پوچھیں گے کہ تم کماتے کتنا ہو تو تم کیا جواب دو گے۔ مجھے کہاں سے کھلاؤ گے یا اپنی طرح مجھے بھی اپنے والد کی کمائی پر ہی رکھو گے۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

زندگی میں شاید پہلی بار انور سنجیدہ ہوا۔ ''ہوں کمانا ضروری ہے۔''

''بہت ضروری ہے۔''

محبوبہ سے رخصت ہونے کے بعد انور اپنے گھر آیا۔

''آ گیا بیٹا۔ میں نے تیرے کھانے کے لیے تیرے پسند کی چیزیں بنائی ہیں۔''

''ہاں ماں اب تک تو کھاتا ہی رہا ہوں۔ اب کمانا بھی چاہیے۔''

''بیٹا۔ تمہارے ابا بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔ میں خوش ہوں کہ تم نے یہ بات سوچی۔''

انور سمجھ گیا تھا کہ اگر اس نے کمانا شروع نہ کیا تو نسرین سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ کمانا اب اس کے لیے ایک جنون بن چکا تھا۔ لیکن کون سا کام جس میں عزت بھی ہو اور کمائی بھی اچھی.....

اس وقت دوسری جنگ عظیم کے سبب فوج میں بھرتی زور شور سے چل رہی تھی اور سائنس کے طالب علم کو سیدھے افسر بننے کی دعوت تھی۔ انور نے بھی فارم بھر دیا اور تیسرے ہی دن اس کا بلاوا آ گیا۔ اس نے اپنے گھر پر یہ نہیں بتایا۔

''ماں مجھے نوکری مل گئی۔ لیکن دور جانا پڑے گا۔''

''نہیں...... میں تجھے دور نہیں جانے دوں گی۔ سنتے ہو۔ انور نوکری کے لیے دور جانا چاہتا ہے۔''

''تو اس میں برائی کیا ہے۔ لوگ تو باہر جاتے ہی ہیں۔''

رحمت اللہ کی بیگم نے سو سو بلائیں لے کر انور کو رخصت کیا۔ انور نے نہ تو ماں کو اور نہ ہی والد کو یہ بتایا کہ وہ فوج کی نوکری کر رہا ہے۔ اس نے دوسری نوکری کا بہانہ بنا دیا۔ اس کو نوکری پر گئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ اس کا تار آیا۔

''میرا تار اس پتے پر کس کا۔ اوہ شاید عبدالغفار نے بھیجا ہوگا کیونکہ میں نے اس کو

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

ماں اور ابا کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔'' تار میں لکھا تھا۔

''ماں باپ بیمار ہیں جلدی چلے آؤ۔''

اس نے تار اپنے افسر کو دکھایا۔ دس دن کی چھٹی مل گئی۔

وہ بس اڈہ اترا۔ یہاں سے گاؤں ۳ میل تھا۔ وہ ٹانگے پر سوار ہوا۔ گاؤں کے کنارے پہنچتے ہی اس نے راستوں پر سجاوٹ دیکھی۔

''کیا یہاں کوئی میلہ ہے۔''

''نہیں بابو یہاں کے سب سے امیر آدمی کی بیٹی نسرین کی شادی تھی۔ اس لیے......''

''نسرین کی شادی۔ تو کیا کل نسرین کی شادی ہوگئی۔ لیکن میں نے تو کہا تھا کہ میرا انتظار کرنا۔''

''کیا شادی کے وقت آپ وہاں تھے۔''

''جی بابو جی۔''

''دلہن خوش تھی۔''

''کیوں خوش نہیں ہوگی بابو جی۔ امیر خاندان، امیر خاوند، اب اور کیا چاہیے۔ آپ کی گلی آگئی۔''

''اچھا یہ لو پیسے۔'' پیسے دے کر وہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ ماں اور ابا نظر نہیں آرہے تھے۔

''کیا ہوا۔ آپ اتنے لوگ یہاں۔ ماں اور ابا کہاں ہیں۔''

''بیٹا صبر سے کام لو۔ خدا دونوں کی مغفرت فرمائے۔ انہیں شاید کوئی صدمہ لگ گیا تھا اسی لیے ایک گھنٹے کے اندر ہی دونوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب تو تمہیں ان کے لیے ایصال ثواب کرنا چاہیے۔''

انور دونوں کی قبر پر گیا۔ فاتحہ خوانی کی اپنا سکھ دکھ ان سے کہا اور واپس آ گیا۔ اب اس کے لیے گاؤں میں کیا تھا۔ وہ واپس نوکری پر چلا گیا۔

(۸)

زرینہ خود کو گنہگار سمجھنے لگی۔ اس کے غرور کے سبب اس کی سہیلی نکہت کا بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ جاوید بھی اب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی۔ اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا۔

اکبر نے گاڑی سے اتر کر بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے نوکر کو آواز دی۔

''شمو....اوشمو.....کہاں گیا۔''

''جی سرکار......وہ بٹیا کے پاس تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''بخار......بٹیا کہاں ہے۔''

''اپنے کمرے میں۔''

''کیا ہوا بیٹی۔''

''کچھ نہیں چچا جان۔ بس تھوڑا سا بخار رہتا ہے۔''

''بخار رہتا ہے۔ تو بیٹی ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلایا۔ شمو فوراً ڈاکٹر بلاؤ۔''

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے کہا......

''سیٹھ جی آپ کی بیٹی کے کچھ ٹیسٹ لینے ہوں گے، ابھی میں ان کا خون لے کر جا رہا ہوں، کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد پھر حاضر ہوتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے خون کی جانچ کے بعد کہا......

''نرس لڑکی کو Rceumatic fever ہے۔ اسے ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ ہمارے اسسٹنٹ ڈاکٹر جاوید کہاں ہیں، انہیں بلائیے۔''

وحشی سعید نمبر

''ڈاکٹر جاوید آ گئے۔''

''مجھے بہت خوشی ہے ڈاکٹر کہ تمہیں نوکری کی ابتدا کیے ہوئے چھ ماہ ہی ہوئے ہیں لیکن اپنی صلاحیت سے تم نے میرے دل میں ایک خاص جگہ بنا لی ہے۔ ابھی ایک مریض کے پاس چلنا ہے۔''

''جی میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

ڈاکٹر غیاث نے اکبر خان سے کہا......

''آپ کی بیٹی کو رہ رہ کر بخار آرہا ہے۔ اس کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ میں شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ یہ میرے جونیئر ڈاکٹر جاوید ہیں۔ بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ یہ اور ایک نرس مریض کا علاج کریں گے۔ تین چار دن تک ان کو یہیں رہنا پڑے گا۔ نرس ہر دم زرینہ بیٹی کے پاس رہے گی۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ شمو۔ ڈاکٹر جاوید کے رہنے کا بندوبست کرو۔''

ڈاکٹر جاوید زرینہ کے کمرے میں گیا۔ نرس نے کہا۔

''ڈاکٹر جاوید انجکشن اور دوا کا وقت ہو گیا۔''

''ڈاکٹر جاوید۔'' زرینہ نے آنکھیں کھولیں۔ ''جی آپ''

''جی محترمہ میں ڈاکٹر جاوید ہوں اور ڈاکٹر غیاث کے حکم سے آپ کا علاج کرنے آیا ہوں۔ آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ نرس آپ کو دوا اور انجکشن دیتی رہے گی۔ میں وقت وقت پر آپ کا چیک اپ کرتا رہوں گا۔ لگتا ہے کہ آپ کے دل میں کوئی صدمہ گھر کر گیا ہے۔ اس نکال دیجیے۔ خوش رہیے۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔''

زرینہ اپنے ٹھیک ہونے تک ڈاکٹر جاوید سے معافی مانگتی رہی، اپنے پیار کا اظہار کرتی رہی۔ جب ڈاکٹر جاوید کی رخصتی کا وقت آیا تو اس نے اسکے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ اگر وہ اس کے پیار کو ٹھکرا دے گا تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گی۔ ڈاکٹر جاوید بھی کوئی پتھر دل نہیں تھا۔ وہ بھی زرینہ کو من ہی من چاہنے لگا تھا۔ اس نے زرینہ کو گلے سے لگا لیا۔

وحشی سعید نمبر

(۹)

انور کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ فوجی ساتھی بھی اسے دیکھ کر دکھی ہوتے کہ اتنا زندہ دل انسان اب ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ زندگی سے بیزار دن یوں ہی گزرتے رہے کہ ایک دن جنگ کی چنگاری اس کے کیمپ پر بھی گری اور حکم ہوا کہ دشمنوں کو جواب دیا جائے۔ انور نے سوچا چلو زندگی کسی کام تو آئی اور وہ بھی عظیم مقصد کے لیے۔ اپنا ملک، اپنی قوم کی خدمت سب سے بڑی خدمت ہے۔ وہ اپنے فوجی ساتھیوں کے ساتھ مورچے پر ڈٹ گیا۔ دو دن تک شدت کی گولی باری ہوتی رہی۔ پھر دونوں جانب سناٹا چھا گیا۔ دو دنوں تک خاموشی کے بعد دشمن نے پھر لڑائی چھیڑ دی۔ انور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جواب دینے کو تیار تھا۔ شدید جنگ شروع ہوئی۔ لیکن دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ پورے منصوبہ بند طریقے سے چوکی پر قبضہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ انور کے افسر کو ہیڈ کوارٹر سے اس کی اطلاع ملی اور چوکی چھوڑ کر وہاں سے نکل جانے کا حکم۔ لیکن انور دوسری بات سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے افسر سے کہا۔

''اگر اس سامنے والی پہاڑی کی اونچی چوٹی پر پہنچ کر ادھر سے بمباری کی جائے تو دشمن کی فوج میں انتشار پھیل سکتا ہے۔ وہ یہ سمجھے گی کہ ہم نے ان کو گھیر لیا ہے۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے گی۔''

''لیکن کمانڈر یہ تو بہت مشکل ہے۔ سامنے والی پہاڑی تک پہنچنے کے لیے ایک بڑے نالے سے گزرنا پڑے گا۔ راستہ کافی خطرناک ہے اور اتنی جلدی وہاں تک پہنچنا.....''

''وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے سر۔ آپ کم از کم آدھے گھنٹے تک کسی بھی حال میں یہیں رکے رہیں اور دشمن فوج کو آگے بڑھنے سے روکتے رہیں۔ باقی کام میرا ہے۔''

''او.کے. گڈ لک کمانڈر۔''

وحشی سعید نمبر

کمانڈر ان چیف سے رخصت لے کر انور نے ۱۰۰ سے زائد بم تھیلے میں رکھے اور اپنی پیٹھ پر باندھ کر نالے کی جانب دوڑ لگا دی۔

دشمن فوج قریب آتی جا رہی تھی۔ کمانڈر ان چیف کے ساتھ سارے جوان مورچے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اب یہ فاصلہ تقریباً ۱۰۰ فٹ تک رہ گیا تھا کہ دشمن فوج کے اوپر پیچھے سے بمباری ہونے لگی۔

"لگتا ہے انور پہنچ گیا ہے۔" کمانڈر ان چیف کے ساتھ ساتھ جوانوں میں دوگنا جوش بھر گیا۔ انہوں نے اتنے زور سے فوجی نعرہ بلند کیا کہ ان کی آواز چاروں جانب گونج اٹھی۔ دشمن فوج کے کمانڈر نے سوچا کہ ان کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ ابھی ایک طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اب دوسرے جانب سے بمباری ہونے لگی۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد تیسری جانب سے بھی حملہ ہو جائے۔ ادھر پیچھے سے بمباری شدید ہو گئی تھی۔ انور نے ۷۰ سے زائد بم پھینک ڈالے تھے۔ دشمن فوج میں انتشار پھیل گیا۔ ان کے کمانڈر نے فوج کو تیزی سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ انور جدھر سے بم پھینک رہا تھا تو اس طرف بھی دشمن فوج گولی باری کرتے ہوئے پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ ایک گولی انور کے پیر میں لگی لیکن اس نے بم پھینکنا جاری رکھا۔ دشمن فوج پیچھے ہٹتے ہٹتے اپنی چوکی تک چلی گئی اور فائرنگ بند ہو گئی۔ کمانڈر ان چیف نے فوراً جوانوں کو انور کی جانب دوڑایا۔ انور لڑکھڑاتے ہوئے پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا۔ جوانوں نے سے سنبھالا اور چوکی تک لے آئے۔ کمانڈر ان چیف نے فوراً فوجی ڈاکٹر اور نرس کو بلوایا جنہوں نے انور کی پیر کی گولی نکال دی لیکن خون کافی بہہ گیا تھا۔ اس لیے اسے اسپتال لے جانا بے حد ضروری تھا۔ ڈاکٹر کو اور فوجی گھائلوں کو دیکھنا تھا اس لیے اس نے کمانڈر ان چیف سے کہا۔

"آپ ایک گاڑی میں انور کو فوجی اسپتال بھیجنے کا بندوبست کریں۔ نرس بھی ان

کے ساتھ جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔''اس نے ایک جوان کو حکم دیا۔

''جوان۔کمانڈر کو جیپ میں لے جاؤ۔''

''جو حکم۔''تبھی ایک دوسرا جوان جو نرس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا، آگے آ کر بولا۔

''سر۔یہ جوان ڈرائیوری میں کمزور ہے۔راستہ اونچا نیچا اور پتھریلا ہے۔مجھے ان راتوں پر جیپ چلانے کا بہت تجربہ ہے۔''

''ٹھیک ہے جوان۔تم فوراً جیپ نکالو۔''

جوان اونچے نیچے راستوں کو عبور کرتے ہوئے تیزی سے فوجی اسپتال کی جانب جیپ بھگائے لے جا رہا تھا۔پیچھے نرس بیٹھی تھی اور انور لیٹا ہوا تھا۔انور پر غش طاری تھا۔رہ رہ کر وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔

''ڈرائیور۔تمہارے پاس پانی ہے۔''

''نہیں نرس۔کیا ہوا۔''

''مریض بے ہوش ہو گیا ہے۔کہیں پانی دکھائی دے تو گاڑی روکنا۔وہاں سے پانی لیں گے۔''

''ٹھیک ہے نرس۔''

پانی کی جگہ جیپ رکی۔نرس پانی لینے کے لیے اتری۔انور بے ہوش تھا۔ڈرائیور کے دماغ میں ہوس جاگ اٹھی۔وہ بھی دھیرے سے نیچے اترا اور نرس کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے ڈرائیور۔میں کمانڈر سے کہہ کر تمہارا کورٹ مارشل کرا دونگی۔''

''جانِ من تم چاہے جو کراؤ۔میں تو تمہاری کنواری جوانی کا رس چوس کر رہوں گا۔اسی لیے تو میں نے اس ڈرائیور کو روک کر خود گاڑی چلانے کی پیش کش کی تھی۔''

وحشی سعید نمبر

نرس چیخنے لگی۔اس کی چیخ سے انور کی بے ہوشی ٹوٹ گئی۔ڈرائیور نے نرس کا منھ زور سے دبایا اور اسے اٹھا کر کچھ دور گھنی جھاڑیوں میں لے گیا اور زمین پر پٹک دیا۔

''میں کہتا ہوں سیدھی طرح مان جا۔کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔تو بھی جوانی کا مزہ لے لے۔نہیں تو.....''اس نے پستول نکال لیا۔

''جلدی سے کپڑے اتار کر لیٹ جا نہیں تو مجبوراً مجھے تیری لاش کے ساتھ ہوس پوری کرنی پڑے گی۔''

''مجھ پر رحم کرو۔اس مریض پر ترس کھاؤ۔اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے نہیں تو وہ مر بھی سکتا ہے۔''

''اسے مرنے دے۔تو اپنی فکر کر۔نہیں تو تجھے بھی مار کر ان جھاڑیوں میں ڈال دوں گا۔چل اب جلدی کپڑے اتار۔''

نرس بے بس تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ ڈرائیور کی خوفناک آواز فضا میں گونجی۔انور پستول لیے ہوئے اس کے سینے پر کھڑا تھا۔

''حرام زادے۔فوج کو بدنام کرتا ہے۔تو بھول گیا کہ جب فوج کے وقار پر حرف آتا ہے تو ایک سچا فوجی موت کو بھی مات دے کر قبر پھاڑ کر باہر آجاتا ہے۔میں تو صرف بے ہوش تھا۔اب میں تجھے یہیں گولی مار دوں گا اور ابھی بھی اس جسم میں اتنی قوت ہے کہ پانی کی چھینٹوں سے چہرے کو بھگو کر میں خود ہی گاڑی چلا کر اسپتال پہنچ سکتا ہوں۔''

ڈرائیور کے اوسان خطا ہو گئے۔نرس دوڑ کر انور کے پیچھے آ گئی۔ڈرائیور گڑگڑانے لگا۔

''مجھے.....مجھے....معاف کر دیجیے سر۔میں.....میں اپنا فرض بھول گیا تھا.....میں گاڑی چلا کر آپ کو اسپتال پہنچاتا ہوں۔''

''چل کتے۔تیرا فیصلہ بھی وہیں فوجی کورٹ میں ہوگا۔نرس تم پانی لے کر جیپ میں

چلو میں اس کو لے کر آتا ہوں۔''

جیپ میں بیٹھتے ہوئے انور نے نرس کے ہاتھ میں پستول دیتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔

''پانی پی کر میں خود کو ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں۔ تمہاری چیخ سن کر بے ہوشی ٹوٹ گئی تھی اور میں لڑکھڑاتا ہوا پانی تک پہنچا۔ پانی پیا۔ پانی سے سر بھگویا تب جان میں جان آئی۔ اس لیے میں اسے قابو کر پایا۔ اگر خدانخواستہ میں پھر بے ہوش ہو جاؤں تو تم اور یہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرے تو تم اسے گولی مار دینا۔ ویسے خدا نے چاہا تو یہ نوبت نہیں آئے گی۔''

وہ نوبت نہیں آئی۔ اسپتال پہنچتے ہی نرس کے بیان پر ڈرائیور کو گرفتار کر لیا گیا۔ انور کو علاج کے لیے لے جایا گیا۔ دو دنوں کے بعد انور خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ نرس اس کے کمرے میں آئی۔

''کیسا لگ رہا ہے کمانڈر۔''

''اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ ارے یہ آپ کی آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں۔ لگتا ہے ایک دو دنوں سے آپ سوئی نہیں۔''

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے کمانڈر۔ جب سے آپ اسپتال آئے ہیں مس رعنا لگاتار جاگ رہی ہیں اور آپ کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔''

''مس رعنا۔''

''جی..... میرا نام ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر اب تو میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں تو اب ان کو بھی آرام کرنا چاہیے۔''

''آپ انہیں کی خدمت کے سبب اتنی جلدی بہتر ہو پائے تو آپ ہی ان سے کہیے۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے انور کا معائنہ کیا اور چلا گیا۔

''آپ نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ.....''

''ایسا مت کہیے آپ تو میرے لیے فرشتہ ہیں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو نہ جانے میرا کیا.....''

''اس کا ذمہ دار بھی تو میں ہی ہوں۔ نہ میں گھائل ہوتا اور نہ آپ کو اس طرح میرے ساتھ آنے کا حکم ملتا۔ اور نہ یہ سب ہوتا۔''

''یہ تو میری ڈیوٹی تھی لیکن آپ نے جس طرح بے ہوشی کی حالت سے اٹھ کر میری عصمت بچائی میں کیا بتاؤں کہ آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میری نظروں میں آپ کا کیا درجہ ہے۔ آپ کی بہادری کے سبب ہی ہم سب اپنی چوکی میں محفوظ رہے، ہماری چوکی محفوظ رہی۔ میں تو یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ اگر ہماری چوکی پر دشمن فوج کا قبضہ ہو جاتا اور ہم لوگ دشمن فوج کے ہاتھ لگ جاتے تو.....تو.....نہ جانے وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔''

''جو میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔ اور ویسے بھی جب تک میں زندہ ہوں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

یہ سنتے ہی رعنا نے اس کی جانب اس طرح دیکھا کہ جیسے وہ اس کی بانہوں میں سما جانا چاہتی ہو۔ انور بھی اس کی نظروں کو سمجھ گیا۔ دراصل وہ بھی رعنا سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور رعنا دوڑ کر اسے لپٹ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

(۱۰)

ڈاکٹر جاوید اور زرینہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ لیکن جاوید کو نہ جانے کیوں یہ خدشہ لگا رہتا کہ اکبر خان ان کی شادی نہیں ہونے دیں گے۔ امیر اور متوسط

طبقے کی دوری ضروری اپنا رنگ دکھائے گی۔ ایک دن ساحل پر بیٹھے ڈاکٹر جاوید نے زرینہ سے کہا۔

''یہ اکبر خان تمہارے سگے چچا ہیں۔''

''نہیں نہیں..... یہ تو میرے دور کے رشتہ دار ہیں جو میرے پاپا کی وصیت کے مطابق میری سرپرستی کے لیے آئے ہیں۔ یہ تمام جائداد تو صرف میری ہے اور پاپا کی وصیت کے مطابق شادی کے بعد میں اس کی اکیلی وارث ہوں۔'' پھر اس نے اکبر خان کی پوری کہانی اس کو سنادی۔

''اچھا تو یہ وہی اکبر خان ہیں۔''

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم ان کو جانتے ہو۔''

''تمہارے بتانے کے بعد تھوڑا تھوڑا جاننے لگا ہوں۔ ویسے میں تمہیں بتادوں کہ یہ ہماری شادی ہونے نہیں دیں گے۔''

''تم بے کار میں شک کر رہے ہو۔ چچا جان ایسے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ ایسا کریں گے تو بھی کیا ہوگا۔ دولت میرے پاپا کی، میں تمہاری۔ تو پھر تمہیں کیا ڈر۔ بولو کب آرہے ہو میرا ہاتھ مانگنے۔''

''کب آؤں۔''

''آج ہی۔''

''ٹھیک ہے۔ آج ہی آتا ہوں۔''

شام کو دروازے کی گھنٹی بجی۔ شمو نے دروازہ کھولا۔

''ارے ڈاکٹر صاحب آپ۔ آیئے۔ آیئے۔''

''اکبر خان صاحب ہیں۔''

''جی ہاں۔ وہ اور زرینہ بیٹی ہال میں بیٹھے ہیں۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔''

وحشی سعید نمبر

''آیئے ڈاکٹر صاحب۔ کافی دنوں بعد.... آیئے بیٹھئے۔''

''جی شکریہ۔ میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔'' اس نے زرینہ کی جانب دیکھا۔ زرینہ شرما گئی اور اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ لوگوں کے لیے چائے بھجواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور شمو کو چائے کے لیے کہہ کر پردے کی آڑ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

''چائے لیجیے ڈاکٹر صاحب۔ ہاں کیا ضروری بات ہے۔''

''جی میں آپ سے زرینہ کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔''

اکبر خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن اس نے اپنا غصہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہنگامہ ہوگا تو زرینہ بھی آ جائے گی۔ اس کے دماغ نے ترکیب لڑانی شروع کر دی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر مکاری کرتے ہوئے بول پڑا......

''آپ کا خیال اچھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ لیکن اصل میں عظیم بھائی کی وصیت کے مطابق ان کی بیٹی کی شادی میرے بیٹے اقبال سے ہونی ہے اس لیے.......''

زرینہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پہلی بار اسے اکبر خان کی نیت پر شک ہوا۔

''وصیت کون سی وصیت۔ جو وصیت انہوں نے کی تھی اس کی ایک کاپی تو میرے پاس بھی ہے جس میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے اور پھر عظیم خان کو کہاں معلوم تھا کہ آپ نے ایک بیوہ جس کو پہلے سے ایک بچہ ہے سے دوسرا نکاح کر لیا اور اس سے آپ کا بیٹا اقبال پیدا ہوا۔''

اکبر کا سر چکرا گیا۔ ماضی کو اس طرح حال میں آنے کی توقع اسے قطعی نہیں تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ..... یہ.......سب جھوٹ ہے۔ کون ہو تم......اور......تمہارے پاس وصیت کی کاپی کیسے آئی۔''

وحشی سعید نمبر

''اکبر خان میں تمہاری اس دوسری بیوی کا پہلا بیٹا جاوید ہوں۔ جو رقیہ سے شادی کے بعد تمہارا سوتیلا بیٹا بن گیا تھا۔ اقبال کے پیدا ہونے کے بعد تم دونوں نے اپنے بنا ماں کے بیٹے انور اور مجھ بن باپ کے بیٹے پر کس قدر ظلم ڈھائے۔ یاد ہے۔ اپنے گناہوں کو یاد کرو۔''

زرینہ یہ سب سن کر حیرت زدہ رہ گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے ہوش وحواس پر قابو پایا۔ اکبر خان بالکل پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

''تو مکار ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ تو زرینہ کی دولت کی لالچ میں آ کر اسے پھانس رہا ہے۔ میں ابھی تیرے ہوش ٹھکانے لگواتا ہوں، منا..... جان..... خورشید..... کہاں ہو.....''

''تو چونکہ خود ایک لالچی کتا ہے اس لیے مجھے بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ لیکن میری رگوں میں تیرا گندہ خون نہیں ہے۔ میں تیری مکاری نہیں چلنے دوں گا۔ جیسے تم دونوں نے میرے اور انور کے اوپر ظلم توڑے، وہ اب اس معصوم زرینہ کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میں جلد ہی تجھ سے ملوں گا۔'' یہ کہہ وہ جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اکبر خان کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا لیکن جاوید کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور پورا جسم مانو پتھر کا ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر آج کوئی اس سے ٹکرایا تو اس کے لیے اچھا نہ ہوگا۔ اس کے غصہ کو دیکھ کر اکبر خان کے آدمی سہم گئے۔ ایک نے ذرا سامنے آنے کی ہمت کی، جاوید نے اس کو اٹھا کر ایسا پٹکا کہ وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔ لگتا تھا کہ کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دوسرے ساتھی یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ جاوید ایک اور آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ اس کو اتنا زوردار گھونسا جڑا کہ اس کے منہ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ تیسرا آدمی یہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جاوید حویلی سے تیزی سے نکل گیا۔

اکبر خان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے ولایت میں اقبال کو ایک لمبا

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

تار بھیجا۔

جاوید گھر پہنچا تو اس کی ماں نے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔ بڑا تھکا لگ رہا ہے۔''

''ہاں ماں....کام زیادہ تھا۔ کچھ پرانے کام بھی نکل آئے۔''

''پرانے کام۔''

''ہاں چلو چھوڑو۔ تم مجھے فوراً ایک پیالی گرما گرم چائے دو تا کہ تھکان اتر جائے۔''

''ابھی لائی بیٹا۔''

جاوید چائے پی ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ چپراسی تھا۔

''جناب ڈاکٹر غیاث نے اسی وقت آپ کو بلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔''

''اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں ابھی چلتا ہوں۔''

''کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب۔''

''آؤ بھائی ڈاکٹر جاوید۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ ملک کے شمالی علاقے میں قحط پڑا ہوا ہے۔ ہمیں بھی ایک ٹیم لے کر وہاں جانا ہے۔ اس میں آپ کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ کل صبح ہی نکلنا ہے۔ آپ اپنا سامان وغیرہ پیک کر لیں۔''

زرینہ ڈاکٹر جاوید سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ جاوید کی ماں نے اسکا استقبال کیا۔

''آؤ بیٹی.....کون ہو تم؟''

''جی میں.....میں عظیم خان کی بیٹی زرینہ ہوں۔ ڈاکٹر جاوید نے میرا اعلاج کیا تھا، کہاں ہیں وہ؟''

''ڈاکٹر غیاث نے کسی کام سے بلوایا ہے۔ تم بیٹھو بیٹی، ابھی آ جائے گا۔''

زرینہ کی بے چینی دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ بات دلوں کی ہے۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

من ہی من مسکراتے ہوئے اس نے چائے بنا کر زرینہ کو دی۔ وہ چائے پی ہی رہی تھی کہ جاوید آ گیا۔

''ارے زرینہ تم یہاں۔ ماں یہ......''

''ہاں..... ہاں..... میں سمجھ گئی...... تم دونوں باتیں کرو۔''

''بات کرنے کا وقت نہیں ہے ماں۔ مجھے کل ملک کے شمالی علاقے میں جہاں قحط پڑا ہے، وہاں اپنی ٹیم کے ساتھ جانا ہے۔ ابھی سامان بھی پیک کرنا ہے۔ زرینہ تم بالکل گھبرانا نہیں۔ تم اپنے گھر آرام سے رہو۔ میں لوٹ کر آؤں گا تو ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔''

''کیسی الجھنیں بیٹا۔''

''کچھ نہیں ماں۔ اچھا اب میں سامان پیک کرتا ہوں۔ زرینہ چلو تم کو پہلے چھوڑ آؤں۔''

''کتنے دنوں میں لوٹو گے۔ تمہاری باتیں سن کر میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ جب میں نے تمہیں چچا جان کے بارے میں بتایا تھا تو اسی وقت تم نے مجھے یہ سب باتیں کیوں نہیں بتائیں۔ یہ پورا معاملہ کیا ہے۔''

''سب کچھ بتاؤں گا زرینہ۔ سب کچھ۔ بس مجھے قحط زدہ علاقوں کے بیماروں کی خدمت کر کے لوٹ آنے دو۔''

(۱۱)

''اب جلد ہی تمہاری پٹی کھولی جائے گی۔ لیکن......''

''لیکن کیا ڈاکٹر......''

''آں..... کچھ نہیں۔''

وحشی سعید نمبر

رعنا نے ڈاکٹر سے اکیلے میں دریافت کیا۔

''آپ انور سے اس کی ٹانگ کے بارے میں کچھ بولنے والے تھے ڈاکٹر۔''

''ہاں۔ دراصل ہوسکتا ہے کہ پٹی کھلنے کے بعد پیر سیدھا نہ پڑے اور انہیں سیدھا چلنے کے لیے کسی لکڑی کے ڈنڈے یا چھڑی کا سہارا لینا پڑے۔ لیکن یہ محض قیاس ہے ممکن ہے پیر بالکل سیدھا ہی پڑے۔ میں نے یہی سوچ کر انور سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔''

''بہت اچھا کیا ڈاکٹر۔ میں دعا کروں گی کہ پٹی کھلنے کے بعد میرے انور کو کوئی تکلیف نہ ہو۔''

''میرے انور کو.... تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رعنا نے شرم سے چہرا جھکا لیا۔

لیکن وہی ہوا جس کا ڈاکٹر کو شک تھا۔ اس نے انور سے کہا۔

''آپ کو ایک دو سال تک ایک چھڑی کا سہارا لینا پڑے گا۔ اس کے بعد آپ کے پیر بالکل سہی پڑنے لگیں گے۔ ہاں جو ورزش میں نے ٹانگوں کے لیے بتائی ہے۔ اسے کرتے رہیے۔ ہاں جب درد ہو تو ورزش ایک دو دنوں کے لیے روک دیجیے گا۔''

رعنا اسے تسلی دیتی رہی۔

''میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ آپ کا سہارا۔ صرف ایک دو سالوں ہی کی تو بات ہے۔ آپ کا پیر بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہاں۔ ایک سال یا پھر پورے ۳۶۵ دن یعنی ایک سال اور۔ اور اگر پھر بھی ٹھیک نہ ہوا تو ایک سال یعنی ۳۶۵ دن اور.....''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ آپ کو ٹھیک کرنا میری ذمہ داری ہے۔ چلیئے آرام کیجیے۔'' رعنا کچھ ڈر گئی۔

وحشی سعید نمبر

"اچھا ہوا کہ یہ سب تم سے کوئی رشتہ قائم ہونے سے پہلے ہی ہو گیا۔" انور من ہی من بڑبڑایا۔

"کیا کہا۔"

"کچھ نہیں۔"

"میں ڈیوٹی پر جاتی ہوں۔"

رات کو انور نے چپراسی کو جگایا۔

"جی صاحب۔"

"میرے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ تم ذرا اسپتال جا کر رعنا میڈم کو لے آؤ۔"

"جو حکم صاحب۔"

چپراسی کے جانے کے بعد انور نے اپنا کچھ ضروری سامان سمیٹا اور چھڑی کے سہارے لنگڑاتے ہوئے انجان راستے سے انجان منزل کی جانب چل پڑا۔

"تم یہاں کیسے۔ تم سے کہا تھا نا کہ صاحب کو اکیلا مت چھوڑنا۔"

"میڈم، صاحب ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ان کی ٹانگ میں درد ہو رہا ہے اس لیے آپ کو بلایا ہے۔"

"اچھا ایک منٹ رکو۔" وہ اپنی ہیڈ نرس سے چھٹی لینے چلی گئی۔

گھر پہنچنے پر اس نے انور کو وہاں نہ پایا۔

"مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ چلے جائیں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رعنا اب اداس رہنے لگی۔ ڈاکٹر بھی سمجھتے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک دن انہوں نے رعنا کو بلایا۔

"دیکھو بیٹی میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں۔ اور ہر غم کو دکھ کو بھلانے کے لیے مرہم کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اور بدلی ہوئی آب وہوا بھی مرہم کا کام کرتی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں ڈاکٹر صاحب۔''

''بیٹی ہمارے ملک کے شمالی حصے میں قحط پڑا ہے۔ ہر جگہ سے ڈاکٹروں کی ٹیم جا رہی ہے۔ ہمارے یہاں سے بھی ایک یونٹ کا وہاں جانا طے پایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم وہاں جا کر بیماروں کی خدمت کرو تو تمہارا من بھی لگا رہے گا، ثواب بھی ملے گا اور ممکن ہے اس نیک کام کے طفیل خدا انور کو پھر تم سے ملا دے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ میں جانے کی تیاری کرتی ہوں۔

(۱۲)

راکھن گاؤں آ گیا۔ ریل رک گئی۔ انور اترا اور چھڑی کے سہارے چلتا ہوا باہر آیا۔ یکا یک اسے ڈاکٹر کی نصیحت یاد آئی۔ ''ورزش جاری رکھئے۔'' اس کے دماغ نے جوش مارا۔

''مجھے اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ میں فوجی ہوں۔ اس طرح زندگی سے ہار جانا میری شان اور منصب کے خلاف ہے۔ آتے وقت کسی کو بتایا بھی نہیں۔ کم از کم فوجی ہیڈ کوارٹر تو خبر کر ہی دوں کہ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کے سبب میں کچھ دن گاؤں آیا ہوں۔'' یہ خیال آتے ہی اس نے ریلوے اسٹیشن کے ڈاک خانہ سے ہی فوراً ہیڈ کوارٹر تار روانہ کر دیا۔ ڈاک خانہ سے فارغ ہو کر وہ گاؤں کے لیے سواری دیکھنے لگا۔ ۳ ٹانگے والے وہاں کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس نے اس کو پہلے گاؤں چھوڑا تھا۔

''گاؤں چلو۔''

''چلو بابو۔''

راستے میں ٹانگے والے نے پوچھا۔

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''بابو آپ یہاں کیوں آئے؟''

''کیوں آئے مطلب۔''

''ارے آپ کو پتہ نہیں۔ یہاں قحط پڑا ہوا ہے۔ دو سال سے اناج نہیں اگا۔ لوگ بہت پریشان ہیں۔ ہم سب آدھا پیٹ کھا کھا بچوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سرکاری مدد بھی آرہی ہے لیکن اس پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جن کے گودام اناج سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں سرکاری مدد کے اناج سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ لیکن پھر بھی گاؤں والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم بھی آئی ہے جو علاج کر رہی ہے۔ آپ یہاں سے واپس چلے جایئے۔''

''یہاں سے کہاں جاؤں گا۔ اپنے گاؤں کو، گاؤں کے لوگوں کو مشکل میں چھوڑ کر فرار ہو جانا ایک فوجی کے معیار کے خلاف ہے۔ تم چلو۔''

ٹانگہ اس کے گھر کے پاس رک گیا۔ پیسہ دے کر اس نے دروازے پر نظر ڈالی۔ تالے پر زنگ لگ گیا تھا۔ اس نے ایک پتھر سے تالا توڑا۔ گھر کے اندر مکڑی کے جالے اور دھول بکھری ہوئی تھی۔ اس نے چوکی کو جھاڑا اور بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔

''ارے عبدالغفار تم۔''

''ہاں یار۔ تمہارے دروازہ کھولنے کی آہٹ ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ تم آئے ہو۔ لیکن اس وقت....''

''میں جانتا ہوں کہ گاؤں میں قحط پڑا ہوا ہے، لیکن کچھ دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔''

''تو اس کا مطلب ہے، کچھ دن یہیں رہو گے۔''

''ہاں یار۔ اب تو کچھ دن جو بھی سکھ دکھ ہے، وہ سب گاؤں والوں کے ساتھ ہی ہے۔''

وحشی سعید نمبر

''بہت اچھا.... میں کچھ گاؤں والوں کو بلاتا ہوں کہ گھر کی صفائی میں تمہارا ہاتھ بٹائیں۔اور کچھ چاول رکھے ہیں جو کل سرکاری گاڑی نے دیے تھے۔میں چاول بنا کر اس میں نمک ملا کر تمہارے کھانے کو لاتا ہوں۔تم تھک گئے ہوئے۔''

گھر کی صاف صفائی ہوگی۔چاول نمک کھا کر انور گاؤں کا حال چال لینے کے لیے نکلا۔چاروں جانب عجیب سا عالم تھا۔کہیں کہیں سے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔وہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک سنسان گلی میں تین لوگ کسی لڑکی سے باتیں کررہے تھے۔اس کو کچھ تجسس ہوا۔وہ دھیمے سے ان کے پاس گیا اور ایک جھونپڑی کی آڑ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگا۔

''سوچ لو رانی۔گاؤں میں قحط ہے۔اپنے کنوارے جسم کو کب تک بھوک سے تڑپاتی رہوگی۔اس قحط میں اپنی جوانی کا مزہ ہمیں دیتی رہو۔تمہیں اور تمہارے ماں باپ، بھائی بہن کو کسی بھی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی۔تم جانتی ہو ہم یہاں کے زمیندار کے بیٹے ہیں۔ہمارے پاس اناج، کپڑے اور دولت کی کوئی کمی نہیں۔بس اپنی اپنی سہیلیوں کے کنوارے بدن کی لذت دیتی رہو۔کسی کو کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

''نہیں.....نہیں.....مجھے قحط سے مر جانا منظور ہے لیکن اپنی عصمت تم درندوں کے حوالے نہیں کروں گی۔''

''اگر تم سیدھی طرح نہیں مانو گی تو ہم زبردستی.....تمہاری کنواری جوانی نے ہمیں پاگل بنا دیا ہے اس لیے.....''

دونو جوانوں نے اسے پکڑ کیا۔تیسرا اس کا منھ دبا کر اس کے کپڑے اتارنے لگا۔

''کمینو....چھوڑ دو اس بے بس کو.....''

''لنگڑے.... بھاگ جا یہاں سے۔ورنہ تیری چھڑی سے تجھی کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالیں گے۔''

انور کا خون کھول گیا۔ وہ آگے بڑھا۔

''میں اس حسینہ کو پکڑے رکھتا ہوں۔ تم دونوں پہلے اس کا کام تمام کر دو۔ اس کے بعد آرام سے اس کے کنوارے پن کا رس قطرہ قطرہ چوسیں گے۔''

وہ دونوں آگے بڑھے اور انور سے بھڑ گئے۔ انور اپنی ٹانگ سے خود کو تھوڑا مجبور پا رہا تھا۔ جلد ہی دونوں نے اسے قابو میں کر لیا۔ ایک نے اس کو پیچھے سے پکڑا دوسرا چھڑی لے کر اس کی ٹانگوں پر وار کرنے لگا۔ ''ایک فوجی اور اس طرح ہار جائے۔'' یہ خیال آتے ہی اس میں غضب کا جوش بھر گیا۔ اس نے اپنی ہلکی ٹیڑھی ٹانگ کو کام میں لاتے ہوئے اس کا ایک بھرپور وار سامنے والے پر کیا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ جس نیا نور کو پیچھے سے پکڑ رکھا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر سہم گیا۔ اس کی پکڑ تھوڑا ڈھیلی پڑ گئی۔ انور نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ایسا فوجی داؤں مارا کہ وہ بھی زمین پر دوہرا ہو کر گرا۔ انور نے لاتوں اور گھونسوں کی ایسی بارش کی کہ دونوں کے منہ سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے اور دونوں بے دم ہو کر بے ہوش گئے۔ انور نے تیسرے کی جانب خونی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ لڑکی کو چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ انور اسے دوڑا کر پکڑا اور اس کی بھی جم کر دھنائی کی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

''مجھے معاف کر دو..... میں ہوس میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے دونوں بے ہوش بھائیوں کو لے جانا ہے۔ مجھے بخش دو۔''

''حرام زادے! معافی مانگنا ہے تو اس بے بس لڑکی سے مانگ اور یاد رکھ جب تک میں گاؤں میں ہوں، پوری ایمانداری سے گاؤں والوں کی مدد کرنی پڑے گی ورنہ گاؤں والوں کو تیری اور تیرے بھائیوں کی کرتوت بتا دوں گا اور پھر ہم سب مل کر تیری حویلی اور تیرے اناج کے گوداموں کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ تو جانتا ہے نا جب مفلس

کی بھوک پر آبرو کے سودے ہونے لگتے ہیں تو ایک ایسا انقلاب جنم لیتا ہے جو آگ کا دریا بن کر تم زمینداروں کے غرور کو خاک کر کے تمہیں زندہ نگل جاتا ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کل سے ہر گاؤں والے کو اناج اور دوسری چیزیں میندار کی حویلی سے مفت ملیں گی۔''

''وعدہ پہ اٹل رہنا ورنہ..... چل اب اپنے نیم مردہ بھائیوں کو لے جانے کا بندوبست کر۔''

لڑکی انور سے لپٹ گئی اور اس کے سینے میں سر چھپا کر رونے لگی۔

''گھبراؤ مت بہن۔ جب تک تمہارا یہ بھائی زندہ ہے، گاؤں کی کسی بھی بہن بیٹی کی عصمت پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔''

انور کی ٹانگ میں تھوڑا تھوڑا درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ رکھا تو اسے کچھ یاد آیا اور وہ مسرت سے چیخ اٹھا۔

''میرا پیر..... میرا...... بالکل ٹھیک ہو گیا۔''

''کیا ہوا بھیا۔''

''کچھ نہیں بہن۔ آج یہ پھر ثابت ہو گیا کہ اگر کوئی نیک کام کرے تو خدا اس کا اجر ضرور عطا فرماتا ہے۔''

لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ کر وہ اپنے گھر گیا اور چوکی پر لیٹ گیا۔ تھکاوٹ کے سبب اسے نیند آ گئی۔ باہر شور وغل سن کر اس کی نیند ٹوٹی۔ اس نے باہر جا کر دیکھا تو ایک کسان کا بچہ تڑپ رہا تھا۔

''چلو اسے جلدی سے اسپتال کے کیمپ لے چلو۔''

''وہاں قطار میں دوا دیتے ہیں۔ بہت لمبی قطار ہے۔ تب تک بچہ مر جائے گا۔''

''میں چلتا ہوں... دیکھتا ہوں قطار کتنی لمبی ہے۔''

وحشی سعید نمبر

''قطار میں آؤ۔'' کیمپ کے باہر چپراسی نے سخت لہجے میں کہا۔

''دیکھئے۔ اس بچہ کی حالت بہت نازک ہے۔ قطار میں جتنے بھی مریض ہیں وہ سب انتظار کر سکتے ہیں لیکن یہ بچہ انتظار نہیں کر سکتا۔ مہربانی کر کے ہمیں پہلے اندر جانے دیجیے۔''

''جو آتا ہے یہی کہتا ہے۔ چپ چاپ پیچھے جا کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ.....''

''ورنہ.....'' انور کے فوجی خون نے جوش مارا۔ چپراسی کے منھ پر ایک زوردار گھونسا پڑا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ انور بچے کو لے کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔

''اچھا ہوا تم اسے یہاں جلدی لے آئے ورنہ اس کی جان بچانی مشکل تھی۔''

''لیکن مجھ سے ایک گستاخی ہو گئی۔ آپ کا چپراسی ہمیں اندر نہیں آنے دے رہا تھا، فوجی ہوں نا اس لیے خون جوش مار گیا اور.....''

چپراسی دوڑتا ہوا اندر آیا۔

''ڈاکٹر صاحب.... یہ آدمی مجھے گھونسا مار کر اندر آیا ہے۔''

ڈاکٹر ہنستے ہوئے بولا ''کوئی بات نہیں۔ بچے کی جان واقعی بہت خطرے میں تھی۔''

''او۔'' چپراسی واپس چلا گیا۔

''مجھے ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں۔''

''جاوید.....آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے کیپٹن انور کہتے ہیں۔''

''انور...... مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ یہاں ڈیوٹی پر ہیں کیپٹن۔''

''نہیں میں یہاں چھٹیاں منانے آیا ہوں۔ یہ میرا ہی گاؤں ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ مجھے بھی آپ کے ساتھ گاؤں کی پہاڑیوں کو دیکھنے کا شرف

حاصل ہوگا۔''

''بالکل ڈاکٹر جاوید بالکل۔اچھا پھر ملتے ہیں۔''

دوسرے دن انور ڈاکٹر جاوید سے ملنے گیا۔

''آیئے انور صاحب اور میرے ساتھ ریلوے اسٹیشن چلئے۔کچھ ڈاکٹر آرہے ہیں مجھے ان کو لینے جانا ہے۔''

''چلئے۔''

ریل گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ڈاکٹر جاوید نے کہا۔

''جانتے ہیں انور صاحب آپ ہی کا ہم نام میرا ایک بچپن کا دوست تھا جو بعد میں میرا عجیب سے رشتے کا بھائی بنا اور......''

''عجیب سے رشتے کا۔ میں سمجھا نہیں۔'' انور نے بیچ میں بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں دراصل اس کے والد اور میرے والد دوست تھے۔اس کی ماں بھی تھی اور میرے رف والد۔ پھر میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میری ماں اور اس کے والد نے آپس میں شادی کر لی۔اس طرح ہمارے درمیان بھائی کا عجیب رشتہ جڑ گیا۔جس کو کہ سوتیلا بھی شاید نہیں کہہ سکتے۔''

''اور......اور......'' انور نے درمیان سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔''جب ان دونوں کو اپنی اولاد ہوئی تو وہ انور اور جاوید پر ظلم ڈھانے لگے۔ایک دن تنگ آکر وہ دونوں گھر چھوڑ کر چلے گئے اور اس اسٹیشن پر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جاوید کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

صبح صبح دروازے پر دستک ہوئی۔انور نے دروازہ کھولا۔سپاہی نے سلیوٹ کیا۔

وحشی سعید نمبر

''سر آپ کا تار ہیڈ کوارٹر کو مل گیا۔ میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ آپ نے جس بہادری کے ساتھ چوکی کی حفاظت کی اور دشمنوں کو وہاں سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا اس کے لیے آپ کو بہادری کا ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے پرسوں ہیڈ کوارٹر میں ایک بڑے جلسے کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں فوجی افسروں کے علاوہ سوسائٹی کے بڑے بڑے دولت منداور نامور لوگ شرکت کریں گے۔ ہمیں آج ہی روانہ ہونا ہے۔''

''اچھا..... تم میرا تھوڑا سا سامان باندھو تب تک میں اپنے دوست کو بتا کر آتا ہوں۔''

''جی سر۔''

جلسہ واقعی بہت شاندار تھا۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس اور فوج کے بڑے بڑے افسر موجود تھے۔ سب کی زبان پر انور کی بہادری کا چرچا تھا۔ نواب حسرت جنگ جن شمار شہر کے چوٹی کے رئیسوں میں ہوتا تھا، نے انور کو اپنی کوٹھی پر دعوت میں بلایا۔ دعوت میں اس قدر انکسار تھا کہ انور نانہ کہہ سکا۔ نواب کے بارے میں اس نے کچھ لوگوں سے سنا تھا کہ انہوں نے ابھی کچھ سال قبل کسی کمسن کنواری لڑکی سے تیسری شادی کی ہے۔ حالانکہ نواب خود پچاس کے پار تھے۔ اس سے ان کی رنگین مزاجی کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن مجھے اس سے کیا۔ مجھے تو دعوت میں شرکت کرنی ہے اور واپس لوٹ آنا ہے۔ انور کی گاڑی کوٹھی کے دروازے پر پہنچی تو وہ حیران رہ گیا۔ کوٹھی کیا محل تھا۔ باہر سے جتنا خوبصورت اندر سے بھی اتنا ہی شاندار۔ نواب صاحب نے بہت سے لوگوں کو بلایا تھا۔ جب ان کی تیسری بیوی سے انور کا تعارف ہوا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''نسرین!''

نسرین نے اس کو اداس نظروں سے دیکھا۔ لیکن نہ جانے وہ پھر کیوں مسکرانے لگی۔ پارٹی شباب پر تھی۔ نواب صاحب دوسرے مہمانوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ نسرین موقع پا کر انور کے پاس آ گئی۔

وحشی سعید نمبر

''کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔تم کیسی ہو۔''

''جس مجبوری میں دن گزر رہے ہیں۔ایک بے بس لڑکی کیا کر سکتی ہے۔''

''تم نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا۔''

''میں ساری زندگی تمہارا انتظار کرتی لیکن گھر والوں کے آگے میری ایک نہ چلی۔ اپنی جھوٹی شان کی خاطر انہوں نے اس بوڑھے کو میرے پلے باندھ دیا۔تم بھی نہیں تھے کہ اپنے ساتھ مجھے لے جاتے۔میں کیا کرتی۔''

''تمہاری بات بھی درست ہے۔سب تقدیر کا کھیل ہے۔''

''ارے بھائی آپ ہماری نئی بیگم سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔''

''یہ آپ کی نئی بیگم سے باتیں نہیں کر رہے تھے۔میں ہی ان سے کہہ رہی تھی رات کافی ہو چکی ہے لہٰذا آپ ہیڈ کوارٹر جا کر نوکروں کو زحمت نہ دیں بلکہ ہمارے مہمان خانے میں رات گزار کر صبح چلے جائیں۔صبح ہونے میں کچھ گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔اس طرح ہمیں بھی کچھ گھنٹے اور آپ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہو جائے گا۔اور ویسے بھی اس محل کی روایت رہی ہے کہ یہاں مہمان آتا تو اپنی مرضی سے ہے لیکن جاتا ہماری التجا پر ہے۔''

''بالکل ٹھیک فرمایا بیگم۔انور صاحب آپ جیسی بہادر شخصیت کے ساتھ صبح کا ناشتہ بھی ہو جائے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔''نسرین نے درمیان میں بات کاٹی اور ایک نوکر کو بلایا۔

''انور صاحب کو پارٹی ختم ہونے کے بعد محل کے مہمان خانے کے خاص کمرے میں لے جانا۔آج رات یہ یہیں رہیں گے۔اور صبح ناشتے میں بھی خاص چیزیں بنانی

ہیں۔ کیوں نواب صاحب۔''

''بالکل.... بالکل۔ انور صاحب اب تو بیگم نے آپ کے لیے کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔''

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انور نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ نسرین کمرے میں آئی۔

''تم۔ اس وقت۔''

''ہاں کیونکہ یہی وقت بہتر ہے پورا محل گہری نیند میں سو رہا ہے اور کم از کم صبح سات بجے پہلے کوئی نہیں اٹھے گا۔ ہمارے پاس پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔''

''پرانی یادیں.....''

''وقت ضائع مت کرو۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لو جیسے لگاتے تھے۔ میرے جسم کے ایک ایک عضو کا رس چوس لو۔ مجھے مطمئن کر دو۔ میں آج تمہاری ہو جانا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر نسرین نے اپنے کپڑے اتار دیے اور دوڑ کر انور سے لپٹ گئی۔ انور اس کے گرم بدن کے احساس سے جل اٹھا لیکن اس کے سامنے رعنا کا چہرا آ گیا۔ اس نے نسرین کو دور کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نسرین۔ یہ گناہ ہے۔ اب تم کسی اور کی امانت ہو۔''

''امانت، کس کی۔ اس بوڑھے نواب کی جس نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے میری جوانی خرید لی اور پھر مجھے جوانی کی بھرپور لذت سے بھی ہمکنار نہ کر سکا۔ ہمیشہ مجھے پیاسی چھوڑ کر خود کنارے لگ جاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، اس نے آج تک پورے طور پر میرے عورت پن کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکا۔ میں اس سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ چلو جو ہم نے خواب دیکھے تھے اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیں۔'' وہ انور

کے کرتے کے بٹن کو کھولنے لگی۔

''نہیں! یہ محبت کا رنگ نہیں ہوس کا رنگ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا، تم یہاں سے جاؤ۔''

''میں تمہیں پا کر رہوں گی۔ اپنے جسم کی آگ بجھائے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' وہ پھر بری طرح انور سے لپٹ گئی اور اس کے اندر ہوس کے شعلوں کو بھڑکانے لگی۔ انور کے سامنے رعنا کا چہرا تھا۔ اس نے زبردستی نسرین کو اپنے سے الگ کیا اور پہلے اس کے کپڑوں کو پیر سے مار کر دروازے سے باہر کیا اور پھر نسرین کو برہنہ ہی باہر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

صبح نو بجے دروازہ پر پھر دستک ہوئی۔

''صاحب آپ کو نواب صاحب نے ناشتے پر بلایا ہے۔''

''چلو۔''

انور اور نواب حسرت جنگ کے درمیان ناشتے کے دوران خوب باتیں ہوئیں۔ نسرین کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ انور جب نواب سے جانے کی اجازت طلب کرنے لگا تو انہوں نے نسرین کو بلوایا۔

''بیگم۔ مہمان جا رہے ہیں۔''

''اچھا۔ خدا حافظ۔'' نسرین نے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے جسے نواب حسرت جنگ نہ دیکھ سکے۔

ہیڈ کوارٹر واپس آنے پر کرنل حیدر نے پوچھا۔

''کیوں کیپٹن ڈیوٹی کب سے جوائن کرنے کا ارادہ ہے۔''

''بس کچھ دنوں کی چھٹی اور چاہیے سر ابھی پیر ٹھیک ہونے میں کچھ کسر ہے۔ میں گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ جیسے ہی میں پوری طرح ٹھیک ہوا، ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے کر

ڈیوٹی پر آجاؤں گا۔''

''لیکن پھر بھی کب تک۔''

''سر زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے کماڈنٹ کو حکم جاری کر دیتا ہوں کہ کیپٹن انور ایک ماہ کے اندر جب بھی آجائیں۔ ان کو ڈیوٹی جوائن کرنے کی اجازت دے دیں۔''

''بہت شکریہ سر۔''

ہیڈ کوارٹر سے رخصت ہو کر وہ سیدھا اسپتال گیا۔ اب رعنا کی جدائی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''انور تم نے دیر کر دی۔ رعنا تمہارے غم میں بہت اداس رہتی تھی۔ وہ اپنا غم بھول جائے، اس لیے اسپتال کی ایک یونٹ کے ساتھ ملک کے مشرقی علاقوں میں جہاں کہ قحط پڑا ہوا ہے، وہاں گئی ہے۔ جیسے ہی وہ آجاتی ہے میں تمہیں اطلاع کرتا ہوں۔ تم اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر وغیرہ لکھ کر دے دو۔

(۱۳)

اکبر خان اپنے بیٹے کے آنے کا منتظر تھا لیکن وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے اپنے سب سے پرانے اور نمک خوار نوکر شمو کو بلایا۔

''شمو تم سارے حالات سے واقف ہو۔ تمہیں بتاؤ کیا میں نازوں سے پلی ہوئی زرینہ بیٹی کا ہاتھ اس کنگال جاوید کے ہاتھ میں دے دوں۔ جس کی نہ کوئی سوسائٹی ہے، نہ خاندان کا پتہ۔''

''نہیں سرکار۔ زرینہ بیٹی کی شادی تو کسی رئیس کے ساتھ ہونی چاہیے۔ جیسے کہ آپ کے بیٹے اقبال کے ساتھ۔''

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

''لیکن وہ کمبخت تو ولایت سے آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ زرینہ بٹیا بھی ادھر جاوید کے پیار میں ڈوبی ہے اور جاوید بھی جلد ہی قحط زدہ علاقوں سے واپس آنے والا ہے۔''

''کیوں نہ زرینہ اور اقبال کی سگائی کا اعلان کر دیا جائے کہ ولایت سے واپس آتے ہی اقبال اور زرینہ کی سگائی ہو جائے گی اور کچھ دنوں کے بعد شادی۔''

اکبر خان نے شمو کو زندگی میں پہلی بار گلے سے لگا لیا۔

''شاباش شمو۔ آج سے تم خود میرے نوکر نہیں، میرے دوست ہو۔''

زرینہ بھی یہ سب سن رہی تھی دراصل اس دن کے بعد سے وہ اکبر خان کی نقل و حرکت پر سنجیدگی سے نظر رکھنے لگی تھی۔

''اوہ تو اب یہ شاطر چال چلی جا رہی ہے۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔''

''چچا جان آپ کی صحت تو ٹھیک ہے۔ آج کل آپ زیادہ پریشان نظر آتے ہیں۔''

''نہیں تو بیٹی۔''

''آپ اپنا خیال رکھیں چچا جان۔ آپ کے علاوہ میرا اس دنیا میں کون ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں دوبارہ یتیم ہو جاؤں گی۔ آپ کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ بنا رہنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اکبر خان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اکبر خان حیران رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی عیارانہ مسکراہٹ کو کام میں لاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ایسا نہیں ہوگا بیٹی۔ میرا سایہ تمہارے سر پر ہمیشہ رہے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں میرا اتنا خیال ہے۔''

''چچا جان وہ جو میری سہیلی ہے نا نکہت۔''

''ہاں۔ ہاں۔''

وحشی سعید نمبر

''کل اس کی شادی ہے تو اس نے مجھے اور نرملا کو آج ہی بلایا ہے۔ میں آپ سے اجازت لینے آئی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چلی جاؤں۔''

''ضرور جاؤ بیٹی۔ ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤ۔ منیم سے پیسے بھی لے لو۔ خوب دل کھول کر خرچا کرنا۔ نکہت کے گھر والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم اکبر خان کی بھتیجی ہو۔''

''شکریہ چچا جان۔''

وہ کار لے کر نرملا کے گھر پہنچی۔ نرملا اپنے گھر کے باہر تیار کھڑی تھی۔

''ارے یہ کار لے کر کیوں آئی ہو۔ کیا نکہت کا گھر شہر سے باہر ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ہی تو ہے۔ وہاں تک تو ہم پیدل چلتے ہوئے بھی جا سکتے ہیں۔''

''اصل میں چچا جان نے ڈرائیور کو ساتھ کر دیا ہے، یہ کل تک ہمارے ساتھ رہیں گے۔''

''ارے یار ہم نکتہ کے ساتھ گھر میں شادی کی تیاریوں میں مصروف رہیں گے تو ڈرائیور صاحب کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظار کون دیکھے گا۔''

''تو پھر۔''

''میرے خیال میں تو اپنا سامان یہیں اتار لے۔ تھوڑا سا سامان ہے۔ ہم دونوں یہاں سے پیدل ہی چلتے ہیں۔ ڈرائیور صاحب پرسوں آ کر تجھے لے جائیں گے۔ ابھی تجھے بھی تکلیف ہوگی اور ڈرائیور صاحب بھی شادی میں اکیلے رہ کر کیا کریں گے۔ سوائے بور ہونے کے۔ کیوں ڈرائیور صاحب۔''

''جی.....جی۔'' ڈرائیور سوچ میں پڑ گیا۔

''تو پھر آپ جایئے اور پرسوں آ کر مجھے یہیں چھوڑ دیجیے گا اور زرینہ کو لے کر چلے جایئے گا۔ چچا جان کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم ابھی نکہت کے گھر جا کر انہیں ٹیلیفون کر دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''جی.......جی.....ٹھیک ہے۔''

ڈرائیور سامان اتار کر رخصت ہو گیا۔ زرینہ نے نرملا کو گلے سے لگالیا۔

''نرملاتم واقعی میری سچی سہیلی ہو۔ مجھے تم پر ناز ہے۔''

''اچھا.....اچھا..... یہ مکھن لگانا بند کرو اور یہاں سے جلدی نکلو۔ میں بھی اپنی نانی کے گھر جارہی ہوں۔ اور ہاں.... جاوید جیجا جی سے میرا اسلام کہنا۔''

زرینہ جاوید کی ماں کے پاس پہنچی اور اسے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کی ماں نے معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''بیٹی.... ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تم یہ برقعہ پہن لو۔ ہم ابھی پہلی گاری سے راکھن جائیں گے جہاں جاوید ڈیوٹی کر رہا ہے۔''

(۱۴)

انور راکھن جانے کے لیے ہیڈ کوارٹر سے نکلا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ اس نے سامان اپنی برتھ پر رکھا۔ اس کے سامنے والی برتھ پر ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان لڑکی تھی۔

''کہاں تک جانا ہے بیٹا۔''

''راکھن۔''

''کیا راکھن کے ہی رہنے والے ہو۔''

''ہاں۔ اور آپ۔''

''میں تو اپنے بیٹے سے ملنے جارہی ہوں جو ڈاکٹر ہے اور وہاں قحط زدہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر جاوید۔ شاید تم اسے جانتے ہو۔''

''ڈاکٹر جاوید..... آپ شاید ڈاکٹر جاوید کی وہ ماں ہیں جنہوں نے اسے پالا

ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

انور نے ساری داستان کہہ سنائی۔ ماں نے زرینہ کا تعرف کرایا۔

''اچھا تو میرا باپ لالچ میں آ کر میری چچیری بہن کی شادی نہیں ہونے دینا چاہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود جاوید اور زرینہ کی شادی کراؤں گا۔''

''بھائی جان.....'' زرینہ اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔

انور نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں اپنے باپ سے میں نپٹ لوں گا۔ اپنے بھائی پر بھروسہ رکھو۔''

''آپ چچا جان سے بات کریں گے۔ بھائی جان۔''

''ہاں باتیں تو مجھے ان سے بہت سی کرنی ہیں۔''

ڈاکٹر جاوید بہت خوش تھا۔

''ماں جلد ہی یہاں کا کام ختم ہو جائے گا۔ ہمارے ساتھ ایک اور یونٹ بھی کام کر رہی ہے جس سے بیمار جلدی شفا پا رہے ہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ انور تم میرے ساتھ آ رہے ہو۔''

''چلو۔''

راستے میں جاوید نے انور سے کہا۔

''یار تو میرا بھائی بھی ہے، دوست بھی اور اب میرا سالا بھی ہونے جا رہا ہے لیکن میں سوچتا ہوں جب تمہارے سگے اور میرے رشتے کے والد سے سامنا ہوگا تو کیا ہوگا۔''

''ابے کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہوں نا۔ اب تیری شادی کے بارے میں غور کرنا ہے۔ چل تیرے کیمپ چل کر چائے کی پیالی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں کہ شادی یہیں

ہو جائے یا یہاں سے واپس جا کر۔"

"وارڈ بوائے کہاں ہے۔"

"جی وہ کسی کام سے گیا ہوگا۔"

"اوہ۔"

"کوئی کام ہے سر۔"

"ہاں اصل میں کینٹین سے چائے لانی تھی۔ لیکن آپ دوسرے یونٹ کی ہیں تو......"

"کوئی بات نہیں سر۔ میں لے آتی ہوں۔ آخر آپ بھی تو ڈاکٹر ہیں اور خدمت کرنا تو میرا فرض ہے۔"

"اوہ شکریہ سسٹر۔ دو چائے میرے کیمپ میں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔"

انور اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ نرس چائے لے کر آ گئی۔

"رعنا..... تم..... اوہ خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" وہ کرسی سے اٹھا اور رعنا کو اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑ کر اسے بے تحاشا چومنے لگا۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے انور۔"

"ارے یہی تو ہے میری زندگی۔ میری رعنا۔"

"ہاں ڈاکٹر جسے یہ رات کی تنہائی میں اکیلا چھوڑ کر بزدلوں کی طرح بھاگ گئے تھے۔"

"اوہ رعنا۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے لگتا ہے خدا کی یہی مرضی تھی۔ دیکھو وہاں سے نکلنے کے بعد مجھے عقل آ گئی۔ یہ دیکھو خدا نے میرا پیر بھی ٹھیک کر دیا اور مجھے میرا بھائی بھی مل گیا۔ آج خدا نے تم سے بھی ملا دیا۔ میں تمہارے

اسپتال سے ہی آ رہا ہوں۔ وہاں میں نے اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر بھی چھوڑا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تم یونٹ کے ساتھ قحط زدہ علاقوں میں گئی ہو اور دیکھو تمہاری خدمت اور میرے نیک کاموں کا صلہ خدا نے یہ دیا کہ تم مجھے مل گئیں۔''

رعنا اس کے گلے سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میری تو دنیا ہی ویران ہو گئی تھی۔ آپ اس طرح مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اچھا آپ کا بھائی کون ہے۔''

''میں ہی اس کا بھائی ہوں سسٹر اوہ.... ہونے والی بھابھی۔''

رعنا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی انور نے کہا۔

''تم ڈیوٹی ختم کر لو۔ پھر گھر چلیں گے۔ وہاں تمہیں جاوید کی ہونے والی بیوی اور ماں سے بھی ملنا ہے۔ اور میں تمہیں ساری بات بھی بتاؤں گا۔''

ڈرائیور تیسرے دن زرینہ کو لینے پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی شادی نہیں تھی۔ وہ گھبرا گیا اور واپس آ کر سارا واقعہ اکبر خان کو سنایا۔

''اوہ تو یہ اس کی چال تھی۔ اتنا بڑا دھوکہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دولت تو ہاتھ سے سرکتی جا رہی ہے۔ میں کیا کروں.... شمو....'' تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''ارے اقبال بیٹا تم.... بہت اچھے وقت پر آئے بیٹا۔ مجھے تمہاری بڑی ضرورت ہے۔ یہ تمہارے ساتھ لڑکی کون ہے۔ اچھا تمہاری کوئی دوست ہے جو یہاں گھومنے آئی ہے۔''

''نہیں پاپا۔ یہ آپ کی بہو اور میری بیوی ہے۔ اس کا نام کٹی ہے۔ میں نے اس سے ولایت میں ہی شادی کر لی ہے۔''

اکبر خان کا سر چکرا گیا۔ وہ صوفہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اف.... یہ کیا ہو گیا۔ اس لڑکے نے تو سارے راستے ہی بند کر دیے۔''

"کیا ہوا پاپا۔ زرینہ کہاں ہے۔"

"کچھ نہیں بیٹا۔ ذرا طبیعت خراب ہے۔ زرینہ اپنی سہیلی کی شادی میں گئی ہے۔ تم اور بہو جا کر آرام کرو، کھانے کے وقت باتیں کریں گے۔"

"جی پاپا۔"

اکبر خان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ قسم قسم کے خیال اس کے دماغ کو گھیرنے لگے۔ کہیں یہ اس کے گناہوں کی سزا تو نہیں۔ انور اور جاوید..... ہاں جاوید..... ڈاکٹر جاوید.... کیا وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے شمو کو بلا کر سر دبوایا۔ کچھ دماغ قابو میں آیا تو وہ معاملے پر نئے سرے سے غور کرنے لگا۔

کھانے کی میز پر اقبال نے کہا۔

"پاپا کٹی کہتی ہے کہ آپ کے ابو بالکل آپ کی طرح ہیں۔"

"ہاں.... جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی پاتا ہے۔" اکبر دھیمے سے بڑبڑایا۔

"کیا کہا پاپا۔"

"کچھ..... کچھ نہیں بیٹا۔ اچھا اب تم بتاؤ۔ شادی کی اتنی جلدی بھی کیا تھی۔ خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ بہو ولایت چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے آ گئی ہے۔ چلو اب تم یہاں کوئی بڑا کاروبار شروع کرو۔ زرینہ بھی آ جائے تو......"

"نہیں پاپا.... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ کٹی یہاں ہمیشہ کے لیے رہنے نہیں آئی ہے۔ وہ تو بس یہاں گھومنے آئی ہے۔ کچھ دن کے بعد واپس چلی جائے گی۔ ہم آپ کو دیکھنے کے لیے سال دو سال پر آتے رہیں گے۔ اصل میں وہاں پر بھی میرا کاروبار ہے۔ میرا کیا کٹی کا ہی کاروبار ہے۔ اب ہم دونوں اسی میں مصروف رہتے ہیں۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی سال میں ۲۔۳ بار ولایت کے چکر لگا لیا کروں گا۔ تم

لوگ بھی ایک دو بار یہاں آجاؤ گے تو کافی دن ہم ساتھ ہی رہ سکتے ہیں۔‘‘

’’جی.....وہ.....‘‘ کٹی نے اسے بیچ میں ہی ٹوکا اور انگریزی میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ اقبال نے بھی اس کا جواب دیا۔ کٹی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے پھر انگریزی میں جواب دینا شروع کیا۔ اس بار اس کا لہجہ کچھ سخت اور پریشان کن لگ رہا تھا۔

’’کیا بات ہے بیٹا۔‘‘

’’جی وہ ایسا ہے پاپا کہ آپ ولایت آکر بور ہو جائیں گے۔ دراصل ہمارا کام ایسا ہے کہ میں اور کٹی صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک کام کرتے ہیں۔ اس کے بعد ولایت کی روایت کے مطابق دل بہلانے کے لیے دیر رات تک کلب اور پارٹی کا لطف لیتے ہیں۔ رات میں زیادہ دیر تک جاگنے کے سبب صبح آٹھ بجے سو کر اٹھتے ہیں اور نو بجے پھر کام پر لگ جاتے ہیں تو اس طرح ہفتہ میں چھ دن تو ہم آپ کو وقت ہی نہیں دے سکیں گے۔ ہفتہ میں ایک دن چونکہ آرام کا دن ہوتا ہے۔ اس لیے اس دن آرام بھی بہت ضروری ہے۔ تو اسی دن ہم آپ کو ایک دو گھنٹے کا وقت دے سکیں گے۔ تو کٹی سمجھتی ہے کہ آپ ولایت میں بور ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں ہم سال میں ایک دو بار ضرور یہاں آنے کی کوشش کریں گے۔‘‘

اکبر خان کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بار بار اس کا ذہن ماضی کی یادوں میں کھو جاتا۔

’’پاپا۔ زرینہ کب آئے گی۔‘‘

اس سوال سے اکبر خان تھوڑا گھبرا گیا لیکن خود پر قابو رکھ کر بولا۔

’’بیٹا تمہارے آنے سے کچھ ہی گھنٹوں پہلے وہ دکن کے لیے نکلی تھی۔ ۲ دن تو پہنچنے میں لگے ہوں گے۔ اب شادی ہو جائے گی تو میں سمجھتا ہوں ایک ہفتے کے اندر اسے

واپس آ جانا چاہیے۔''

''تب تو بہت مشکل ہے۔''

''کیا مشکل ہے۔''

''اصل میں پاپا! کٹی نے چار دنوں میں یہاں کافی کچھ گھوم لیا ہے۔ ہم جلدی میں چلے بھی آئے تھے۔ وہاں کاروبار بھی دیکھنا ضروری ہے اس لیے کٹی نے کل کی واپسی کی ٹکٹیں کرالی ہیں۔ ہمیں کل صبح ہی واپس جانا ہے۔''

''اتنی جلدی۔''

''ہاں پاپا۔ مجبوری ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ہم بہت جلد آپ سے دوبارہ ملنے آئیں گے۔''

اکبر خان اپنے بیٹے اقبال کا منھ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔

جاوید اور زرینہ اور انور اور رعنا کی شادی راکھن میں ہی ہونی قرار پائی۔ جاوید کی ماں کو خوف تھا کہ کہیں اکبر خان کوئی دوسری چال نہ چل جائے اس لیے جلدی سے جلدی شادی کی خواہش مند تھی۔ دونوں کی شادی ہوگئی اور یہ دونوں نئے جوڑے اپنی زندگی کی منزلوں کی جانب سفر کرنے لگے۔ ۲۰ دن ہوگئے۔ انور کو ڈیوٹی کی یاد آئی۔ جاوید کا کیمپ بھی جا رہا تھا قحط ختم ہو چکا تھا۔ سب واپس آ گئے۔ دو دن کے بعد زرینہ نے جاوید سے کہا۔

''چچا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ مجھے ان کی فکر ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ پھر اب میں اپنے والد کی اتنی بڑی جائداد کی مالک ہوں۔ ہمیں وہاں جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں انور کو بھی تیار کرتا ہوں'' شام کو وہ انور سے ملا اور ساری بات بتائی۔

''ٹھیک ہے چلو۔ مجھے بھی اپنے باپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

چاروں دوسرے دن صبح حویلی پہنچے۔ حویلی میں شور وغل تھا۔ شمو اور چار نوکر اکبر خان کو پکڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سامنے بیٹھا تھا۔ دو وکیل بھی تھے جو آپ میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے۔

''چچا..... کیا ہوا۔ شمو کاکا.... کیا ہوا چچا کو۔''

''تم آ گئی بیٹی۔ بہت اچھا ہوا۔'' دونوں وکیلوں نے بھی جب زرینہ کو دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا۔

''ہوا کیا ہے۔''

شمو نے اقبال اور کٹی تک ساری داستان کہہ ڈالی۔ ''اب انہیں جب بھی دورہ پڑتا ہے یہ چلانے لگتے ہیں۔ یہ مکان میرا ہے۔ یہ دولت میری ہے۔ یہ کاروبار میرا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

انور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''قدرت کا انصاف ہو کر رہتا ہے۔''

دونوں وکیل زرینہ کے پاس آئے۔

''وکیل چاچا آپ لوگ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں۔''

''بیٹی ہمیں بڑی فکر تھی کہ تم کہاں چلی گئی۔ تمہارا کوئی پتہ ٹھکانا بھی نہ تھا۔ ہم تو اخبار میں اشتہار دینے والے تھے لیکن خدا کا شکر کہ تم واپس آ گئیں۔ اب کہیں مت جانا۔ اپنے والد مرحوم کی جائداد سنبھالو جنہوں نے بڑی محنت مشقت سے اتنا بڑا کاروبار پھیلایا۔ اس کو ضائع مت ہونے دینا۔ ہم تمہارے والد کے اس دور سے ساتھی ہیں جب وہ مزدوری کرتے تھے۔''

''نہیں چاچا۔ میں اپنے والد کی محنت و مشقت سے بنائے ہوئے کاروبار کو خود

چلاؤں گی۔ اسے کسی بھی حال میں نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔'' زرینہ نے جاوید اور انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے ان کو انجکشن دے دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے بیٹی کہ اب یہ تمہاری سرپرستی کے قابل نہیں رہے۔ نہ جانے ان کو کون سا صدمہ لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ مرض ان کی حیات کے ساتھ ہی جائے گا۔''

''چچا کی سرپرستی نہیں رہی تو کیا ہوا۔ میرے چچیرے بڑے بھائی کی سرپرستی تو ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔''

''وکیل چاچا۔ شمو کاکا۔ آپ انہیں جانتے ہیں۔ یہ کیپٹن انور ہیں جن کو بہادری کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ اکبر چچا کے بیٹے اور میرے سرپرست میرے بڑے بھائی ہیں۔'' زرینہ نے مضبوطی سے انور کا بازو پکڑے ہوئے کہا۔

''واہ.... یہ تو بہت اچھا ہے بیٹی میں ابھی آپ لوگوں کا کمرا سجواتا ہوں۔ آپ لوگ آج سے یہیں رہیں۔ حویلی بھی خوشحال رہے گی اور بیٹا انور تمہیں اپنے والد کی خدمت کا موقع بھی ملے گا۔''

''ہاں.... اب تو بس یہی کرنا باقی ہے۔'' انور نے ٹھنڈی سانس لی۔ جاوید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''اپنے ساس سسر کی خدمت کا موقع تو خوش قسمت لڑکیوں کو ملتا ہے۔ ساس کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اب اپنے سسر کی خدمت میں کوئی کمی نہ رکھوں گی۔''

''شاباش میری اچھی بھابھی۔'' زرینہ رعنا سے لپٹ گئی۔ انور اس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

اکبر خان کے دورے بڑھتے گئے۔ ایک ایک دو دو گھنٹے پر اس کو دورے پڑنے لگے۔ وہ بری طرح چیختا۔ اس کے دماغ نے ماضی اور حال سب کو ایک کر دیا تھا۔ کبھی

کہتا۔

"یہ مکان، یہ کاروبار، یہ دولت یہ سب کچھ میرا ہے۔ مجھے اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

کبھی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے......

"ارشد میرے دوست۔ مجھے معاف کردو۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں تم سے کیا ہوا وعدہ نہیں نبھا پایا۔ میں نے تیرے بچے پر بڑا ظلم کیا، اپنے بچے پر بڑا ظلم کیا۔ جاوید....انور تم کہاں ہو میرے بچوں۔ باپ نے تمہیں چھوڑ دیا تو کیا تم بھی باپ کو چھوڑ دو گے۔ تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے گھر سے جانے کے بعد تمہاری ماں کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ جاوید وہ تمہیں یاد کرتے کرتے ایڑی رگڑ کر مری۔ وہ آخر تک چیختی رہی کہ میرے جاوید کو لاؤ لیکن میں تمہیں تلاش نہ کرسکا۔ میرے بچوں تم کہاں ہو؟ سب میرے گناہ ہیں۔ اوہ خدایا مجھے موت کیوں نہیں آتی۔"

کبھی دورہ پڑنے پر وہ چیخ چیخ کر یہ کہتا۔

"ارشد۔ میرے دوست۔ تم نے مجھ سے یہ وعدہ کیوں کیا کہ میں تمہاری بیوی سے شادی کرلوں۔ بتاؤ کیا اس سے پہلے میں تمہاری اولاد کو اپنی اولاد نہیں سمجھتا تھا۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ مگر تم اپنا وعدہ ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا دوست بالکل اکیلا...... جانتے ہو.....رقیہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میرے بچے جاوید اور انور چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے سب پر ظلم کیا۔ میں بہت بڑا گنہگار ہوں۔"

رعنا بالکل بیٹی کی طرح اس کی خدمت کرتی۔ زرینہ جب آفس سے آتی تو اس کے پاس بیٹھتی۔ جاوید اور انور جب اسے اس حالت میں دیکھتے تو خون کے آنسو روتے۔ جاوید اور انور کے سامنے جب اکبر خان کو دورہ پڑتا اور وہ ارشد، رقیہ اور اپنے دونوں

لمحے لمحے

وحشی سعید نمبر

بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آہ وزاری کرتا اور خود کو ظالم کہتا اور معافی مانگتا تو دونوں کے دل پھٹ جاتے اور وہ اکبر خان کے پیروں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ لیکن اکبر خان ان سب سے بے نیاز چیخنے میں لگا رہتا۔ وہ دونوں سب کچھ بھول گئے تھے۔ اس کے گناہوں کو بھول گئے تھے۔ اب ان کے سامنے اکبر خان ایک باپ تھا جس کا احترام اور تیمارداری ان پر فرض تھی۔ اکبر خان کے دورے بڑھتے گئے۔ ۲ ڈاکٹر اور دو نرسیں مستقل حویلی میں رہتیں۔ اکبر خان کا ہر طرح کا علاج جاری تھا لیکن حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی ہی جارہی تھی۔

اب آہ وزاری والی کیفیت لگاتار بڑھ رہی تھی۔ اس کی یہ حالت اب کسی سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس کے منہ سے ندامت کے ایسے ایسے الفاظ نکلتے جو کہ پتھر کو بھی پگھلا دیں۔ ایک شام انور، جاوید، زرینہ اور رعنا نے اکبر خان کی حالت پر سنجیدگی سے غور کیا اور کچھ فیصلہ کیا۔ وہ شب جمع تھی۔ اس رات چاروں نے خوب خدا کی عبادت کی اور اس کی بارگاہ میں رو رو کر التجا کرتے رہے۔

''الٰہی تو بڑا کریم ہے۔ ہمارے والد اکبر خان کو بخش دے۔ ان کو اس اذیت ناک مرض سے نجات دے دے۔ ائے ہمارے رب ہم نے ان کو معاف کیا۔ ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں۔ ارشد اور رقیہ کو بھی اب ان سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اے ہمارے رب تو بھی انہیں معاف کردے۔ ان پر رحم کر ہمارے مالک۔ ہمارے والد کو ان اذیتوں سے نجات دے۔'' رات بھر عبادت اور دعاؤں کے بعد وہ سب نماز فجر ادا کر کے اور قرآن پاک کی تلاوت کر کے تھوڑا آرام کرنے کے لیے سو گئے۔ ۲ گھنٹے بعد ہی شمو دوڑتا ہوا آیا۔

''بچوں.....اکبر خان صاحب کا انتقال ہوگیا۔''



Lamhe - Lamhe

Budaun (U.P.)